اردو ڈائجسٹ

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی
پوائنٹ
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

جولائی سنہ ۱۹۶۶ء

اس شمارے میں

انٹرویو

محبوبِ خدا — ایم۔ ایم۔ عالم (سکوڈرن لیڈر پاکستان فضائیہ) — الطاف حسن قریشی — ۷

(میلاد النبیؐ پر ایک خصوصی فیچر) — ۳۳

فکر کی بلند یاں (جواہرِ حکمت) — ۳۴

وہ مقامات جہاں آپؐ کی زندگی کے نقش ثبت ہیں۔ — ۳۵

مقاماتِ مقدسہ کی نایاب تصاویر کا البم

محبوبِ خدا کی محبوب دعائیں — ۴۸

داستانِ حریت — وہ وقت کب آئے گا — علی چغتائی — ۲۵

سائنسی کہانی — سائنس بہادر — جیک ولیم سن ——— آباد شاہ پوری — ۸۷

حیرت انگیز — دلچسپ و عجیب — ممتاز لیاقت — ۱۰۶

مختلف کتابوں سے — تھکن اور اس کا علاج (دوسری قسط) — ضیا شاہد — ۱۴۵

شکاریات — ادھر شیر، اُدھر شیرنی — کینتھ ایڈورسن — ۱۱۹

سچی کہانی — علی بابا نے کہا تھا — نینسی جیمز ——— نجیب اسلان — ۷۸

جیتی جاگتی زندگی — مجھے اپنی خاندانی کمتری کا شدت سے احساس ہے — ا۔ ح۔ ق — ۱۰۹

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

معلومات
کاغذی ماچس — مزمل رضا — ۷۵
بادشاہوں کا غریب خانہ — جہان شرلاک — ۱۳۷

جنگِ عظیم
فرار۔ فرار۔ فرار — (آخری قسط) — مقبول جہانگیر — ۴۹

حیوانیات
ٹریفک کی چلتی پھرتی بتیاں — شوکت علی — ۶۵

ذہنی ورزش
— — ۱۰۵
؟
جواب — — ۱۱۸

سائنسی معلومات
سب سے چھوٹا ریڈار — پیٹر فارب — ۱۱۵
نئی نئی ایجادیں — — ۱۴۲

طنز و مزاح
کراچی کی آب و ہوا — سلیم حسن مرزا — ۱۵۹

معاشرت
چھوٹی سی بات — زبیدہ خاتون — ۲۲

شعر و ادب
زعفران کے پھول — (افسانہ) — خواجہ احمد عباس — ۶۸
غزلیں — انجم رومانی —— احمد فراز — ۱۱۴
عظیم منصوبہ — (عربی افسانہ) محمود تیمور — ظہور احمد اظہر — ۱۷

اصلاحِ زبان
پردۂ الفاظ کے پیچھے — فضل الٰہی عارف — ۱۵۶

تلخیصِ کتب
محبت فاتحِ عالم — برائتھ ویٹ —— ضیا شاہد — ۱۶۳

سرورق
عمل : چوہدری ریاض احمد

ناشر — طابع — مقامِ اشاعت
الطاف حسن قریشی — اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز، بیرون لوہاری گیٹ۔ لاہور — سمن آباد — لاہور

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کچھ اپنی زباں میں

اِس شمارے میں آپ کے لیے نہایت ہی حسین اور قیمتی تحفہ محفوظ ہے۔ ہم نے ان مقدّس مقامات کی تصویریں یکجا کر دی ہیں جن پر محبوبِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نقوش ثبت ہیں۔ یہ مقامات وہ ہیں جن کو دیکھنے کے لیے ہر مسلمان کا دِل مضطرب رہتا ہے اور آنکھوں میں عقیدتوں کے ہزاروں طوفان پرورش پاتے ہیں۔ ان مُقدّس مقامات سے دعوتِ اسلامی کے کتنے ہی نازک موڑ اور دُنیا کے سب سے عظیم انسان کی کتنی ہی پاکیزہ یادیں وابستہ ہیں۔ انہی مقدّس مقامات سے وہ پیغام، وہ تہذیب، اور وہ تمدّن سیلِ رواں کی طرح اُمڈا جس کے گہرے اثرات ہزاروں حوادث کے باوجود آج بھی قائم ہیں اور ان گہرے اثرات کی عظمت کا احساس دُکھی دنیا میں روز بروز شدّت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

یہ زندۂ جاوید مقامات ایک البم کی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں ہمیں امید ہے عید میلادالنبیؐ کے موقع پر آپ یہ شمارہ دوستوں کو تحفے کے طور پر پیش کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔

ادارہ ڈاکٹر الیاس مسعود صاحب کا شکر گزار ہے کہ اُنھوں نے مُقدّس مقامات کا عکسی خزینہ ہمارے سپرد کر دیا۔ یہ حسین البم انہی کے تعاون کا رہینِ منّت ہے۔

یہ پاکیزہ نقوش خود دیکھیے اور بچّوں کو خاص طور پر دکھائیے تاکہ وہ بچپن ہی سے ان مقامات کے ساتھ ایک ذہنی تعلق قائم کر سکیں۔

الطاف حسن قریشی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ایم۔ ایم عالم

انٹرویو

ہمارا مایہ ناز ہیرو

الطاف حسن قریشی

جس نے
۳۰ سیکنڈ میں بھارت کے
پانچ ہوائی جہاز گرا کر
ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا

اور ستمبر ۶۵ء جنگ کا پانسہ پلٹ دیا

اُن کی تصویر کئی بار دیکھی، لیکن اگر آپ بُرا نہ مانیں، تو سچ کہہ دوں کہ وہ اخبارات کے بے جان اداریوں کی طرح میرے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہ کر سکی۔ مَیں تو عالم صاحب کی تصویر دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا، وہ تو یار دوستوں نے مجھے بے بس کر دیا۔ انہیں کیسے سمجھاتا کہ مَیں جس شخصیّت سے محبّت کرتا ہوں، اس کی تصویر اگر دیکھنا چاہوں، تو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تصویر دیکھ کر مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میرا محبوب بے جان سا ہے، زندگی اور حرارت سے محروم۔ ہائے! مَیں اپنی آنکھوں کے سامنے محبوب کی رُوح نکلتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔

تصویروں سے مجھے بچپن ہی سے نفرت رہی ہے۔ مجھے اپنی پہلی جماعت کا صرف ایک ہی واقعہ یاد ہے اور اس واقعے نے میری ساری زندگی پر بہت ہی گہرا اثر ڈالا۔ مجھے آج بھی پہلی جماعت کے اُستاد حبیب صاحب کے خدوخال پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ لمبے قد کے تھے، شلوار پہنتے اور سر پر صافہ باندھتے اور نظریں عموماً نیچی رکھتے تھے، مارتے بہت تھے۔ ایک روز مجھے اپنے پاس بُلایا اور کتاب پر بنی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "الطاف بتاؤ اس تصویر میں کیا ہے؟" مَیں استاد صاحب کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا، تاہم کچھ نہ کچھ جواب دینا بھی ضروری تھا۔ مَیں نے گھبراہٹ کے عالم میں تصویر پر نظر ڈالی۔ ایک شاخ پر چڑیا بیٹھی تھی اور وہ اُڑنے کے لیے پَر تول رہی تھی۔ مَیں ابھی تصویر کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ استاد صاحب کی گرجدار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

"اتنی دیر کر دی، جلدی سے بتاؤ اِس تصویر میں کیا ہے؟"

"جناب، ایک مُردہ چڑیا شاخ پر بیٹھی ہے۔" میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"مُردہ چڑیا بیٹھی ہے؟" استاد صاحب نے قدرے

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

غُصّے بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی، ماسٹر صاحب، مَیں اپنا ہاتھ کئی بار اس کے قریب لے گیا، وہ اُڑی ہی نہیں۔ زندہ ہوتی، تو پھر سے اُڑ جاتی۔"

ماسٹر صاحب کا ہاتھ بلند ہوا اور شاید پھر کچھ سوچنے لگے۔

مجھ سے صرف اتنا کہا:

"بیٹا، چڑیا تو زندہ ہے لیکن یہ تصویر میں بے جان نظر آتی ہے۔"

اسی روز سے یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ جو چیز تصویر میں آتی ہے، اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی احساس کی بدولت مجھے فلمیں اچھی نہیں لگتیں۔ ایک دو بار فلمیں دیکھیں، مگر بور ہُوا۔ زندگی سے بے پناہ محبّت مجھے اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ مَیں اپنی زندگی کے تین جاندار گھنٹے بے جان تصویروں کی نذر کر دوں۔

پھر مجھے کچھ یوں یاد پڑتا ہے کہ ایک بار مَیں نے ایک کسان کی تصویر دیکھی۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں ہل چلا رہا تھا۔ فنکار نے اس کسان کے چہرے کے تاثرات اتنی جاندار سستی سے تصویر میں اُبھارے تھے کہ بے اختیار مُنہ سے واہ نکل گئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تصویر کسی بڑے آدمی کے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی تھی اور وہ بڑے اس لیے تھے کہ وہ کسانوں کے ایک بہت بڑے لیڈر تھے۔ اس تصویر کو دیکھنے کے کئی برس بعد مجھے ایک روز چلچلاتی دھوپ میں ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ آدھ گھنٹہ دھوپ میں چلا، تو خدا یاد آ گیا۔ دُور کھیت میں ایک کسان کو ہل چلاتے دیکھا، اُس کے پاس گیا۔ وہ مسلسل تین گھنٹوں سے ہل چلا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مُنہ سے بے اختیار آہ نکلی، مَیں سوچنے لگا: ڈرائنگ روم کی تصویر اور کھیت کے زندہ کسان میں اتنا بڑا فرق کیوں ہے، شاید اس لیے کہ اب مَیں خود ایک تجربے سے گزر رہا تھا۔ اسی روز یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تصویروں اور اعداد و شمار کی روشنی میں کیے جانے والے فیصلے اکثر غلط کیوں ہوتے ہیں اور چائے کی میز پر سے اُبھرنے والی قیادت زندگی کی توانائیوں سے محروم کیوں ہوتی ہے۔

* * * * * *

جنگ کے دنوں میں ایک صبح والدہ نے مجھے بتایا کہ تم تمام رات سوتے میں زور زور سے بولتے رہے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمہارے مخاطب کا نام عالم تھا، کیونکہ تم بار بار یہی نام دُہرا رہے تھے۔ تم نے اس سے کہا: "عالم، مَیں تم سے ملنے کے لیے کئی دنوں سے بے چین تھا۔ تم ذرا میرے قریب آؤ، مَیں تمہاری پیشانی چُوم لوں، تم پاکستان کی عظمت ہو۔ ایک زندہ جاوید عظمت۔ تمہارے عزم نے چند مہینوں میں جنگ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اے خلّاقِ عظمت و فتحمندیِ پاکستان کے حصّے میں آئی اور ہندوستان کی دولت بھارت کا مقدّر بن گئیں۔ اِدھر تو آؤ، مَیں تمہارے ہاتھ چُوم لوں۔ انہی ہاتھوں کی جنبش سے تم نے ۳ سیکنڈ میں بھارت کے پانچ ہوائی جہاز مار گرائے اور فضائی جنگ میں ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ تمہاری ضربِ کلیم سے طلسمِ سامری کے تمام تار و پود بکھر گئے۔ عالم، میرے پاس کچھ بھی تو نہیں جو تمہیں پیش کر سکوں، صرف ایک دھڑکتا دل ہے، وہ تمہارے لیے ہمیشہ دھڑکتا رہے گا، اور سنو، اپنے ساتھیوں کے لیے میرا اسلام شوق لے جاؤ۔ خونِ دل میں ڈوبا ہوا اسلام۔ یہ آفتاب سے چہرے اور ماہتاب سے مکھڑے قوم کو ہمیشہ تابشِ حُسنِ بخشتے رہیں گے اور قوم ان کی راہوں کو دیدہ و دل سے آراستہ کرتی رہے گی۔ عالم، ایک بار اپنی پیشانی کو اور چُوم لینے دو۔"

اس کے بعد والدہ نے کہا: "جب تم خواب میں عالم کو اس طرح ملے ہو، اگر کہیں وہ جاگتے میں تم سے مل جائے، تو نجانے تمہاری کیا حالت ہو۔"

مَیں نے اماں سے کہا:

Pakistan Point
وقار عظیم
Waqar Azeem
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"آپ فکر نہ کریں، مَیں جس دَور کی پیداوار ہوں، اس کے صرف خواب حسین ہوتے ہیں، عملی زندگی نازے میں چھپے ہوئے چہرے کی طرح بھیانک ہوتی ہے۔"

محمد محمود عالم سے ملنے کی خواہش دل کے اندر ہی اندر پرورش پاتی رہی، یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمارے بچّے گلیوں اور سڑکوں پر پرورش پاتے ہیں۔ کئی دفعہ چپکے چپکے سوچا کہ پاکستان ایئر فورس کے محکمہ تعلّقاتِ عامہ کو مدد کے لیے پکاروں مگر پھر اس خیال سے ہمّت نہ پڑی کہ کہیں افسرانِ تعلّقاتِ عامہ قاطعانِ تعلّقاتِ عامہ ہی نہ ہوں ——— مگر محبّت تو اندھی ہوتی ہے۔ مَیں نے معاون افسر تعلّقاتِ عامّہ جناب افضل صاحب کو پشاور فون کیا۔ وہ ملے، تو اُن سے اپنی محبّت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے: "کسی وقت بھی آجاؤ، عالم صاحب سے ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔" افضل صاحب کی شفقت آمیز باتوں نے ایسا اثر کیا کہ مَیں ۱۹ جون کو خیبر میل سے پشاور جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ریزرویشن سے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ دوسرے درجے اور پہلے درجے میں کوئی سیٹ نہیں ہے۔ مَیں نے درمیانے درجے کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ خیال آیا کہ لاہور سے کچھ ڈبّے لگتے ہیں، اگر ڈصاحب سے معلوم کیا جائے شاید کوئی سیٹ مل جائے۔ دو تین صاحب ریلوے کی سفید وردیوں میں ملبوس نظر آئے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں ناموں کی فہرستیں لیے ہوئے تھے، مَیں نے اپنا مدّعا بیان کیا۔ ایک صاحب کہنے لگے: "پہلے درجے میں سیٹ خالی ہے، آپ ٹکٹ لے آئیے۔" مَیں بھاگم بھاگ ٹکٹ لے آیا۔ ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے: "آپ فلاں نمبر ڈبّے میں سیٹ نمبر ۳ سنبھال لیجیے۔" مَیں نے کہا: "حضور، آپ میرے ٹکٹ پر سیٹ نمبر درج کر دیجیے۔" کہنے لگے: "آپ اس کی کیا فکر کرتے ہیں، بس جلدی سے سیٹ پر قبضہ جما لیجیے۔" خیر، مَیں نے اس سیٹ پر سامان رکھ دیا جب یہ ڈبّے اصل گاڑی سے لگے، تو دو تین نوجوان ڈبّے میں داخل

ہوئے اور ان میں سے ایک صاحب نے سیٹ نمبر ۳ پر اپنا سامان رکھ دیا۔ مَیں نے ان سے عرض کی: "یہ سیٹ تو میرے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔" وہ کہنے لگے: "لیکن گارڈ نے میرے ٹکٹ پر سیٹ نمبر ۳ لکھا ہے۔" اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دو اور صاحب ایک ہی سیٹ پر اپنا حق جتا رہے ہیں۔ مَیں اسی عالمِ افراتفری میں اُن صاحب کے پاس گیا جنہوں نے مجھے سیٹ نمبر ۳ الاٹ کی تھی۔ میرے پُوچھنے پر انہوں نے فرمایا: "آپ اُس ڈبے میں سے سامان لے آئیے اور فلاں نمبر ڈبّے میں ۴ بی پر قابض ہو جائیے۔" مَیں نے پھر گزارش کی کہ یہ نمبر میرے ٹکٹ پر درج فرما دیجیے۔ وہ قدرے جھنجھلاتے ہوئے کہنے لگے: "تم مجھے بہت ہی قانونی آدمی معلوم ہوتے ہو، مَیں کہہ جو رہا ہوں کہ یہ سیٹ تمہاری ہے۔" مَیں بتائے ہوئے ڈبّے میں پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس سیٹ پر ایک لحیم شحیم آدمی براجمان ہیں۔

مَیں نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"جناب، کیا یہ سیٹ آپ کی ہے؟"

"اور کیا تمہارے باپ کی ہے؟" انہوں نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہی تین سیٹیں تبدیل کر چکا ہوں، اب آپ آگئے ہیں مجھے پریشان کرنے کے لیے۔" مَیں سمجھ گیا کہ یہ صاحب بھی زخم کھائے ہوئے ہیں۔

مَیں پھر دوڑتا ہوا انہی صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں کہ تمہیں قبضہ ہی کرنا نہیں آتا، اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے۔ مَیں انہیں کیونکر بتاتا کہ زندگی بھر کسی ایک چیز پر بھی اختیار حاصل نہ کر سکا، کسی کو بھی اپنا نہ بنا سکا؛ البتّہ دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتا رہا ہوں اس اُمّید پر کہ شاید کسی کو اپنا بنا سکوں۔ اپنا کون بنتا ہے؟

گاڑی نے وسل دے دی۔ وہ صاحب یہ کہہ کر ایک طرف کو چلے گئے کہ مَیں کچھ نہیں کر سکتا، اب کوئی سیٹ خالی نہیں

ہے۔ مَیں نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے کہا:

"مَیں نے آپ ہی کے کہنے پر اوّل درجے کا ٹکٹ خریدا تھا اور آپ ہی مجھے جواب دے رہے ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رُکے، میری طرف دیکھا، سر جھکا لیا اور پھر ایک اور باوردی صاحب کی طرف بڑھتے ہوئے کہا:

"بھائی، آپ انہیں فرسٹ کلاس میں جگہ دینے کی کوشش کیجیے۔ میرا خیال ہے 'ای' میں ایک سیٹ خالی ہے۔"

گاڑی چل پڑی تھی۔ 'ای' ڈبہ سامنے آیا، تو مَیں اس میں سوار ہو گیا۔ اس میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ ایک سیٹ خالی تھی۔ کہنے لگے:

"آجاؤ، ایک سیٹ خالی ہے، اچھا وقت گزرے گا۔"

مَیں نے کہا: "کیا خبر یہ سیٹ بھی خالی ہے یا کسی اور کو الاٹ کر دی گئی ہے۔ کب کوئی آدھمکے۔"

"آپ فکر نہ کیجیے، اگر کوئی اور صاحب آ گئے، تو مَیں اپنی سیٹ آپ کو دے دوں گا اور مَیں کسی پچھلے ڈبے میں چلا جاؤں گا۔" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

صبح سات بجے پشاور شہر کے سٹیشن پر اُترا اور تانگے میں اباسین ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوچبان نے تین روپے وصول کیے۔ مَیں نے کہا جو مسافت ہم طے کر کے آئے ہیں، اس کے زیادہ سے زیادہ دو روپے ہونے چاہییں۔ کوچبان نے اپنے بچے کی قسم کھاتے ہوئے کہا:

"مَیں نے صرف دو روپے ہی کمائے ہیں۔"

"اور یہ تیسرا روپیہ؟"

"یہ پولیس کا ہے، ہر پھیرے پر ایک روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے، ورنہ روز روز کے چالان بھگتنے پڑتے ہیں۔"

پھر وہ رو پڑا: "بابو جی، اس پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بچپن میں اگر کچھ پڑھ لیتا، تو یہ ذلت آمیز پیشہ کیوں اختیار کرنا پڑتا۔"

میرا بھی دل بھر آیا، کمرے میں آ کر دیر تک سوچتا رہا کہ یا اللہ، وہ دن کب آئے گا جب ہمارے چپے چپے وطن کی پولیس ہمارے لیے سرمایۂ افتخار بن جائے گی اور عام شہری کو یہ محسوس ہونے لگے گا کہ پولیس کا ہر سپاہی، اس کی جان، ناموس، عزت، دیانت اور شرافت کا محافظ ہے —— وہ دن ابھی بہت دُور نظر آتا ہے، کیونکہ ہم میں سے اکثر شیطان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس شیطان کا نام ہم نے "معیارِ زندگی" رکھا ہوا ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ساڑھے آٹھ بجے میں افسر تعلقاتِ عامہ جناب عبدالقدوس صاحب کے رُوبرُو بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان کی متانت مسکرانے لگی۔ بہت ہی خلوص سے پیش آئے۔ انہوں نے عالم صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ قدوس صاحب اور افضل صاحب کے حسنِ سلوک نے وہ تمام تاثرات یکسر بدل ڈالے جو محکمۂ تعلقاتِ عامہ کی معروف روایات بنے ہوئے تھے۔

۲۱ جون کو صبح ساڑھے آٹھ بجے، مَیں عالم صاحب کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا، سامنا ہوا، دونوں طرف سے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھے اور دوسرے لمحے میرے سارے جسم میں اعتماد کی حرارت سرایت کر گئی۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوقِ فراواں سے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ بظاہر عالم صاحب میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ دُبلے پتلے سے، قد بھی درمیانہ سا، خدوخال میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں، آنکھوں میں ایک عام آدمی کی سی گہرائی؛ البتہ ان کی کشادہ پیشانی ان کے بڑے دل اور بڑے دماغ کی آئینہ دار تھی۔ مَیں اس پیشانی کو دُور ہی دُور سے چُومتا رہا مجھے قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

مَیں پانچ منٹ تک یہی سوچتا رہا، کیا کہوں، کیسے کہوں۔

وقار عظیم
پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام

"خوب جنگ لڑی آپ لوگوں نے!" بس یہی الفاظ میری زبان پر آسکے۔

عالم صاحب پہلے مسکرائے ـــــ اور پھر آہستگی سے بولے:
"یہ ہماری بقا کی جنگ تھی، اس میں ہر شخص جان توڑ کر لڑا ہے۔ اللہ کی نصرت و تائید نے ہمیں ذلت آمیز غلامی سے محفوظ رکھ لیا، ہم اُس کا جس قدر بھی شکر ادا کریں کم ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ ہماری سترہ روزہ جنگ میں جو شدت رہی، وہ دوسری جنگِ عظیم میں بھی نہیں تھی؟"

"جی نہیں، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی طرف سے جس عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ ہوا ہے، وہ بلاشبہ کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور ہمیں اس پر بجا طور پر فخر ہے، ہمیں اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ باہر کے ممالک بعض مصلحتوں کی بنا پر پاکستان کے کارناموں کو وہ اہمیت نہیں دے رہے جو انہیں ملنی چاہیے۔ اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں کہ ہماری پیادہ فوج دنیا کی بہترین پیادہ فوج ہے۔ اور اب ہم نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ہماری چھوٹی سی فضائیہ، اگر وہ پوری طرح لیس ہو، تو وہ برطانیہ اور امریکہ کی فضائیہ کے مقابلے میں لائی جاسکتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے کہ بعض غیر ملکی فوجی مبصّرین ہماری جنگ کے بارے میں انتہائی غیر ذمّے دار باتیں لکھ رہے ہیں، لیکن اس طرح حقائق چھپا تو نہیں کرتے۔"

"عالم صاحب، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فضائیہ کو جنگ میں کیا رول ادا کرنا تھا، اور وہ یہ رول ادا کرنے میں کس حد تک کامیاب رہی ہے؟"

"فضائیہ کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ پاکستان کی پیادہ فوج کو میدانِ جنگ میں پوری طرح لڑنے کے لیے مواقع فراہم کرے۔ ہم نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر اس مقصد کے لیے ہماری چھوٹی سی فضائیہ پوری کی پوری بھی تباہ ہو جائے، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ بہت ہی کم قربانی سے ہم نے یہ عظیم الشان مقصد حاصل کر لیا۔ ہم نے بھارت کی فضائیہ کا اس حد تک ناک میں دم کر دیا تھا کہ اسے ہماری پیادہ فوج پر حملے کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی اور ہماری پیادہ فوج پورے اطمینان سے میدانِ جنگ میں لڑتی رہی۔ ہماری فضائی برتری کا یہ عالم تھا کہ ہم دشمن کے علاقے میں میلوں اندر چلے جاتے اور دشمن کو للکارتے، لیکن بھارت کے طیاروں کو ہمارے مقابلے میں آنے کا بہت ہی کم حوصلہ ہوا۔"

"عالم صاحب، بھارت کی فضائیہ، پاکستانی فضائیہ کے مقابلے میں چھ گنا بڑی تھی، لیکن جنگ کے دوران میں برتری پاکستان کو حاصل رہی، آپ نے اس کے اسباب پر تو غور کیا ہوگا؟"

"اسباب بالکل واضح ہیں، ہمیں شروع ہی سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ ہم نے تعداد QUANTITY کا حسنِ کارکردگی QUALITY سے مقابلہ کرنا ہے۔ بس ہم اپنے آپ کو انہی خطوط پر تیار کرتے رہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو زندگی اور موت کے حقیقی تصوّر کے ذریعے جو خود اعتمادی اور بے خوفی پیدا کر دیتا ہے، وہ ایک ہندو کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ مَیں یہ بات روایتی طور پر نہیں کہہ رہا، بلکہ اس میں میرا تجربہ، میرا احساس اور میرا اپنا شعور شامل ہے۔ مَیں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ جب میں قرآن کی آیات پڑھ کر فضا کی بسیط پہنائیوں میں اُڑتا، تو مجھے کتنا اطمینان اور سرور حاصل ہوتا تھا۔ مَیں نے ایک لمحے کے لیے بھی گھبراہٹ محسوس نہیں کی، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری موت کا وقت معیّن ہے، وہ اس سے پہلے نہیں آئے گی۔ اور یہ موت میری زندگی کا خاتمہ تو نہیں، اس کے بعد تو حیاتِ ابدی شروع ہوتی ہے ـــ بس بنیادی بات یہ ہے کہ مومن جنگ اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے لڑتا ہے اور کافر کے نزدیک جنگ منتہائے مقصود ہے۔ ہماری اسلامی

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تاریخ میرے نظریے کی تائید کرتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے علوم و فنون، فنِ تعمیر اور انسانی تہذیب کے تمام دائروں میں حیرت انگیز اضافے کیے۔ ایسے اضافے جو اہلِ یورپ نے اپنے نام منسوب کر لیے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں، مگر میری نظر سے کم از کم کوئی ایسی قابلِ ذکر کتاب نہیں گزری جو مسلمانوں نے فنِ حرب پر لکھی ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک جنگ فتحائے مقصود کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ مسلمان تو ظلم و فساد مٹانے کے لیے میدان میں آتے تھے تاکہ انسانیت کو آزادی کے ساتھ عدل و انصاف کی بنیادوں پر نشو و نما پانے کا موقع ملتا رہے۔ اس کے مقابلے میں ہندو تہذیب کی مقدس کتابوں کا آغاز ہی رزمیہ قصوں سے ہوتا ہے اور یورپ میں بھی فنِ حرب پر ایک ہزار سال سے کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔"

"عالم صاحب، جب جنگ شروع ہوئی اُس وقت آپ کے کیا تاثرات تھے؟"

"تاثرات ـــــ تاثرات ـــــ بس یہی تاثرات تھے کہ اسلام اور کفر میں جنگ شروع ہو گئی ہے اور ہم جہاد میں حصّہ لینے جا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں یہ بات بہت پختہ تھی کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہو کر رہے گی۔ میں ایک مدّت سے بھارتی زعما اور مفکروں کی کتابیں بڑے غور سے پڑھ رہا تھا، ان کے مطالعے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ پاکستان کو ختم کر دینا چاہتے ہیں یا اس کو ایک سیّارچے کی حیثیت دینا چاہتے ہیں جو ہمیشہ بھارت کے گرد گھومتا رہے۔ بھارت کی نگاہیں بڑی دیر سے شرقِ اوسط پر لگی ہوئی ہیں اور وہ پاکستان کو اپنے عزائم کی راہ میں دیوار سمجھتا ہے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ بھارت اس دیوار کو گرانے کے لیے ضرور شبخون مارے گا ـــــ اور بالآخر وہ شبخون مارنے کی حماقت کر ہی بیٹھا۔ اور کون جانے یہ حماقت کتنی بار دہرائی جائے گی۔"

"جنگ میں سے گزرتے ہوئے کیا آپ کے اندر کوئی نیا جذبہ پیدا ہوا؟"

"یوں تو کئی نئے جذبے جاگتے رہے، لیکن دو جذبوں کا میں خاص طور سے ذکر کروں گا۔ پوری قوم نے جس جوش و خروش سے ہمارے ساتھ تعاون کیا، اس سے یہ احساس پیدا ہوا کہ ہماری قوم عظیم صلاحیتوں کی مالک ہے اور وہ محیّر العقول کام سرانجام دے سکتی ہے۔ دوسرا احساس بہت ہی لطیف تھا۔ میں جب کسی پاکستانی کو دھوتی یا تہہ بند باندھے دیکھتا ہوں، تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ غریب پاکستانی میرا بھائی ہے اور میں اس کی جان اور ناموس کا امین و محافظ ہوں۔ اب اس کا غم میرا غم ہے اور اس کی خوشی میری اپنی خوشی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پوری پاکستانی فوج اب اسی جذبے سے سرشار ہے۔"

"عالم صاحب، فضائی جنگ میں سب سے نازک دن کون سا تھا؟"

"میرے نزدیک ۷ ستمبر کا دن ہمارے لیے انتہائی نازک اور فیصلہ کن تھا۔ اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں یکم ستمبر کی طرف آنا ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے اس تاریخ کو بھارت نے چھ جوڑیاں میں پہلی بار فضائی طاقت استعمال کی۔ اگر غور سے دیکھا جائے، تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم نے فضائی جنگ یکم ستمبر ہی کو جیت لی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب بھارت اور پاکستان کے ہوابازوں کو اپنے اپنے جوہر دکھانے تھے اور جس طرف کا پلڑا بھاری رہتا، پوری جنگ میں وہی طرف حاوی رہتی۔ رفیقی اور امتیاز احمد بھٹی نے پہلی ستمبر کو بھارت کے چار ہوائی جہاز تباہ کر کے بھارت کی فضائیہ کا پول کھول دیا اور ہم میں یہ اعتماد اور بھی راسخ ہو گیا کہ انشاء اللہ ہم کامران و سربلند رہیں گے۔ ۲ ستمبر کو میں نے جوڑیاں پر بے دھڑک گولہ باری کی اور دشمن کے فوجی ٹھکانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ حالات کی رفتار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمیں جلد ہی اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ ہم اس کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ۶ ستمبر کو جونہی بھارت نے ہم پر حملہ کیا ہم نے اپنا کام شروع

وقار عظیم
پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام

اسے احساس ہوگیا کہ پاکستانی فضائیہ سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہیں۔ اس روز کے بعد بھارتی طیارے دن کے وقت پھر کبھی پاکستانی علاقے میں داخل نہیں ہوئے۔ ۷ ستمبر نے بھارتی فضائیہ کے حوصلوں پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اس میں جارحیت کی سکت نہ رہی۔ دراصل ہم نے سترہ روزہ جنگ اسی دن جیت لی تھی۔"

"عالم صاحب، کچھ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے؟"

"چند باتیں عرض کیے دیتا ہوں، میں کلکتے میں ۱۹۳۵ء کے اوائل میں پیدا ہوا۔ میرے والدِ محترم کا نام مسعود عالم ہے۔ میرے والد صاحب ہمارے خاندان میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ آبا و اجداد کے پاس چھوٹی چھوٹی جاگیرداریاں تھیں اور وہ زیادہ وقت علم و ادب کی خدمت میں گزارتے تھے۔ میرے نانا صاحب کو عربی، فارسی زبانوں کے علاوہ ترکی زبان بھی آتی تھی۔ ہمارا خاندان خالص دینی خاندان تھا۔ عورتیں پردہ کرتیں، نماز کا خاص اہتمام ہوتا اور اسلامی اقدار پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی تعلیم کا آغاز قرآن حکیم سے کیا، اس زمانے میں یہی دستور تھا۔ والدہ نماز کے لیے تاکید کرتی رہتیں اور میں بزرگوں کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے جاتا۔ گھر پر دادا صاحب کی ایک مختصر سی لائبریری تھی جس میں زیادہ تر اسلامی تاریخ، سیرت اور سوانح پر کتابیں تھیں۔ میں انہیں پڑھتا اور انہی کتابوں کے مطالعے سے میں خالد بن ولیدؓ، طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر سے متعارف ہوا۔ میرے ننھے منے ذہن میں یہ شخصیتیں اس طرح سما گئی تھیں کہ میں زیادہ تر انہی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اپنے تجربے کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں چھوٹی عمر کے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دینی چاہیے اور اس بات کا اہتمام بھی ضروری ہے کہ بلند کردار اسلامی شخصیتوں کے خدوخال بار بار ان کے سامنے آتے رہیں تاکہ وہ اچھے کردار کو آئیڈیل کے طور پر قبول کرلیں اور غیر شعوری اور شعوری طور پر اپنے اندر وہی اوصاف

کر دیا۔ ہم تمام دن دشمن کے ہوائی اڈوں پر بمباری کرتے رہے اور اپنی میدانی فوج کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ شام کے چار بجے میں اور رفیقی آدم پور اور ہلواڑے کی طرف روانہ ہوئے۔ ترن تارن کے قریب میری بھارتی طیاروں سے مڈبھیڑ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تین طیارے زمین پر آرہے۔ رفیقی نے بھی تین طیارے مار گرائے، لیکن اس میں ہمارے بھی دو ہوائی جہاز تباہ ہوئے۔ رفیقی اور یونس اسی جنگ میں کام آئے۔ ۶ اور ۷ ستمبر کی رات کو ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ بھارت کے ہوائی جہاز رات کو سرگودھا پر حملہ آور ہوں گے۔ ہم تمام رات تیار بیٹھے رہے، لیکن وہ نہ آئے۔ بھارت کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر سرگودھا تباہ ہوگیا، تو پاکستان کی فضائیہ ناکارہ ہو جائے گی اور اسے پاکستان پر قبضہ کرنے میں بہت آسانی رہے گی۔ ہم صبح کی نماز سے فارغ ہو چکے تھے، کوئی ساڑھے پانچ بجے کا عمل ہوگا، چھ بھارتی طیارے سرگودھا کے اوپر منڈلانے لگے۔ ہمارے لڑاکا طیاروں نے آنِ واحد میں دو بھارتی طیاروں کا خاتمہ کر دیا۔ دو طیارے ہماری طیارہ شکن توپوں نے مار گرائے، اس طرح بھارت چار ہوائی جہاز کھو بیٹھا، باقی دو بھاگ نکلے۔ آدھ گھنٹے بعد سرگودھا پر چھ ہنٹر بھارتی طیارے پھر نمودار ہوئے۔ میں اللہ کا نام لے کر فضا میں اُٹھا اور بھارتی طیاروں کے پیچھے لگ گیا۔ ۳۰ سیکنڈ میں پانچ طیارے زمین پر تھے۔ ایک پائلٹ کو ہم زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ان میں تین سکوڈرن لیڈر بھی شامل تھے۔ گویا بھارت اپنی فضائیہ کا بہترین حصہ سرگودھا بھیج رہا تھا۔ دس بجے کے قریب بھارتی طیارے پھر چکر لگانے لگے، لیکن جونہی ہمارے ہوا باز مقابلے کے لیے آگے بڑھے، وہ دُم دبا کر بھاگ گئے۔ ساڑھے دس بجے بھارتی طیاروں نے ایک بار پھر سرگودھا پر منڈلانا شروع کر دیا۔ ایک ہوائی جہاز ہماری طیارہ شکن توپ نے مار گرایا اور ایک طیارہ فضائی مقابلے میں ختم ہوگیا۔ ان پیہم نقصانات نے بھارت کی کمر توڑ دی اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عوام کے لئے
عوام کی پسند

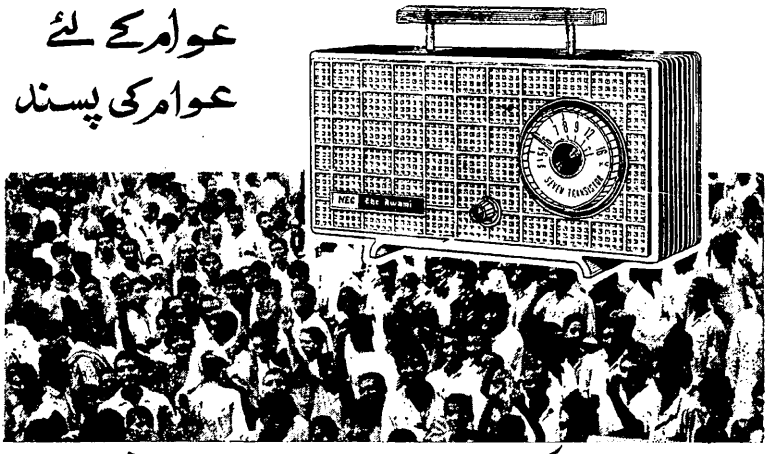

پاکستان بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا

نیا عوامی ٹرانسسٹر ریڈیو

اب اضافی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

قیمت صرف ۱۱۵ روپے

مقامی ٹیکس اور سیلوں کے علاوہ

اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- ۷ ٹرانسسٹر، ۱ تھرمسٹر، ۱ ڈی اوڈز
۲- ۴ انچ سائز کا طاقت ور سپیکر
۳- رینج: ۵۳۵-۱۶۰۵ کلوسائیکل
۴- کارکردگی: ۷۰۰ ملی واٹ
۵- بیٹری: ۴ ٹارچ سیلز (۶ وولٹس)

عوامی ٹرانسسٹر ریڈیو پر ملک کے ہر حصّہ میں ملکی اور غیر ملکی تمام میڈیم ویو سٹیشنوں کی نشریات صاف اور واضح سن سکتے ہیں

RGA شہرہ آفاق NEC ٹرانسسٹر ریڈیو کے تیار کنندہ

تیار کنندگان:
ریڈیو اینڈ جنرل ایپلائینسز لمیٹڈ - سلم ٹاؤن - لاہور

تقسیم کنندگان:
کیپٹل ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ - آر جی - اے ہاؤس - ہال روڈ - لاہور

پیدا کرنے کی سعی کرنے لگیں۔

ابھی میں گیارہ بارہ برس کا تھا کہ مُسلم قومیّت کی چنگاری میرے سینے میں فروزاں ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۴۶ء میں قائدِ اعظم کلکتے تشریف لائے اور ان کی آمد سے وہ چنگاری اور بھی بھڑک اٹھی۔ میں نے ۱۹۴۶ء میں راست اقدام میں حصّہ لیا۔ اگلے برس پاکستان معرضِ وجود میں آگیا، ہمارا خاندان مشرقی پاکستان چلا آیا۔ ۱۹۴۹ء سے ایئر فورس میں بھرتی ہونے کی کوشش کرتا رہا اور یہ کوشش ۱۹۵۱ء میں بار آور ہوئی۔"

"عالم صاحب، آپ نے یہ میدان کس لیے منتخب کیا؟"

"میرا خیال ہے کچھ تو اسلامی کتابوں کا اثر تھا اور کچھ میرا یہ احساس کہ فوجی کی زندگی پاکیزہ اور اعلیٰ مقاصد کی آئینہ دار ہوتی ہے، بس یہی جذبہ مجھے یہاں لے آیا۔ میرے اساتذہ نے اس جذبے کو اور بھی نکھار دیا۔ میں اپنے اُستاد پکوڈیرن لیڈر محمد احمد صاحب کے احسانات کبھی فراموش نہ کرسکوں گا، وہ بہت ہی اچھے انسان تھے، ان کے کردار کی عظمت کے نشان آج بھی میرے ذہن پر تازہ ہیں، وہ ہمیشہ شکیل سیرت پر زور دیتے تھے۔ کاش! وہ زندہ ہوتے۔ میری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ رہی ہے کہ میں نے کسی غیر ملکی اُستاد سے ٹریننگ نہیں لی۔ شاید اس اعتبار سے میں پہلا خوش نصیب پاکستانی ہوں۔ مجھے غیر ملکی اساتذہ سے سخت نفرت ہے، وہ پاکستانی طلبہ میں فکری انتشار، احساسِ کمتری اور بے اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستانی اساتذہ بڑے اچھے پائلٹ تیار کرسکتے ہیں۔

ایئر فورس میں آنے سے مجھے ایک بڑا نقصان بھی پہنچا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میری اُردو خاصی اچھی تھی لیکن ملازمت کے دوران میں سارا کام انگریزی زبان میں ہوتا ہے، اس لیے اُردو کی استعداد ختم ہوتی چلی گئی۔ اب اُردو سے دوبارہ متعارف ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ غیر ملکی زبانوں میں تو شخصیت کا پورا اظہار ہی نہیں ہوتا، پھر قومی زبان کو خیرباد کہنے سے ان تمام اقدار اور روایات کو خیرباد کہنا پڑتا ہے جو قومی مزاج کا اہم حصّہ ہوتی ہیں۔ میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ غیر ملکی زبان کے ہوتے ہوئے کسی قوم کے لیے ذہنی غلامی سے نجات پانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"عالم صاحب، آج کل آپ کی کیا ہابی ہے؟"

"کتابیں پڑھتا ہوں، اقوامِ عالم کی تاریخ پڑھ رہا ہوں تقابلی مطالعے سے میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں نے انسانی تاریخ کو جو کچھ دیا ہے، وہ کوئی نہ دے سکا۔ ہائے! ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم ایسا قیمتی ذخیرہ چھوڑ کر جھوٹے نگوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہمارے بچّوں کو، ہمارے جوانوں کو اور ہمارے متوسط طبقے کو اپنی عظیم الشان روایات، اپنے تابناک ماضی اور اپنی جلیل القدر عظمتوں سے روشناس کرو، اور انہیں بتاؤ کہ اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت سے ذہنی خوراک حاصل کیے بغیر آبرومندانہ زندگی نہیں گزار سکتے۔ میں نے ابھی ابھی متوسط طبقے کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اس سے میری مُراد وہ طبقہ نہیں جس کا مطمحِ نظر خوبصورت بنگلہ، خوبصورت کار اور خوبصورت بنک بیلنس قرار پایا ہے، بلکہ متوسط طبقہ تو وہ ہوتا ہے جو تب و لیوں کی افراط و تفریط کے درمیان اپنے تہذیبی اور فکری سرمایے کی حفاظت کرتا ہے اور ماضی اور حال کی کڑیوں کو جوڑتا ہے۔ تاریخی انقلابات اور عظیم تبدیلیاں اس حقیقت کی طرف واضح اشارے کرتی ہیں کہ جب کسی تہذیب میں عقل کا عمل دخل بہت زیادہ بڑھا، تو اس معاشرے میں عیّاری عام ہوتی چلی گئی اور یہی عیّاری تنزّل کا سبب بنی۔ عقل انسانی مسائل کو سُلجھانے میں مدد تو کرسکتی ہے لیکن وہ راہنما کا کردار ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ راہنمائی کی صلاحیت تو صرف پختہ عقائد ہی رکھتے ہیں۔ عقل کی طاقت کو ایمان کی طاقت سے کیا نسبت؟ ایک طاقت حیلے بہانے تراشتی ہے اور دوسری طاقت جہانِ تازہ پیدا کرتی ہے۔ زندہ قومیں وہی عمل و ہمراہی رہیں گی جس کا اقبالؔ کے اس شعر میں ذکر ہے۔ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اسلامی تاریخ میں، مَیں آج کل جمال الدین افغانی کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں افغانی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جدّوجُہد کرنی چاہیے۔ اس کے پیغام میں توانائی ہے، حُرّیتِ فکر ہے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے سربلند رہنے کی تڑپ نظر آتی ہے، وہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی غلامی سے نکال کر، انہیں اسلامی تہذیب کی صالح اور عالمگیر بنیادوں پر متحّد کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ بیس پچیس برس کے اندر اندر مسلمان ممالک متحّد ہو جانے پر مجبور ہو جائیں گے، ورنہ اُبھرتا ہُوا عفریت ان کو ایک ایک کر کے نگل لے گا۔"

عالم صاحب خاموش ہو گئے، اور مَیں نے عالمِ تصوّر میں بھارتی عفریت کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ کتنا بھیانک اور خوفناک تھا یہ منظر! مَیں چونک پڑا ــــ عالم صاحب کی پیشانی پر تفکّر کے خطوط اُبھر رہے تھے۔ انہوں نے پُرمعنی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مَیں ان کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا۔ بس اتنا سمجھ سکا جیسے وہ اہلِ دانش سے سوال کر رہے ہوں:

"تم کیا کرتے رہے ہو؟ آج تک قوم کو واضح نصب العین بھی نہ دے سکے؟"

مَیں نے نظریں نیچے جُھکا لیں۔

ایک منٹ کے بعد مَیں ان سے رخصت ہو رہا تھا۔

مَیں نے ایک بار پھر دُور ہی دُور سے ان کی پیشانی کو چُوما۔

اور دیر تک یہ سوچتا رہا:

اس شخص نے جنگ میں کتنا اہم کردار ادا کیا، لیکن ایک بار بھی تو اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ عجز و انکسار کی کتنی دلآویز تصویر ہے!

--

تین قطعات

خُودی

ہم نے اقبال کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جُھکنے والوں نے رفعتیں دیکھیں
ہم خُودی کو بلند کرتے رہے

طائرِ لاہوتی

آج اُن کی حقیقت کو افسانہ سمجھتے ہیں
کل جن کی فقیری میں مضمر تھی شہنشاہی
اِس دَور میں ایسے بھی ہیں طائرِ لاہوتی
آتی ہی نہیں جن کی پرواز میں کوتاہی

پردہ

میں نے اِک دُخترِ ملّت سے یہ اِک روز کہا
حُسن کی اپنے نہ اس طرح سے رُسوائی کر
ہنس کے کہنے لگی اقبالؔ نے فرمایا ہے
"پردہ چہرے سے اُٹھا انجمن آرائی کر"

مرزا محمود سرحدی

عربی افسانہ

عظیم منصوبہ

محمود تیمور
ظہور احمد اظہر

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

شیخ ابوالبرکات محلے کی پرانی سی مسجد کے امام تھے۔ ان کی عمر کے پچاس سال عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوئے تھے، پھر بھی وہ مطمئن اور مسرور تھے۔ انہیں اپنی غربت کا احساس تک نہ تھا، وہ اس حدیث پر پوری طرح عمل پیرا تھے کہ "دنیا کی ایک نیکی کا بدلہ آخرت میں دس گنا ملے گا۔" یہی وجہ تھی کہ وہ سخی طبیعت، کشادہ دل اور عالی حوصلہ تھے۔ فقرا، مساکین اور بھولے بھٹکے مسافروں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے، جو روکھی سوکھی گھر میں موجود ہوتی، بلا تکلف مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے۔ دنیاوی نعمتوں سے انہیں کوئی غرض نہ تھی۔ مقدور بھر وہ اپنی آخرت سنوارنے میں منہمک رہتے۔ دنیا ان کی نظر میں دارِ فانی تھی اور آخرت دارِ باقی۔ انہیں اکثر بنی نوعِ انسان کی بدبختی اور بدحالی پر رونا آتا۔ ہر نماز کے بعد وہ اللہ تعالےٰ کے حضور عہد کرتے کہ اگر انہیں کہیں سے بڑی مقدار میں دولت ہاتھ آگئی، تو وہ اسے فوراً اپنے محلے کے غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیں گے اور پھر یوں ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور وہ اچانک مالدار بن گئے۔ یہ بہت سی دولت انہیں لاٹری کے ایک ٹکٹ پر ملی تھی۔ یہ ٹکٹ انہوں نے اپنی مرضی سے نہیں خریدا تھا اور نہ خریدتے وقت ان کے ذہن میں دولت حاصل کرنے کا خیال تھا، وہ تو صرف ٹکٹ فروخت کرنے والے غریب آدمی کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

شیخ صاحب کو جب اپنے اچانک دولت مند بننے کی خبر ملی، تو وہ حیران رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے تو ان پر بے ہوشی اور بے خودی کا عالم طاری ہو گیا، لیکن جلد ہی وہ ہوش میں آگئے۔ ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے ایک آواز اُبھری "یہ مال تیرا نہیں ہے، اسے اپنے اوپر ہرگز صرف نہ کرنا، یہ تو فقرا اور مساکین کا حق ہے، اللہ تعالےٰ نے تجھے اس دولت کا نگران مقرر کیا ہے تاکہ تو پوری دیانت داری سے اسے حاجت مندوں

ہیں تقسیم کر سکے۔"

انہوں نے اللہ تعالےٰ کے اس عطیے کا شکر ادا کرنے کے لیے آسمان کی طرف سر اُٹھایا۔ خوشی اور عجز کے ملے جُلے جذبات سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ اللہ تعالےٰ سے کیا ہوا اپنا عہد امانت اور دیانت سے پورا کریں گے۔ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ضرورت مندوں پر بخشش و عطیات کی بارش شروع ہو گئی۔ ان کی فیاضی اور دریا دِلی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور دولت سمیٹنے لگے، وہ انہیں دعائیں دے رہے تھے۔ دن بھر سخاوت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا اور شیخ صاحب کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ شام ہوئی تو وہ مسرت و شادمانی اور قناعت و اطمینان کی دولت لے کر گھر لوٹے اور بیوی بچوں کے ساتھ رُوکھی سُوکھی کھا کر حسبِ معمول عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جائے نماز ہی ان کی حقیقی پناہ گاہ تھی۔ اس رات انہوں نے بڑے عجز و نیاز اور خضوع و خشوع کے ساتھ خدا سے اپنی مغفرت اور اس کی رضا کی دعا مانگی۔

دِن گزرتے چلے گئے۔ شیخ صاحب کی سخاوت و فیاضی میں کوئی فرق نہ آیا۔ جو بھی ان کے سامنے ہاتھ پھیلاتا، اپنی مُراد پا لیتا۔ ان کے دروازے پر دُور دراز سے آئے ہوئے سائلوں اور حاجت مندوں کا ہجوم رہتا۔ جونہی وہ گھر سے نکلتے ــــ لوگ تحسین و آفرین کے کلمات دہراتے ہوئے ان کی طرف لپکتے۔ کوئی تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا مانگتا، کوئی اپنے کسی عزیز کے لیے دوا کے پیسے اور کوئی بچوں کی فیس ادا کرنے کے لیے تھوڑی بہت رقم۔ شیخ صاحب ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے اور دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے۔

آہستہ آہستہ انہیں احساس ہونے لگا کہ حاجت مندوں اور سائلوں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بعض ضرورت مند بڑی ذلّت اور عاجزی سے التجا کرتے اور بعض انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی سے اپنا مطالبہ منوانے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات تو شیخ صاحب پریشان ہو جاتے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کریں۔ ایک روز ان کے ایک دوست نے ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا:

"شیخ صاحب، سخاوت و فیاضی کا جو طریقہ آپ نے اختیار کر رکھا ہے، درست نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو عطیات اور خیرات سے نوازا ہے جو ہرگز اہل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے ایسے مستحق لوگ ہیں جنہیں آپ کی خیرات میں سے کچھ نہیں ملا۔ آپ کو سوچ سمجھ کر ایک منصوبہ تیار کرنا چاہیے تاکہ واقعتہً حاجت مند لوگ فائدہ اٹھا سکیں اور آپ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو۔"

شیخ ابوالبرکات نے حکمت و دانش مندی کے ان کلمات کو نہایت غور سے سُنا اور فیصلہ کیا کہ وہ صرف اُنہی لوگوں کو خیرات کا مستحق سمجھیں گے جن کے متعلق ان کے پاس پوری معلومات ہوں گی۔ چنانچہ اس دن سے شیخ صاحب نے اجنبی لوگوں پر سخاوت کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے سوچا، کون جانے وہ لوگ ضرورت مند ہیں یا یونہی بن رہے ہیں۔ ان کے دماغ میں منصوبوں کا ایک طوفان سا اُمنڈ آیا، وہ ایک ایک کر کے ان پر غور کرنے لگے، لیکن ہر منصوبے میں کوئی نہ کوئی پیچیدگی سامنے آ جاتی۔ مسائل در مسائل پیدا ہوتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کون سا طریقہ اختیار کریں۔ ایک روز تو وہ اس بکھیڑے سے عاجز آ گئے۔ ان کے جی میں آئی کہ ساری دولت کسی رفاہی ادارے کے حوالے کر کے اس ذمے داری سے سبکدوش ہو جائیں، لیکن فوراً ہی ضمیر نے ملامت کی۔ کیا یہ فرض کی ادائگی سے انحراف نہیں۔ خدا نے انہیں بیکسوں کی امداد کا فرض سونپا تھا، وہ کیوں کر اس فرض کو فراموش کر سکتے تھے۔

وقار عظیم
پاکستان ورچوئل لائبریری

پھر انہیں یہ خوف بھی تھا کہ کہیں وہ ریاہی ادارہ اس امانت کے لیے نااہل ثابت ہو، اور خدا کے عطا کردہ مال کو برباد نہ کر دے، وہ جانتے تھے کہ طمع اور ہیر پھیر دو ایسی عادتیں ہیں جو انسانی فطرت میں داخل ہیں؛ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی دوسرے کو فقرا اور مساکین کے معاملات کا نگران نہیں بنائیں گے اور خدا نے انہیں جس کام پر مامور کیا ہے، اس سے اعراض نہیں کریں گے۔

غربا اور مساکین کی حاجت روائی کے بعد شیخ ابوالبرکات گھر لوٹے، تو ان کی بیوی جھجکتے ہوئے بولی:

"کیا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس مال میں ہمارا کوئی حصہ نہیں؟ آخر ہماری باری کب آئے گی؟ ہمارے بھی ننھے ننھے معصوم بچے ہیں؛ ہمارے پاس ان کا تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا تک نہیں۔ آپ اجنبی سائلوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، لیکن اپنے اہل وعیال کو فراموش کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ بچے آپ کی امانت کے زیادہ محتاج ہیں۔"

شیخ صاحب بیوی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے بولے:

"یہ مال میرا نہیں ہے، اسے اپنے یا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ یہ تو بے کس اور نادار لوگوں کی امانت ہے۔"

بیوی نے ایک بار پھر ہمت کر کے کہا:

"تو کیا ہم نادار اور بے کس نہیں ہیں؟"

"ہمارے پاس اپنی ضرورت کا سب کچھ موجود ہے۔ اس دنیا میں ہم سے بھی زیادہ مستحق لوگ موجود ہیں۔ میں انہی لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اپنے بچوں سے محبت نہیں رہی۔"

"میں کہتا ہوں یہاں سے چلی جا، دور ہو جا میری نظروں سے، تو چاہتی ہے کہ میں اپنے راستے سے بھٹک جاؤں۔" شیخ

صاحب نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بے چاری عورت روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے بچے بھی سسکیاں بھرتے رخصت ہو گئے۔

شیخ صاحب کی نظر بچوں کے پھٹے ہوئے کپڑوں پر پڑی، تو وہ کانپ اٹھے اور فوراً جائے نماز پر کھڑے ہو کر خدا سے دعائیں مانگنے لگے کہ وہ انہیں لغزشوں سے بچائے۔

اگلی صبح ایک شخص نے ان کے دروازے پر دستک دی اور اپنی بدحالی کا رونا روتے ہوئے درخواست کی کہ اسے اپنے بچوں کا تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے چاہییں۔ شیخ صاحب کچھ دیر اس شخص کی طرف دیکھتے رہے۔ اچانک ان کی نظروں کے سامنے اپنے ننگ دھڑنگ بچے آ گئے۔ انہوں نے اپنے اوپر تار بار پاتے ہوئے جیب سے حقیر سی رقم نکالی اور سائل کے ہاتھ پر رکھ دی۔ سائل کے ماتھے پر بل پڑ گئے:

"شیخ صاحب، ان سکوں سے تو ایک کرتا بھی نہیں خریدا جا سکتا، میرے بچے تو خاصے بڑے ہیں اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔"

شیخ صاحب تیزی سے بولے: "بس بس، میں یہی کچھ دے سکتا ہوں۔ میرے کندھوں پر ایک اہم خیراتی منصوبہ پورا کرنے کی ذمے داری آن پڑی ہے۔ مجھے اس منصوبے کے لیے بہت سی رقم چاہیے، جو کچھ دیا ہے اسی پر قناعت کرو۔"

وہ شخص بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

چند روز بعد ان کے پاس ایک ایسا سائل آیا جو پہلے بھی کئی بار ان کی فیاضی سے بہرہ ور ہو چکا تھا، وہ بظاہر دبلا پتلا اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس نے ان کے سامنے بھوک کی شکایت کی اور قسم کھائی کہ وہ کئی دن سے فاقہ کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکھڑایا اور ضعف و نقاہت کی وجہ سے گر پڑا۔ شیخ صاحب نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور اس کی جیبیں بھرنے لگے۔ سائل کا سر فرطِ عقیدت سے جھک گیا، وہ انہیں دعائیں دیتا ہوا

عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد شیخ صاحب نے اُسی سائل کو محلّے کے ایک ہوٹل میں بھوک مٹاتے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا سا تھال رکھا تھا جس میں سے بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ شیخ صاحب کی اپنی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اُنہوں نے فوراً سر جُھکا لیا اور تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر جب وہ اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے، تو ان کے سامنے ایک چھوٹی سی پلیٹ میں باسی پنیر اور خشک روٹی کے کچھ ٹکڑے رکھ دیے گئے۔ اگلے ہی لمحے کئی ہاتھ پلیٹ کی طرف اُٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ صاف ہو گئی۔ شیخ صاحب ملول ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور جائے نماز بچھا لی۔

اگلے روز وہ بھوکا سائل پھر آیا اور شیخ صاحب سے مدد کی درخواست کی۔ اس مرتبہ شیخ صاحب نے اس کی ہتھیلی پر چند معمولی سکّے رکھ دیے، وہ غصّے اور ناراضگی میں بکتا جھکتا چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد شیخ صاحب بازار سے گزرے، تو ان کی نظر "بھوکے سائل" پر پڑی جو راستے میں ایک طرف بیٹھا خشک روٹی پانی سے نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

جمعے کے روز شام کے وقت شیخ صاحب گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک دکاندار نے دروازہ کھٹکھٹایا اور درخواست کی کہ وہ اپنی بیوی کے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کریں۔ شیخ صاحب بل پر نظر ڈالتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ دکاندار سے انہوں نے ایک دن کی مہلت مانگی اور بیوی کے پاس جا کر بولے:

"یہ کپڑے کیسے ہیں جن کی قیمت یہ دکاندار مجھ سے مانگ رہا ہے۔"

"مجھے اور میرے بچّوں کو کپڑوں کی ضرورت تھی، اس لیے میں نے یہ کپڑے خریدے ہیں۔" بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں تمہیں یہ جرأت کیوں کر ہوئی، تمہیں معلوم ہے میں ایک غریب آدمی ہوں۔ ان فضول خرچیوں کے لیے روپیہ کہاں سے لاؤں؟"

"جانے بھی دیجیے، آپ کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ اس جیسے سینکڑوں بل آپ آسانی سے ادا کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ جھٹ کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا لائی اور مسکراتے ہوئے بولی:

"دیکھیے تو سہی کتنے شاندار کپڑے ہیں، سچ سچ بتائیے جب آپ کے بچّے اور بیوی یہ کپڑے پہنیں گے، تو آپ کو خوشی نہیں ہو گی؟"

شیخ صاحب نے ہاتھ لگا کر دیکھا، انہیں محسوس ہوا کہ کپڑے واقعی بہت ملائم اور چکنے ہیں۔ غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ اپنے پھٹے پرانے جُبّے کی طرف اُٹھ گیا۔ جُبّے کا کھُردرا پن اور جگہ جگہ لگے ہوئے پیوند بُری طرح کھٹکنے لگے۔ پھر اچانک ہی وہ چلّا کر بولے:

"تو میری اجازت کے بغیر یہ کپڑے گھر کیوں لائی ہے، میں ہرگز قیمت ادا نہیں کروں گا۔ آخر تو مجھے سمجھتا کیا ہے؟ فوراً یہ کپڑے واپس کر دو، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

"میں کپڑے واپس نہیں کروں گی۔" بیوی غصّے سے بولی۔

"یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ آپ کا یہ رویّہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ آپ دنیا جہاں پر بخشش کا مینہ برسا رہے ہیں، لیکن میں اور میرے بچّے محروم ہیں۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"خاموش رہو۔" شیخ صاحب چنگھاڑ کر بولے۔

"میں اب خاموش نہیں رہوں گی، جو میرے جی میں آئے گا کہوں گی۔ میں نے بہت دیر تک صبر کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گٹھڑی اٹھائی اور کمرے کی طرف چل دی۔ شیخ صاحب اس کے پیچھے لپکے اور گٹھڑی چھیننے کی کوشش کرنے لگے ـــــ کچھ دیر

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کھینچا تانی ہوتی رہی۔ آخر شیخ صاحب کو غصہ آگیا، وہ پوری قوت سے گٹھڑی پر ٹوٹ پڑے اور کپڑوں کو پھاڑنے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" بیوی نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"تو بھی انہیں استعمال نہیں کر سکے گی، میں انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" شیخ صاحب ہانپتے ہوئے بولے۔

بیوی بے چاری عورت ذات تھی، کہاں تک ان سے ہاتھا پائی کرتی۔ تنگ آکر فرش پر بیٹھ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ شور سن کر ہمسائے جمع ہو گئے اور بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ شیخ صاحب لوگوں کی طرف دیکھ کر بولے:

"میں اللہ کے مال کو اس بے دردی سے اپنے خاندان پر کیوں کر صرف کر سکتا ہوں، ہمیں دنیا کی نعمتیں نہیں چاہییں، ہمیں آخرت میں اجر کی خواہش ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جب ذرا سکون ہوا، تو شیخ صاحب جائے نماز کی طرف بڑھے، لیکن پھر کچھ سوچ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے "تاکہ ذرا تازہ ہوا میں سانس لے سکیں۔" شیخ صاحب دنیا و مافیہا سے بے خبر چلے جا رہے تھے۔ ان کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ بار بار وہ اپنے آپ سے دریافت کرتے "مجھے کیا کرنا چاہیے، کیا مجھے بیوی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے چاہییں جو مجھے اپنے اصلی راستے سے ہٹانا چاہتی ہے، کبھی وہ سوچتے ــــ کہیں وہ خود پر اور اپنے اہل و عیال پر زیادتی تو نہیں کر رہے ہیں، کیا اللہ تعالیٰ نے مادی آسائشیں اس لیے ہم نہیں پہنچائیں کہ ان سے نادہ اٹھایا جائے ــــ کیا مال و دولت اس دنیا کی زینت نہیں۔ دن بھر وہ انہی خیالات میں غلطاں رہے یہاں تک کہ رات آگئی۔ کھانے کے بعد جب وہ بستر پر لیٹے، تو طرح طرح کے خواب انہیں پریشان کرنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی اور بچے وہی کپڑے پہنے کھڑے ہیں جنہیں دن میں وہ پھاڑ چکے تھے، وہ سب کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی کی مسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔

اگلے دن صبح سویرے شیخ صاحب بازار گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ گھر لوٹے، تو ان کی بغل میں ایک گٹھڑی تھی جسے وہ لوگوں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے گٹھڑی بیوی کے سامنے رکھی اور خود ہی گرہ کھول دی، وہ بیوی بچوں کے لیے نہایت اعلیٰ اور بیش قیمت کپڑے خرید کر لائے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک شاندار جبّہ پہنے مغرورانہ انداز میں گھر سے نکلے۔ "جبو کا سائل" مانگنے کے لیے آیا، تو انہوں نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ ضرورت مندوں کے ہجوم میں سے وہ گردن اکڑائے گزر گئے۔

دوپہر کے کھانے کے لیے جب وہ بیوی بچوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے، تو ان کے سامنے نہایت عمدہ کھانے چنے تھے۔ سب نے نئے نئے کپڑے پہن رکھے تھے، ان کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔

اس دن سے شیخ ابوالبرکات اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ضرورت مندوں کو اب انہوں نے گدا گر کا خطاب دیا تھا اور ان کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے تھے جب بھی وہ ان سائلوں اور بھکاریوں کی بات کرتے، تو انہیں نکمّے اور کام چور کے الفاظ سے یاد کرتے۔ بقول ان کے ان لوگوں نے رزقِ حلال کے لیے جدّوجہد ترک کر کے ذلّت اور پسپائی کی زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیا تھا جب کبھی کوئی بے تکلف دوست شیخ صاحب سے "اللہ کے مال" کے متعلق پوچھتا جو انہیں حاجت مندوں پر خرچ کرنے کے لیے ملا تھا، تو وہ کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب جاتے، پھر سر اٹھا کر اپنے مخصوص انداز میں کہتے:

"دراصل میں ایک ایسا عظیم منصوبہ بنا رہا ہوں جو تمام معاشرے کی اصلاح کرے گا، اس کے لیے وقت اور غور و فکر کی ضرورت ہے، دیر آید درست آید، جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، عجلت شیطانوں کا کام ہے، بس دیکھتے رہیے میں کیا کرتا ہوں۔"

■■

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

زبیدہ خاتون

چھوٹی سی بات

منیر پر چند بھٹی پرانی نہایت بوسیدہ قسم کی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ رضیہ کی نظر بار بار ان کی طرف اُٹھ جاتی اور مارے غصّے کے اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی "جانے یہ لوگ کیسے ہوتے ہیں نئی کتابیں زبردستی اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور یہ حال بنا کر لوٹاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے ان سب کتابوں کو جمع کر کے آگ لگا دوں"

"ارے بھئی، یہ کس کی شامت آ رہی ہے"؟ کوثر نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی نئی کتاب تھی۔

رضیہ نے تلخی سے جواب دیا۔ "سوچ رہی ہوں لوگ کتابیں مانگ تانگ کر پڑھنے کے لیے لے جاتے ہیں اوّل تو واپس کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اگر اتفاق سے واپس کرتے ہیں تو نئی کتاب جالینوس کے زمانے کا کوئی نایاب نسخہ معلوم ہوتی ہے"۔

کوثر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ "خدا تمہارا بھلا کرے تم نے میرے دل کی بات کہہ دی"۔ (پھر کتاب کی طرف اشارہ کر کے) یہ میں نے آج دوسری مرتبہ خریدی ہے، پہلی تو خدا بخشے دوسروں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ جانے کہاں کہاں سے اپنے مذاق کی کتابیں تلاش کر کے لاتی ہوں، مگر خدا خوش رکھے جانے والوں کو، دھونس جما کر لے جاتے ہیں۔ پڑھنے کے بعد کتاب کو فالتو قسم کا کباڑ سمجھنے لگتے ہیں، اور کوئی ایسے ویسے لوگ نہیں، بلکہ پڑھے لکھے، عالم فاضل، ایم اے، پی ایچ ڈی قسم کے لوگ کتابوں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرتے ہیں کہ ان پر اور اپنے آپ پر رونے کو جی چاہتا ہے"۔

"تم ٹھیک کہتی ہو" رضیہ نے تیزی سے کہا"

میرے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے، ملنے جلنے والے اچھی سے اچھی کتاب چھانٹ کر اس وعدے پر لے جاتے ہیں کہ پڑھ کر جلدی واپس کر دیں گے۔ اگر خوش قسمتی سے سال چھ ماہ بعد واپس بھی آتی ہے، تو کسی کا انجام غائب کبھی کا آغاز ندارد، اور ایسی میلی چکٹ کہ دیکھے سے کراہت آئے۔ لطف یہ کہ چند ایک غائب بھی ہو جاتی ہیں گن کر لے جاتے ہیں، گن کر واپس کرتے ہیں۔ اگر پوچھو تو طعنے ملتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میری آٹھ دس کتابیں طاہرہ بیگم سمیٹ کر لے گئیں۔ سُنا ہے پرسوں حیدرآباد سدھاریں، مگر کتابیں واپس کرنی ضروری نہ سمجھیں۔

آج کل بڑے بڑے ادیب اور عالم فاضل پڑھے لکھے لوگ محض وقت یا سفر کاٹنے کے لیے تیری میری کتابیں اُٹھا کر لے جاتے ہیں، خرید کر پڑھنے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ اپنا وقت گزر گیا دل بہل گیا تو کتاب اُٹھا کر یوں پھینکی جیسے کوڑا۔ اس وقت خیال نہیں آتا کہ یہ کتابیں کسی دوسرے سے مانگ کر لائے ہیں، کسی نے اس پر روپیہ خرچ کیا ہے۔

ایک مہینہ گزرا نعیم صاحب میری کچھ کتابیں زبردستی اُٹھا کر لے گئے تھے۔ میں اکثر اُن کی واپسی کا تقاضا کرتی تھی، مگر اُن کے کان پر جُوں تک نہ رینگتی تھی۔ لوگ صرف نیند لانے کا نسخہ یا وقت کاٹنے کا مشغلہ سمجھ کر کتاب پڑھتے ہیں۔ ان کے ہاں گئی کتابوں کا مطالبہ کیا تو دونوں میاں بیوی فرمانے لگے:

"اچھا تو یوں کہو کہ تم کتابوں کے لیے آئی تھیں، مگر تم نے کیوں تکلیف کی، ہم خود ہی بھجوا دیتے"۔

میں نے کہا: "چلیے یوں ہی سہی، مگر کتابیں تو دلوا دیجیے"۔ اب تو سارے گھر میں ڈھنڈیا پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد منعم اُکتا کر بولیں:

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"اب چھوڑ دو بھی۔ ڈھونڈ کر بھیج دوں گی۔"

مگر میں بھی اَڑی رہی کہ کتابیں لے کر ہی جاؤں گی۔ اس کا اُنہوں نے یہ جواب دیا:

"اے تمہاری دو کتابیں تو کئی دن ہوئے سلمیٰ اُٹھا کر لے گئیں۔"

"پھر وہ کتابیں گئیں" نعیم صاحب قہقہہ لگا کر بولے "سلمیٰ اب یہاں کہاں، الطاف کا تبادلہ کراچی ہو گیا تھا وہ لوگ تو کل چلے گئے۔"

یہ سُن کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ مسز نعیم، میاں سے مخاطب ہوئیں:

"اے ہے وہ لوگ بغیر ملے چلے گئے، نہ ہمارے ساتھ چائے پی، نہ کھانا کھایا۔"

نعیم صاحب نے آنکھیں نکالیں۔ "کمال تو تم خود کرتی ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ الطاف صاحب کا تبادلہ کراچی ہو گیا ہے اُن کے کھانے پینے کا ایک ایک وقت پہلے ہی لوگوں کے ہاں طے ہو چکا تھا۔ تم کو چاہیے تھا کہ ایک ماہ پہلے اُن کی دعوت کر دیتیں۔"

ان دونوں میاں بیوی کو الطاف صاحب کے چلے جانے کا افسوس تھا اور میں اپنی کتابوں کا دل ہی دل میں ماتم کر رہی تھی، سوچ رہی تھی کہ میں پھر کسے پھر خرچ کرنے پڑیں گے۔ آخر دوبارہ ہمت کر کے بولی:

"بھائی میری باقی کتابیں تو دے دیجیے۔ مجھے جانے کو دیر ہو رہی ہے۔"

یہ سُن کر مسز نعیم چونک پڑیں اور حیرت سے مجھے یُوں گھورنے لگیں، جیسے میں نے کوئی ناجائز بات کہہ دی ہو، پھر کچھ سوچ کر اپنی بچی سے بولیں:

"چلو نعیمہ ذرا ان کی کتابیں تلاش کر کے لا دو۔"

نعیمہ بسکٹ کھاتے ہوئے ٹھنک کر بولی:

"میں کہاں سے لا دوں۔ ایک کتاب تو کل بھائی جان کے دوست پڑھ رہے تھے، شاید وہ اپنے گھر لے گئے ہوں گے۔"

مسز نعیم نے آنکھیں نکالیں۔ "جاتی کیوں نہیں، اُٹھ کر تلاش کر کے لاؤ کتابیں۔"

میں نے کہا "بھابی آپ مجھے بتائیے میں خود جا کر لے آؤں گی" اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں مسز نعیم سے خیرات مانگنے کے لیے گڑگڑا رہی ہوں۔

نعیم صاحب نے ہنس کر کہا:

"ارے بیٹھو بھی کیا بے کار باتیں کر کے وقت ضائع کر رہی ہو"

واضح رہے کہ نعیم صاحب ایم اے ہیں اور مسز نعیم بی اے پاس ہیں مسز نعیم شاید کچھ خیرات میں آئی تھیں، یعنی تھوڑا سا بُرا مان گئی تھیں، تیزی سے اٹھتے ہوئے بولیں:

"یہ اس وقت بھلا کہاں بیٹھیں گی، وہ آئی تھیں کتابیں لینے کو۔"

اپنی طرف سے انہوں نے مجھ پر چوٹ کی تھی۔

خیر میں اُن کی بات سُنی اَن سنی کر کے ساتھ ہو لی۔ ایک کتاب تو انہوں نے نعیم صاحب کے تکیے کے نیچے سے نکال کر بڑے فخر سے ہاتھ میں نچھاور کی پھر اپنا کمرہ ٹٹولنے لگیں۔ آخر میں پورا بستر کھنگال ڈالا پھر کچھ یاد کر کے باورچی خانے کی طرف لپکیں۔ میں بھی ان کے پیچھے چلی، جلد ہی میں نے اپنی ایک کتاب کا حشر دیکھ لیا۔ خدا کی قسم میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کتاب کی جلد کا گتّا ہاتھ میں لیے اُن کا نوکر انگیٹھی کے کوئلے دہکا رہا تھا۔ کتاب چند ٹکڑوں میں اِدھر اُدھر باورچی خانے میں بکھری پڑی تھی۔ میری تیوری چڑھ گئی۔ مجھے دیکھ کر مسز نعیم نوکر پر جھپٹیں۔

"ارے کم بخت! یہ کس چیز سے کوئلے سلگا رہا ہے، تجھے خبر نہیں کہ تو نے کتاب پھاڑ ڈالی ہے۔"

نوکر نہایت اطمینان سے بولا:

"مجھے کیا خبر بیگم صاحب، کتاب کے ورق نکال نکال کر سلیم میاں ہوائی جہاز بنا رہے تھے، بجو بی بی کشتیاں بنا رہی تھی، میں سمجھا کوئی ردّی کی کتاب ہو گی۔"

مسز نعیم نے گتّا نوکر کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس کے بکھرے ہوئے حصّوں کو جمع کرنے لگیں۔ میں نے جل کر کہا:

"اب چھوڑیے بھابی! اب یہ کس کام کی رہ گئی ہے۔"

وہ جلدی سے بولیں "نہیں کام کی کیوں نہیں رہی میں ابھی آٹے سے اس کو جوڑے دیتی ہوں تم اتنی دیر بیٹھو۔"

میں نے جواب دیا "جی نہیں اب چلتی ہوں"۔

یہ سن کر وہ مطمئن ہوگئیں اور خوش ہو کر بولیں:

"اچھا تم جاؤ، میں جوڑ کر بعد میں بھیج دوں گی"۔

میں مہربانی شکریہ کہتی ہوئی واپس آگئی۔ بھئی واقعی کیسا زمانہ ہے، اب اگرچہ زیادہ تر لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، ہر شخص کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا ہوتا ہی ہے، مگر جوں جوں تعلیم بڑھ رہی ہے انسان اسی قدر بے پروا اور مروت سے بے نیاز ہوتا جا رہا ہے۔ قدر بھی کی جاتی ہے تو صرف اپنی چیزوں کی، چاہے چندکوں ہی کی کیوں نہ ہوں، دوسروں کی بیسیوں روپے کی چیز کی کچھ پروا نہیں۔ اب نجمہ اور ان کے بچوں ہی کو لو۔ کیا مجال جو اپنی یا اپنے گھر کی کوئی چیز خراب کریں۔ دوسروں کے ہاں جا کر اس کے گھر کو کباڑ خانہ بنا دیتے ہیں"۔

رضیہ سانس لینے کو رُکی تو کوثر بول اٹھی:

"مجھے تو وہ زمانہ یاد آتا ہے جب ہماری نانی اماں زندہ تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کس شوق اور قدر سے وہ کتاب پڑھتی تھیں۔ کیا مجال جو اتنی سی بھی خراب ہو جائے۔ گرد پوش اتار کر احتیاط سے رکھ دیا جاتا تھا۔ ورق ایسی احتیاط سے اُلٹتی تھیں کہ اس پر دھبہ نہ پڑے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی جو ان کی کتابوں کو ہاتھ لگاتا۔ یہ ان لوگوں کی تربیت تھی۔ یوں کہنے کو وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ ایم اے بی اے کیا انہوں نے میٹرک کا امتحان بھی نہیں دیا تھا۔ مگر انہیں وقت کی قدر تھی، پیسے کی قدر تھی، دوسروں کے احساسات کی قدر تھی"۔

وہ دونوں اپنے اپنے دُکھڑے رو رہی تھیں کہ اچانک دروازہ کھلا اور ہنستی کھلکھلاتی ہشاش بشاش نجمہ نیاز کمرے میں داخل ہوئیں اور بڑے بے تکلفانہ انداز میں کوثر کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں:

"تم یہاں بیٹھی ہوئی رضیہ سے گپ لڑا رہی ہو اور صاحب بہادر گھر میں تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں"۔

نجمہ کو کمرے میں آتا دیکھ کر رضیہ اور کوثر بوکھلا گئیں اور جلد جلد اپنی کتابیں چھپانے کی کوشش کرنے لگیں۔ کوئی پلنگ کی چادر کے نیچے سرکائی، کسی کے اُوپر گھٹنا رکھ لیا، کوئی بغل میں دبائی۔ پھر بھی نجمہ کی تیز نظروں سے نئی کتابیں پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ وہ رضیہ کو گھورتے ہوئے بولیں:

"کیوں بھئی یہ ہم سے کتابیں کیوں چھپائی جا رہی ہیں مگر ہم نے دیکھ لیا ہے لاؤ اِدھر"۔

یہ کہہ کر وہ رضیہ پر جھپٹ پڑیں اور ساری کتابیں نکلوا لیں۔ رضیہ انکار نہ کر سکی۔ اس کے علاوہ الماری کھول کر دیکھنے لگیں۔ پھر کوثر کی بغل سے اس کی خریدی ہوئی کتاب چھین کر بولیں۔

"یہ کتاب سیدھی طرح میرے حوالے کر دو اور جاؤ گھر تمہارے میاں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں یہ کتاب پڑھ کر جلدی واپس کر دوں گی، تم بسورنے کیوں لگیں کیا میں تمہاری کتاب کھا جاؤں گی"۔

کوثر نے کتاب پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے جواب دیا:

"بھئی نجمہ یہ تو میں ابھی بازار سے لے کر چلی آ رہی ہوں کھول کر دیکھی تک نہیں"۔

نجمہ قہقہہ مار کر بولیں "تمہاری سمجھ میں کھول کر دیکھ لوں گی تو کون سا فرق پڑ جائے گا، اور رضیہ وہ کون سی کتاب تمہارے گھٹنے کے نیچے دبی ہوئی ہے دکھاؤ تو ذرا"۔

رضیہ نے جھلا کر کہا "اتنی کتابیں جو سمیٹ کر لے جا رہی ہو، پہلے انہیں تو پڑھ لو بعد میں دوسری کی فکر کرنا اور یہ تو میری ہے بھی نہیں رشید صاحب کسی سے لے کر آئے ہیں"۔

"کوئی بات نہیں میں کل ہی لوٹا دوں گی"۔ نجمہ نے کتاب چھینتے ہوئے کہا۔

رضیہ اور کوثر نے احتجاج کیا تو وہ بولیں:

"آج میں گاڑی پر آئی ہوں سب کتابیں لے جانے میں آسانی ہے، روز روز کون آئے گا"۔

رضیہ بولی "اور میں اتنے دن کیا کروں گی؟"

اوّل تو تمہارے پاس کتابوں کی کیا کمی ہے خدا تمہارے ابّا جان کو سلامت رکھے، اس کے علاوہ تم چند روز اپنے میاں کی خدمت کرنا"۔

یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی سب کتابیں سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

■■

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ وقت کب آئے گا

علی چغتائی

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مسلمان مجاہدین نے سرینگر کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور کشمیر ہندوستان کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔ غلامی کی زنجیریں بس کٹنے ہی والی تھیں۔ بعض مقامات پر تو اِکّا دُکّا مجاہد سری نگر کے مضافات میں پہنچ گئے تھے۔ محلّہ چھتہ بل کے گلی کوچوں میں جنگ ہو رہی تھی۔ فتح قریب تھی۔ مجاہدین شاہینوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملہ کر رہے تھے۔ مَیں سابق فوجیوں کے ایک دستے میں شامل تھا۔ ہم لوگ سری نگر مین روڈ پر مورچے سنبھالے لڑ رہے تھے۔ اچانک فضا میں ایک منحوس آواز بلند ہوئی:

"بھاگو، بھاگو، دشمن ہمیں چاروں طرف سے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔"

پلٹ کر دیکھا، ہمارے بہت سے ساتھی مورچے چھوڑ کر اُلٹے پاؤں دوڑ رہے تھے جس کا جدھر مُنہ اُٹھا، اُدھر بھاگ نکلا۔ کوئی مرکز نہیں، کوئی کمانڈ نہیں۔ افراتفری، انتشار اور بدنظمی کا عالم تھا۔ ان تاریخی واقعات کی یاد بہت تلخ ہے لیکن اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کرنا بھی جرأت نہیں، ہمارے گروپ کے چند جوانوں نے جن میں مَیں بھی شامل تھا، چلّا چلّا کر اپنے ساتھیوں کو بُلانے کی کوشش کی لیکن کسی نے ہماری پکار پر کان نہ دھرا۔ دشمن کی چال کامیاب ہوگئی تھی۔ کشمیر کی حسین سرزمین ہمارے قدموں کے نیچے سے کھسک رہی تھی، بھاگ رہی تھی اور چھوٹ رہی تھی۔ سری نگر بہت پیچھے رہ گیا تھا، مجاہدین تتر بتر ہو چکے تھے۔ میرے ساتھی بھاگ رہے تھے ——— سڑک کے کنارے کھڑے سفیدے کے درخت بھاگ رہے تھے۔ دریائے جہلم بھاگ رہا تھا اور مَیں بھاگ رہا تھا۔

بھارتی فوج سنبھل گئی تھی۔ کمک ملنے سے اس کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ دشمن بغیر کسی رکاوٹ کے ۵۶ میل ایڈوانس کر چکا تھا۔ ٹپن گیا، سوپور ہاتھ سے نکلا۔ یہی عالم رہا، تو وہ بارہ مولا،

اُڑی اور چناری بھی لے جائیں گے۔ یہ سوچ کر میرے سارے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ نہیں، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہمیں دشمن کو روکنا ہوگا، خواہ اس کوشش میں ہمیں بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

محاذ خاموش تھا۔ جہلم ویلی روڈ سے کشمیری مہاجرین کے قافلے گزر رہے تھے۔ اُداس ویران چہرے، جھکی ہوئی آنکھیں، سروں پر بچے کھچے سامان کی پوٹلیاں، کندھوں پر بچے، پیدل، تھکے ہارے، ڈگمگاتے ڈولتے مرد عورتیں اور بچے ارضِ پاک کی طرف رواں تھے — ایک موڑ سے گزرتے ہوئے ان پر گولہ باری ہونے لگی۔ دشمن نے چوٹی پر توپیں نصب کر رکھی تھیں۔ انسانی گوشت فضا میں رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگا۔ شور سے وادی گونج اُٹھی، لیکن قافلے والے بھی کتنے پُرعزم تھے۔ سڑکوں پر لاشیں بکھیرتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

چار دن ہم چلتے رہے، پانچویں دن میں نے اپنا گاؤں دیکھا۔ قافلے سے بچھڑ کر میں گاؤں کی طرف چل دیا۔ سارے مکان خالی پڑے تھے۔ جہاں کبھی چہل پہل ہوا کرتی تھی وہاں اب قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ بیر اُمڈ بھر آیا — جی چاہتا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر روؤں، لیکن آنسو تھے کہ آنکھوں میں اُترتے ہی نہ تھے۔ اپنے مکان کا دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوا ہی تھا کہ بھینسیں ڈکراتی ہوئی میری طرف بڑھیں، وہ مجھ سے اپنی تھنتھلیاں رگڑ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں گھر والوں کے جانے کا بے حد دکھ ہے۔ میں پیار سے اُن کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ان بے عقل، گونگے اور بہرے چوپایوں میں اپنے ساتھیوں کے لیے کس قدر محبت تھی — اور ایک انسان تھا کہ مذہبی جنون کے جوش میں اپنے ہی بھائی بندوں کا گلا کاٹ رہا تھا — ہندو سامراج تو حیوانوں سے بھی زیادہ بے حس تھا۔ اس کا ضمیر مر چکا تھا۔ اُس کی انسانیت معدوم ہو چکی تھی۔ وہ مظلوم کشمیری مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کی فکر میں تھا۔ رات بھر میں اپنے گھر کے خالی صحن میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے میرے گھر والے کہاں تھے، زندہ تھے یا دوسری دُنیا سدھار گئے تھے۔ یہ سوچ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ تھکن کے مارے جسم ٹوٹ رہا تھا، لیکن دل کی بے چینی سونے نہ دیتی تھی۔ آخر صبح کے وقت مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے گھر کی تلاشی لی۔ ایک جگہ گھُنی ہوئی مکئی مل گئی۔ میں نے دونوں سفری تھیلوں میں مکئی بھر لی اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دن کے وقت گاؤں کا منظر اور بھی خوفناک تھا۔ سنسان گلیاں، اُجڑے مکان، ویران چبوترے، کہیں کہیں کوئی آوارہ کتا حیران و ششدر دکھائی دیتا۔ گاؤں سے باہر ایک ٹیکری تھی۔ اس پر چڑھ کر دیکھا، تو سامنے اُڑی کا وسیع و عریض میدان دکھائی دیا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، آرمڈ کاریں، بکتر بند گاڑیاں اور توپیں دکھائی دے رہی تھیں۔ دشمن بھاری تعداد کے ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا۔ سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے میں پہاڑی پگڈنڈیوں پر ہو لیا۔ تھوڑی دُور گیا تھا کہ اچانک کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے غور سے چاروں طرف دیکھا، راستے سے ذرا ہٹ کر پانی کی ایک نالی میں ایک نوجوان زخمی حالت میں پڑا تھا۔ وہ قبائلی مجاہد تھا۔ ٹانگ میں گولی لگنے کی وجہ سے خون خاصی مقدار میں بہہ چکا تھا، چہرے پر موت کی زردی تھی۔ میں نے چھاگل میں سے اُسے پانی پلایا اور کچھ پانی منہ پر چھڑکا۔ جلد ہی وہ ہوش میں آ گیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام چنار گل ہے اور وہ بھاگتے ہوئے دشمن کی گولی کا شکار ہوا ہے۔ میں نے اسے تھوڑی سی مکئی کھانے کو دی۔ چلنے لگا، تو وہ میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

میں نے اُسے کندھے پر اُٹھا لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اُسے اُتار کر سستا لیتا۔ گرتے پڑتے ہم ٹیکری کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ دشمن کی فوجیں اب ہماری

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

دائیں طرف تھیں۔ ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک جُھنڈ سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ پیاس کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ چھاگل کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ سوچا تھوڑا سا پانی مانگ لوں۔ جُھنڈ میں پہنچا، تو یہ دیکھ کر خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ چشمے کے کنارے دو مسلمان مجاہد لیٹے تھے۔ ایک دُبلے پتلے جسم کا تھا۔ دوسرا گٹھیل جوان، بھرا بھرا چہرہ، گھنی سیاہ مونچھیں، سر پر لمبے بال، نکلتا ہوا سڈول جسم، غرض مردانہ حُسن کا عجیب شاہکار تھا۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے پانی پیا۔ چنار گُل کے زخم دھو کر اُوپر سے سادہ پٹی باندھی۔ نوجوان کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کا نام ملک دلدار ہے۔ وہ ضلع کیمل پور کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ انگریزوں کی فوج میں بھی لڑ چکا تھا۔ شوقِ جہاد اسے کشمیر کھینچ لایا۔ سری نگر کے ہوائی اڈے پر حملے کے دوران میں اُس کا ساتھی لطیف زخمی ہو گیا۔ گولی بازو میں لگی تھی اور کندھے کا گوشت چھیدتی ہوئی پشت کی طرف نکل گئی تھی۔ وہ اسے سنبھال ہی رہا تھا کہ دشمن کے تازہ دم دستوں نے حملہ کر دیا۔ مجاہدین کی مختصر سی جماعت نے آخری وقت تک مقابلہ کیا، لیکن دشمن کی کثیر تعداد اور بھاری اسلحے کے سامنے اُن کی پیش نہ چلی۔ دلدار بھی اپنے ساتھی کو اُٹھا کر پیچھے لے آیا۔

"ملک دلدار، دو میل پیچھے دشمن ڈیرا ڈالے پڑا ہے، عنقریب پیش قدمی شروع ہو جائے گی۔ اگر ہم اس سے پہلے پہلے کچھ کر سکیں تو....."

"ٹھیک ہے ــــ یہ وقت ضائع کرنے کا نہیں۔ ہم دو تندرست و توانا جوان ہیں۔ لطیف لیٹ کر گولی چلا سکتا ہے، چنار گُل ہمیں بندوقیں بھر بھر کر دے گا۔ ہم دشمن کو آخری دم تک روکنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، ہمارے کچھ ساتھی اِدھر اُدھر چھپے ہوں ــــ اور مقابلہ دیکھ کر ہم سے آملیں یا دشمن پر حملہ کر دیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ مہاجرین کے قافلے صحیح سلامت آزاد کشمیر پہنچ جائیں گے، ورنہ یہ ظالم نہتّوں پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

ہم کچھ دیر منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے ندّی پر لکڑی کا بنا ہُوا وہ پُل توڑا جائے جس کے راستے دشمن کے پیادہ دستے ٹیلری تک پہنچ سکتے ہیں۔ ملک دلدار مُصر تھا کہ وہ تنِ تنہا اس مہم پر جائے گا، لیکن مَیں نے اسے روک دیا:

"ملک، تم اس جگہ سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔ اس کے برعکس مَیں اس علاقے کا رہنے والا ہوں۔ تم یہاں ٹھہرو اور دشمن پر نگاہ رکھو۔ پُل توڑنے سے پہلے اگر دشمن کا کوئی دستہ میری طرف آئے، تو اسے روکنے کی کوشش کرنا۔"

دشوار گزار پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا مَیں پُل کے عین نیچے پہنچ گیا۔ نالہ خشک پڑا تھا اور سورج کی تیز روشنی میں دیودار کی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا پُل بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ رائفل کے کُندے سے لکڑی کو بجا کر دیکھا، تو محسوس ہوا کہ تیز کلہاڑے کے بغیر ایک شہتیر بھی کاٹا ممکن نہیں۔ مَیں نے سوچا: کاش! میرے پاس بارود کی صرف ایک پیٹی ہوتی، لیکن اس ویرانے میں بارود کہاں سے ملتا۔ گھوم پھر کر اچھی طرح سے پُل کا جائزہ لیا، لیکن کہیں کوئی کمزور حصّہ دکھائی نہ دیا۔ میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اب کیا ہوگا۔ بھارتی فوج صبح تک یہاں پہنچ جائے گی۔ اچانک میرے ذہن میں پُل جلانے کا خیال آیا، لیکن اس کے لیے ایندھن کی ضرورت تھی۔ مَیں نالے سے باہر آ گیا اور کنارے کنارے چلنے لگا۔ تھوڑی دُور چل کر چھوٹے چھوٹے کھیت دکھائی دیے جن کی دوسری طرف ایک مختصر سا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے قدرت بھی میری طرفدار تھی۔ گاؤں سے باہر خشک شالی گھاس سے بھرا ہوا ایک گڈا دکھائی دیا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن کہیں بیل وغیرہ نظر نہ آئے۔ مَیں نے خدا کا نام لے کر گڈا کھینچنا شروع کر دیا۔ جُوں توں

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کر کے مَیں گڈّے کو نالے تک لے جانے میں کامیاب ہوگیا لیکن پُل ابھی کافی دُور تھا اور راستہ خراب ہونے کی وجہ سے گڈّے کو آگے لے جانا ممکن نہ تھا۔ ناچار گھاس کا ایک گٹھا اٹھایا اور نالے میں کُود گیا۔ یہ گٹھا پُل کے نیچے رکھ کر واپس آیا اور دوسرا گٹھا اُٹھا کر لے گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کی جاں گسل محنت کے بعد مَیں ساری گھاس پُل کے نیچے پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ جیب سے ماچس نکال کر آگ لگانے ہی والا تھا کہ اچانک اُوپر سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ جھانک کر دیکھا، تو دس بارہ بھارتی فوجی پُل پر کھڑے سامنے سے گزرنے والی بڑی سڑک کا جائزہ لے رہے تھے۔ پہلے تو جی میں آئی کہ ان میں سے ایک آدھ کا خاتمہ کر دوں ، پھر خیال آیا کہ کہیں میرا منصوبہ ہی ادھورا نہ رہ جائے۔ آخر وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے۔ مجھے اپنی جان کا خوف نہیں تھا، صرف منصوبے کی ناکامی کا ڈر تھا۔ مَیں گھاس میں دبک گیا۔ شاید وہ لوگ پہلی مرتبہ کشمیر آئے تھے اور اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر چلنے کے عادی نہ تھے۔ کچھ دیر وہ پُل پر سستاتے رہے، پھر اُٹھ کر ٹیکری کی جانب چل دیے۔ جب انہیں گئے ہوئے آدھ گھنٹہ گزر گیا، تو مَیں نے اللہ کا نام لے کر دیا سلائی جلائی اور گھاس میں رکھ دی۔ آہستہ آہستہ گھاس آگ پکڑنے لگی۔ مَیں نالے کے اندر چلتا ہوا اس جھنڈ کی طرف بھاگا جہاں مَیں لطیف، چنار گل اور دلدار ملک کو چھوڑ آیا تھا۔ جُھنڈ کے قریب جا کر دیکھا۔ پُل دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور لکڑی کے تختوں کے تڑخنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ چشمے کے کنارے پہنچا، تو یہ دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہاں میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ مَیں نے اچھی طرح دیکھا بھالا، لیکن مایوسی ہوئی۔ چشمے سے ڈٹ کر پانی پیا، رائفل کندھے سے لٹکائی اور ساتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ ملک دلدار کی آواز سنائی دی۔

"تم سب کہاں ہو؟" مَیں نے چلّا کر پُوچھا۔

"ہم یہاں ہیں۔" جواب میں چنار گل نے کہا۔

سامنے چند گز کے فاصلے پر چٹانوں میں ایک چھوٹا سا غار تھا۔ وہ لوگ شاید اسی میں چھپے ہوئے تھے۔ قریب پہنچ کر مَیں نے غار کے مُنہ میں سے اندر جھانکا، تو تینوں فرش پر لیٹے تھے۔ غار کا مُنہ بہت تنگ تھا اور انسان زمین پر بیٹھ کر اندر جا سکتا تھا، لیکن اندر خاصی جگہ تھی۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن میں سے ہر طرف دیکھا جا سکتا تھا۔

"کتنی محفوظ جگہ ہے ـــــ یہاں رہ کر تو انسان ایک پورے لشکر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کہو، تمہارے منصوبے کا کیا بنا؟" دلدار مسکراتے ہوئے بولا۔

"مَیں نے پُل کو آگ لگا دی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، کیا پُل کو جلتا ہوا دیکھو گے؟"

"وہ کیسے؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔

دلدار مجھے بازو سے پکڑ کر ایک سوراخ کے قریب لے گیا اور بولا، "اس میں سے جھانک کر دیکھو۔"

یہ سوراخ کوئی چھ انچ چوڑا اور ڈیڑھ فٹ لمبا ہوگا۔ سامنے جلتا ہوا پُل دکھائی دے رہا تھا۔ دھوئیں کی ایک لکیر آسمان کی طرف اُٹھ رہی تھی۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"ہمارے پاس دو رائفلیں اور ایک برین گن ہے۔ اگر ہمیں سے چند پیٹیاں اسلحے کی مل جائیں، تو ہم خاصی دیر تک دشمن کو اس پُل پر روک سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹوٹے ہوئے پُل کو دیکھ کر بھارتی فوج کو قدرے انتظار کرنا پڑے گا۔ پیدل فوج تو نالے میں سے گزر جائے گی، لیکن گاڑیاں وغیرہ نالے کو عبور نہیں کر سکیں گی۔ وہ لوگ ضرور کوئی متبادل راستہ تلاش کریں گے۔ اس دوران میں وہ ہماری گولیوں کی زد میں ہوں گے، وہ اس گھاٹی تک نہیں پہنچ سکتے جو شخص بھی اُوپر آنے کی

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

طرف پھیل رہی تھی۔ لطیف کی زبانی معلوم ہوا کہ ابھی تک دشمن پُل پر نہیں پہنچا۔ بارود کی پیٹیاں غار کے ایک کونے میں چُن کر ہم نے اُن نوجوانوں کو جانے کی اجازت دے دی جو یہاں تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ان بے چاروں کو اپنے اپنے بیوی بچوں کی فکر لگی تھی جنہیں وہ صبح گاؤں سے رخصت کر چکے تھے۔ ہوٹل سے ہمیں کچھ سُوکھی ہوئی روٹیاں بھی مل گئی تھیں۔ چشمے کا پانی لے کر انہیں بھگویا اور کھا کر خُدا کا شکر ادا کیا۔

رات بھر مَیں اور دلدار باری باری جاگتے رہے، لیکن دشمن کی نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہ دیے۔ صبح سویرے ہم دونوں سو گئے۔ اچانک توپوں کی گھن گرج سے ہماری آنکھ کُھل گئی۔ دشمن پیش قدمی کر رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے پُل کو دیکھ کر اُسے ہماری موجودگی کا علم ہو گیا تھا۔ توپیں بے تحاشا گولے اُگل رہی تھیں لیکن ان کا رُخ پُل کی طرف تھا۔ دشمن کا خیال تھا کہ ہم لوگ پُل کی دوسری طرف چھپے ہوئے ہیں۔ ہم نے جلد جلد پوزیشن لی اور حملہ کرنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے۔

اِس سے قبل کہ مَیں آپ کو دن بھر کے حالات سے آگاہ کروں، اُس غار کا محلِ وقوع بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ راولپنڈی سری نگر روڈ پر لال پل ایک مشہور جگہ ہے۔ یہ پُل اُڑی سے نو میل اس طرف واقع ہے۔ لال پُل سے آگے سنگلاخ عمودی چٹانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جو سڑک سے اُوپر کم و بیش چار میل تک چلا گیا ہے۔ دریائے جہلم یہاں بہت نیچے بہتا ہے۔ اِن سنگلاخ چٹانوں کو بڑی کاوش سے کاٹ کر سڑک بنائی گئی ہے۔ بعض مقامات پر سڑک کی دونوں طرف ایسی ہیبت ناک چٹانیں ہیں کہ راہ چلتے مسافر انہیں دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ پہاڑی سلسلے کے وسط میں ہزار گز لمبا ایک بیلہ ہے جس میں خار دار جھاڑیاں کثرت سے ہیں۔ بیلے کے درمیان میل کا پتھر ہے جس پر ۶۲ کا ہندسہ دُور سے نظر آتا ہے۔ اِس پتھر سے تین سو گز اُوپر چٹان کے سرے پر وہ کھوہ تھی جہاں ہم گھات

کوشش کرے گا، اُسے بھون کر رکھ دیں گے۔

"مجھے ایک جگہ کا علم ہے جہاں سے ہمیں اسلحہ اور بارود مل سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ راستے میں بھارتی فوجیں پیش قدمی کر رہی ہیں۔" مَیں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تم فکر مت کرو، مَیں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ اب لطیف کی حالت قدرے بہتر ہے، چنار گل کی حفاظت وہ خود کرے گا۔"

ایک رائفل مَیں نے سنبھالی، دوسری لطیف کے حوالے کی۔ برین گن دلدار کے پاس تھی۔ چنار گل اور لطیف کو خدا حافظ کہہ کر ہم غار سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ اڑھائی بجے ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے راستے میں دشمن کے کسی دستے سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ لال پُل کے پاس سیاحوں کے لیے ایک ہوٹل تھا۔ اسی ہوٹل کو مجاہدین نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ ہوٹل خالی پڑا تھا — باورچی خانے سے گزر کر ہم سٹور میں گئے۔ یہاں ہمیں خاصی مقدار میں اسلحہ اور بارود مل گیا، لیکن وزنی پیٹیوں کو اُٹھا کر غار تک پہنچنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ قریب ہی ایک گاؤں داد کوٹ میں گئے۔ سب لوگ فرار ہو چکے تھے۔ چند نوجوان باقی تھے اور سامان باندھ رہے تھے۔ ہم نے انہیں غیرت دلائی۔ ان میں سے پانچ جوان اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ بارود کی پیٹیاں غار تک پہنچانے میں ہماری مدد کریں گے۔ بھاگم بھاگ ہوٹل پہنچے، بارود کی پیٹیاں اٹھائیں اور گرتے پڑتے روانہ ہوئے۔

آج ان واقعات کو ایک مدّت گزر چکی ہے لیکن ایک ایک واقعہ دل پر اس طرح نقش ہے جیسے ابھی ابھی پیش آیا ہو۔ دشمن کے خوف سے سیدھے اور صاف راستے سے جانے کی ہمّت نہ تھی۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں اور کھڈوں میں سے خالی ہاتھ گزرنا بھی مشکل تھا، لیکن اس وقت تو ہماری حالت اور بھی دگرگوں تھی۔ بوجھ کی وجہ سے ہم بار بار لڑکھتے، لیکن پھر سنبھل جاتے۔ جُوں تُوں کر کے غار تک پہنچے۔ سُورج ڈوب رہا تھا اور اُس کی سُرخی چاروں

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں بیٹھے تھے۔ کھوہ میں سے سڑک دُور دُور تک دکھائی دیتی تھی۔ گولہ باری سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن عنقریب پُل پر پہنچ جائے گا۔ نو بجے پہاڑی کے نکڑ سے دشمن کا پہلا موبائیل کالم نمودار ہوا۔ آرمڈ کاریں، کیریر، بکتر بند دستے، کنوائے، اندھا دھند آگ برساتی ہوئی تو پیں، جلے ہوئے پُل کے پاس پہنچ کر دستہ رُک گیا۔ نالے کے ساتھ دائیں جانب کچھ فاصلے پر وہ گاؤں دکھائی دے رہا تھا جہاں سے مَیں گھاس کا گٹھا کھینچ کر لایا تھا۔ توپوں کا رُخ اُس گاؤں کی طرف پھیر دیا گیا۔ ذرا سی دیر میں گاؤں سے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیے۔

عین اس وقت ہماری کھوہ سے کچھ فاصلے پر چند بھارتی سپاہی دکھائی دیے۔ غالباً وہ موقع محل کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے۔ مَیں نے اُن کی طرف بندوق سیدھی کی ہی تھی کہ دلدار نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"صبر سے کام لو۔ اگر تم نے اس وقت گولی چلا دی، تو ساری فوج ہماری موجودگی سے باخبر ہو جائے گی۔ دشمن کو پوری طرح ہماری زد میں آ نے دو، پھر گولی چلانا۔"

مَیں نے تعمیل کی۔ سپاہیوں کی آوازیں قریب آتی گئیں۔ اب وہ چشمے سے پانی پی رہے تھے۔

"اگر وہ یہاں آ گئے تو؟" مَیں نے دلدار سے پوچھا۔

"کسی حالت میں بھی گولی نہ چلانا۔ کوشش یہی کرو کہ وہ ہمیں دیکھنے نہ پائیں۔ ضرورت پڑے، تو دست بدست جنگ کو ترجیح دینا۔"

مَیں نے سر کے اشارے سے ہامی بھری اور سوراخ میں سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور ان کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ پانی پینے کے بعد وہ غار کی طرف بڑھنے لگے۔ مَیں نے سانس روک لی۔ اگلے ہی لمحے ان میں سے ایک کا قدم پھسلا اور وہ پتھریلی زمین پر گر پڑا۔

"کیا بیہودہ جگہ ہے، چلو واپس چلیں۔" وہ گھٹنے کو زور سے مَسلتے ہوئے بولا۔ وہ فوراً ہی پلٹ گئے۔ کچھ دیر تک ان کی گفتگو سنائی دیتی رہی، پھر خاموشی چھا گئی۔ ادھر پُل تک پہنچنے کے لیے پلاٹون کی نفری دو قطاروں میں آ رہی تھی۔ جوانوں کے قہقہے، وائرلیس اپریٹروں کا ہیلو ہیلو، جھانسی N.T.R کہنا، اور پختہ سڑک پر فوجی جوتوں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ توپ خانے کی خچریں مستی میں اکڑتی اور جھومتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ساٹھ میل کی پیش قدمی میں اس دستے پر ایک فائر بھی نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جوانوں کے چہروں سے غرور ٹپکتا تھا۔ ان کی گردنیں اکڑی ہوئی تھیں۔ فائر کھولنے سے پہلے ہم چاروں خدا کے حضور میں جُھک گئے۔

"سبحان ربی العظیم - خدایا! تو اعلیٰ اور ارفع ہے، جسے چاہے اندھیرے سے اُجالے اور اُجالے سے اندھیرے میں دھکیل دے، تیرے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ ہم تیرے چند ناچیز بندے، تیری راہ میں اور تیرے بندوں کی سلامتی کے لیے اپنی جانوں کا حقیر نذرانہ پیش کر رہے ہیں، یہ قربانی قبول فرما، بارِ الٰہا! ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی دے اور اس مٹھی بھر دشمن سے نپٹنے کی توفیق عطا فرما۔"

ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ چار گل کو بارود کی پیٹیوں پر متعین کیا، لطیف کو سہارا دے کر ایک سوراخ کے قریب لے گئے اور اس کے ہاتھ میں ایک رائفل دے دی۔ دوسری رائفل مَیں نے سنبھالی۔ دلدار ملک کے پاس برین گن تھی۔ سڑک کی طرف دیکھا، پورا کالم حرکت کر رہا تھا۔ کالم کے مرکز کا نشانہ لیا اور اللہ کا نام لے کر فائر کھول دیا۔ تڑ تڑ تڑ۔ رائفلوں سے شعلے نکلے۔ برین گن بھی مسلسل آگ اُگل رہی تھی۔ دشمن کی صفیں اُلٹنے لگیں۔ اچانک حملے سے پیادہ فوجی سنبھل نہ سکے۔ اکثر پہلے ہی حملے میں ڈھیر ہو گئے۔ بھارتی فوج مکئی کے دانوں کی طرح بھُونی جا رہی تھی، قطاریں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ پُورا کالم سڑک پر لیٹ گیا۔ میں اور لطیف تاک تاک

وقار عظیم
پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام

کر گولی چلا رہے تھے۔ دلدار نے برین گن کا رُخ بوجھ سے لدی ہوئی خچروں کی طرف پھیر دیا۔ اگلے ہی لمحے جانوروں کی چیخیں سنائی دیں۔ زخمی خچروں نے کالم میں بھگدڑ مچا دی، وہ ہیبت ناک آوازیں نکالتی ہوئی بے تحاشا اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ اس دوران میں دشمن کی توپوں نے ہمیں نشانہ بنا لیا تھا۔ غار بلندی پر تھا اور دشمن کی نظروں سے محفوظ؛ تاہم جگہ اور سمت کا تعین کر کے توپیں مسلسل آگ برسا رہی تھیں۔ ہمارے آس پاس کی چٹانیں لرز رہی تھیں۔ دھوئیں کے بادلوں سے فضا کثیف ہو گئی تھی۔ بارُود کی تیز بُو سے دم گھٹنے لگا تھا۔ جو گولے کھوہ کی ڈھلان پر آ کر پھٹتے تھے، ان میں سے اکثر دوبارہ سڑک پر گر جاتے۔ لطیف اور چنار گل زخمی ہونے کے باوجود بڑی پھرتی سے اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ لطیف گولی چلا رہا تھا اور چنار گل ہمیں رائفلیں بھر بھر کر دے رہا تھا۔ بھارتی دستے کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کے چاروں طرف خوفناک چٹانیں جبڑے کھولے کھڑی تھیں، اُوپر سے مسلسل فائر ہو رہے تھے، دائیں جانب نالا تھا جس کا پُل جل چکا تھا اور بائیں جانب اونچی اونچی عمودی چٹانیں جن پر چڑھنا ممکن نہ تھا۔ جلد ہی میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ انسانی خون سے سڑک سُرخ ہو گئی تھی۔ بچے کھچے بھارتی فوجیوں نے چٹانوں کی آڑ میں پناہ لی۔ ان کا ایک دستہ بیلے کے نشیبی حصّے میں اُتر کر پوزیشن لینے میں کامیاب ہو گیا اور ہماری کھوہ پر فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں ہمارے دائیں بائیں گرنے لگیں — یہ صورتِ حال بہت پریشان کُن تھی۔ اچانک ڈھکی سلطان کا گاؤں سے بھارتی فوج پر رُک رُک کر فائر ہونے لگے۔ شاید چند بھولے بھٹکے مجاہد وہاں پہنچ گئے تھے۔ گاؤں سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ "اللہ اکبر" نے ہمیں سنبھالا دیا، ہمارے حوصلے بڑھ گئے اور ہم تاک تاک کر بیلے میں چھپے ہوئے بھارتی فوجیوں کو نشانہ بنانے لگے۔ دفعتہً لطیف نے چلّا کر کہا:

"فائر روک دو۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"دائیں طرف دیکھو۔"

ہم نے پہاڑی ڈھلوان پر نظر ڈالی۔ کشمیری قُلیوں کا ایک گروہ بلند آواز میں کلمۂ طیّبہ کا وِرد کرتا ہوا ڈھلوان پر سے بھارتی زخمیوں کو اُٹھا رہا تھا۔

"دیکھنا، کہیں ان میں سے کسی کے گولی نہ لگ جائے۔" دلدار نے دوسرے کونے سے کہا۔

مظلوم کشمیری باشندوں کا ہمیں بھی خیال تھا، لیکن بھارتی سپاہیوں نے ایک ایسی چال چلی کہ ہم دوبارہ فائر کھولنے پر مجبور ہو گئے۔ چند نوجوان کشمیری قلیوں کی آڑ میں اوپر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عین اسی وقت دُور کہیں سے اللہ اکبر کے نعروں کی گونج سنائی دی۔

"شاید قبائلی مجاہدین آ پہنچے۔" لطیف خوش ہو کر بولا۔

"ہمیں ہر قیمت پر یہ مورچہ اپنے قبضے میں رکھنا چاہیے، مجاہدین بھارتی فوج کو آگے سے گھیر لیں گے اور ہم پیچھے سے۔ لطیف ذرا ہمّت سے کام لو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔" دلدار نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

ہم اور زیادہ تیزی سے فائر کرنے لگے۔ اچانک چنار گل بولا:

"بیلے میں حرکت تیز ہو گئی ہے، معلوم ہوتا ہے دشمن نالے میں سے گزر کر چٹان پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

ہم نے جھانک کر دیکھا۔ چنار گل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بھارتی سپاہی ہماری زد میں نہ تھے۔ شمال کی طرف کھوہ میں کوئی سوراخ نہ تھا۔

"چٹانوں پر چڑھتے ہوئے سپاہیوں کو روکنا از حد ضروری ہے۔ یہاں سے نشانہ نہیں لیا جا سکتا۔ میں کھوہ سے باہر نکل کر کوئی موزوں مورچہ تلاش کرتا ہوں، تم فائر کرتے رہو۔" دلدار نے برین گن سنبھالتے ہوئے کہا۔

"دلدار! رُک جاؤ، باہر گولیوں کی بارش ہو رہی ہے تھوڑی دیر انتظار کر لو۔" میں نے منت کی۔

"یہ وقت انتظار کرنے کا نہیں، تم فکر مت کرو، دشمن کا خاتمہ کیے بغیر میں مروں گا نہیں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور برین گن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر ذرا فاصلے پر برین گن چلنے کی آواز سنائی۔ جوش کے عالم میں میں نے رائفل اٹھائی اور باہر آگیا۔ اُف میرے خدا ــــ کتنا عجیب نظارہ تھا۔ ملک دلدار ایک چٹان کی چوٹی پر کھڑا تھا، اس کے سامنے کوئی اوٹ نہیں تھی۔ توپوں کے گولے اس کے چاروں طرف گر رہے تھے، لیکن وہ ان سے بے پروا ڈھلوان پر چڑھنے والے بھارتی سپاہیوں پر آگ برسا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی مدد سے بندر کی طرح اُوپر چڑھتے ہوئے بھارتی سپاہی گیند کی طرح نیچے لڑھک رہے تھے دفعتہً سامنے سے مسلمان مجاہدین دکھائی دیے، وہ لوگ ٹیکری کی آڑ لے کر بھارتی لشکر پر گولیاں برسا رہے تھے۔ میں خوشی سے چلّا تا ہوا دلدار کی طرف بڑھا:

"دلدار، مجاہدین آگئے، وہ دیکھو، سامنے ..."

لیکن میں اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ ایک گولا دلدار کے سر پر آکر پھٹا، دھوئیں کے بادل اُٹھے، یوں محسوس ہوا جیسے میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آگیا ہے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔ ایک گولا میرے بالکل قریب آکر گرا، میں جلدی سے زمین پر لیٹ گیا۔ گرم لوہے کے کچھ ٹکڑے میری ران میں گھس گئے۔ درد کی شدت سے میں بلبلا اُٹھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ یاد نہیں۔

ہوش میں آیا، تو کھوہ سے باہر چشمے کے کنارے پڑا تھا، چند قبائلی مجاہد مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔

"بھارتی فوج سات میل پیچھے ہٹ گئی ہے۔" ایک مجاہد مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر بولا۔

"خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" میں نے عجز و نیاز سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد جب مجھ میں چلنے پھرنے کی ہمت آگئی، تو میں ایک جوان کا سہارا لے کر اٹھا اور کھوہ میں گیا۔ لطیف کھوہ سے باہر بے حس و حرکت پڑا تھا، گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ معلوم ہوتا ہے، وہ بھی میرے پیچھے باہر آگیا تھا، اندر چنار گل بے ہوش پڑا تھا، کچھ فاصلے پر وہ جگہ دکھائی دے رہی تھی جہاں میں نے ملک دلدار کو آخری بار دیکھا تھا۔

"مجھے وہاں لے چلو۔"

دو آدمی مجھے سہارا دے کر چٹان کی طرف لے گئے۔ پتھریلی زمین پر لوہے کے ٹکڑوں کے ساتھ دلدار ملک کی جلی ہوئی لاش کے کچھ حصے پڑے تھے، گوشت بارود سے سیاہ ہو چکا تھا اور میں نے آنسو پیتے ہوئے جھاڑیوں میں اُلجھے ہوئے گوشت کو جمع کیا، میرے ساتھیوں نے تھوڑی سی زمین کھودی اور گوشت کے لوتھڑوں اور شکستہ ہڈیوں کے ڈھیر کو گڑھے میں دفن کر کے اوپر پتھر چُن دیے۔ جب ہم وہاں سے اُٹھے، تو میری آنکھیں بھر آئیں ــــ میرے ساتھی، میرے دوست، میرے دلدار ــــ تو نے جو قربانی دی ہے، وہ کبھی نہیں بھولے گی۔ میں عہد کرتا ہوں کہ جب کشمیر کی سرزمین آزاد ہو جائے گی، تو میں اس جگہ ایک یادگار تعمیر کروں گا ــــ جہاں میں تیرے جسم کو دفنا رہا ہوں۔

مجھے آج بھی اپنا وعدہ یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا، لیکن کون جانے وہ وقت کب آئے گا جب میں اپنا وعدہ پورا کر سکوں گا۔

■■

مردِ بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندۂ حُر کے لیے نشترِ تقدیر ہے نوش!
نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہُوا نالۂ مُرغانِ سحر سے مدہوش! اقبال

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

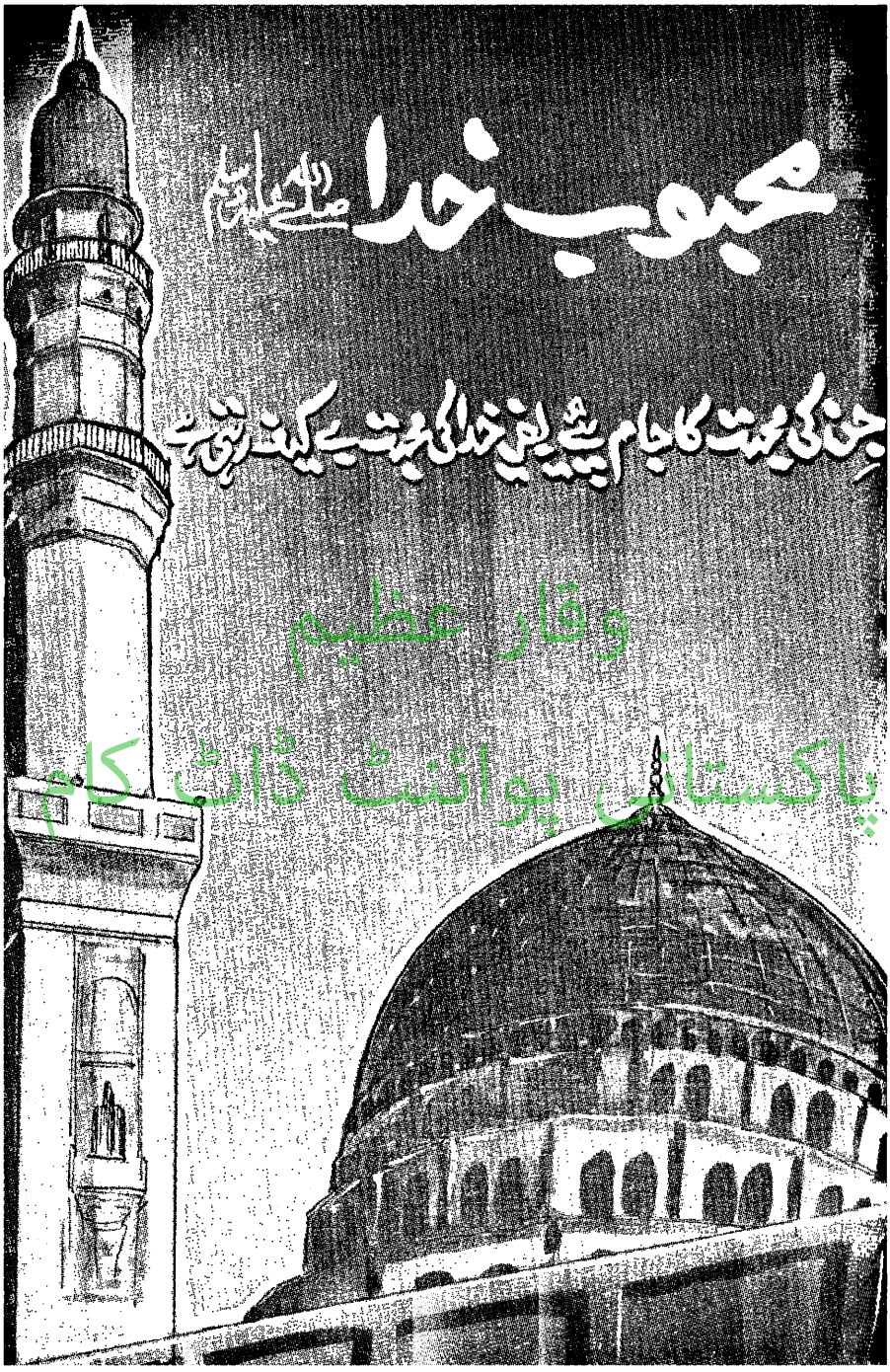
محبوب خدا ﷺ
جن کی محبت کا جام پیتے ہیں خدا کی محبت سے کیف رہتے ہیں
وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

حکمت کی باتیں

جو اپنے عہد کا پاس نہیں کرتا، وہ بے دین ہے۔

دُنیا کو ترک کر دیجیے، وہ خود آپ کی طرف کھچی چلی آئے گی۔

خوش نصیب ہے وہ جسے اپنے عیوب دوسروں کی غیب جوئی سے روک دیں۔

جو دوسروں پر ہنستا ہے، دُنیا اُس پر ہنسے گی۔

جو چھوٹے پر ترس نہ کھائے اور بڑے کا احترام نہ کرے، اُس کا ہمارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔

بداخلاقی عمل کو اسی طرح خراب کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو۔

بہترین شباب وہ ہے جس میں پیری کے آثار ہوں اور بدترین بڑھاپا وہ ہے جو جوانی سے مشابہ ہو۔

دُنیا اور آخرت کی تمام خوبیاں علم سے وابستہ ہیں اور دونوں جہان کی تمام برائیاں جہالت سے مربوط ہیں۔

پانچ چیزوں سے پانچ چیزیں پیدا ہوتی ہیں:

(۱) جو قوم عہد شکنی کرتی ہے، اللہ اس پر اس کے دشمن کو مسلط کر دیتا ہے۔

(۲) جو قوم [illegible] کے مال کو وہ قانون کے خلاف فیصلے [illegible]

(۳) جس [illegible] بدکاری پھیلتی ہے اس میں ناگہانی اموات عام ہو جاتی ہیں۔

(۴) جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے وہ قحط سے دوچار ہو جاتی ہے۔

(۵) جو قوم زکوٰۃ نہیں دیتی، وہ خشک سالی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

دُنیا کی محبت خطاؤں کا سرچشمہ ہے۔

ایک دوسرے کو ہدیے پیش کرتے رہو کہ اس سے محبت بڑھتی ہے اور دل کی کدورت مٹتی ہے۔

[illegible] دیکھ کر [illegible] سے [illegible] نظر ڈالو، اس [illegible] نعمتوں کی قدر کر سکو گے۔

[illegible] اظہار [illegible] دلوں [illegible]

[illegible] فعل پر [illegible] اس [illegible]

خدا جس قوم کی تباہی چاہتا ہے اس کی قیادت مُسرف اور عیاش آدمیوں کے سپرد کر دیتا ہے۔

بہترین حاکم وہ ہیں جو تم سے محبت کرتے ہیں اور تم ان سے عقیدت رکھتے ہو، تم ان کے دُعاگو ہو اور وہ تمہارے۔ اور بدترین حاکم وہ ہیں کہ تم ان سے نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے خار کھاتے ہیں۔ تم اُن کو گالیاں دیتے ہو اور وہ تم کو۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

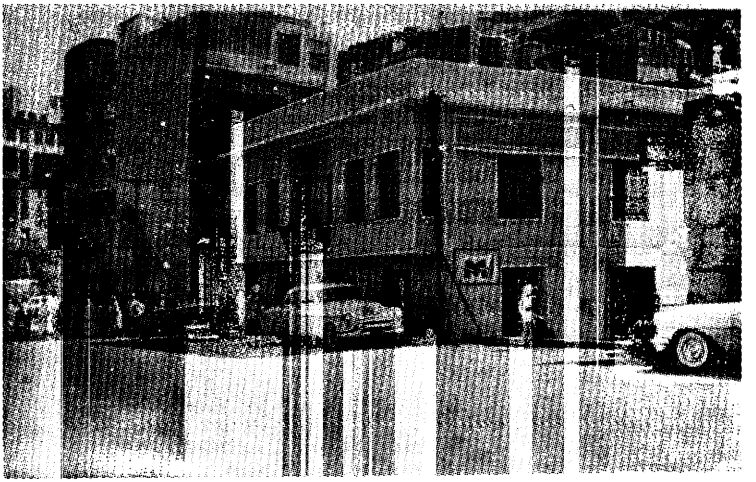

وہ مکان جہاں آفتابِ رسالتؐ طلوع ہوا۔ اب اس مکان میں کتب خانہ قائم کر دیا گیا ہے۔

وقار عظیم

شہر مکہ ——— جس کے گلی کوچوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پروان چڑھے۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

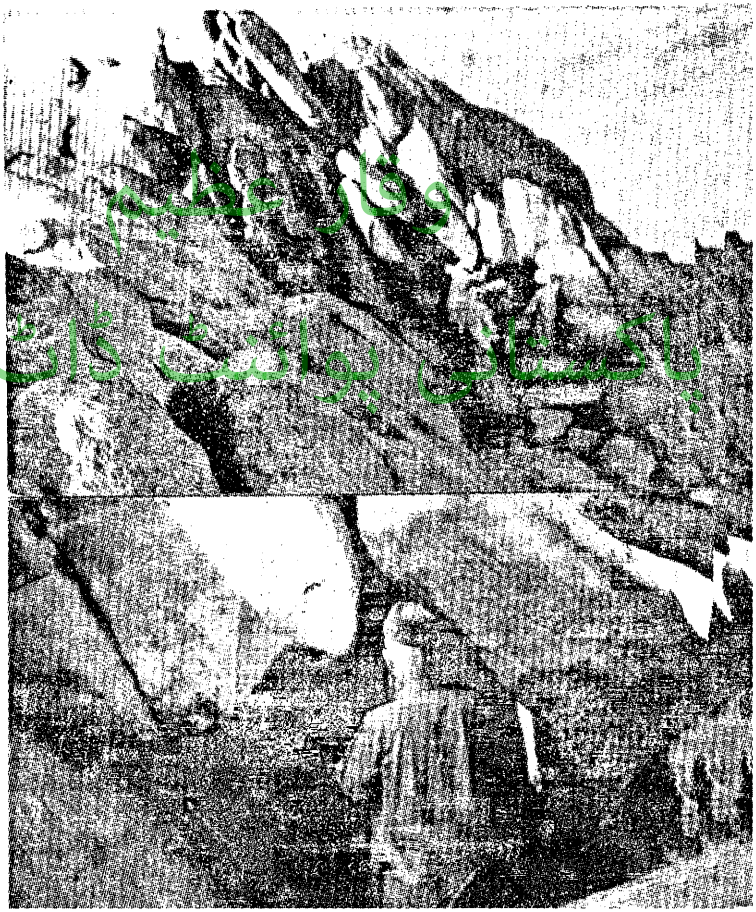

مکہ معظمہ سے تین میل
کے فاصلے پر
جبلِ نور
جس کی چوٹی پر غارِ حرا
واقع ہے۔

غارِ حرا
اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

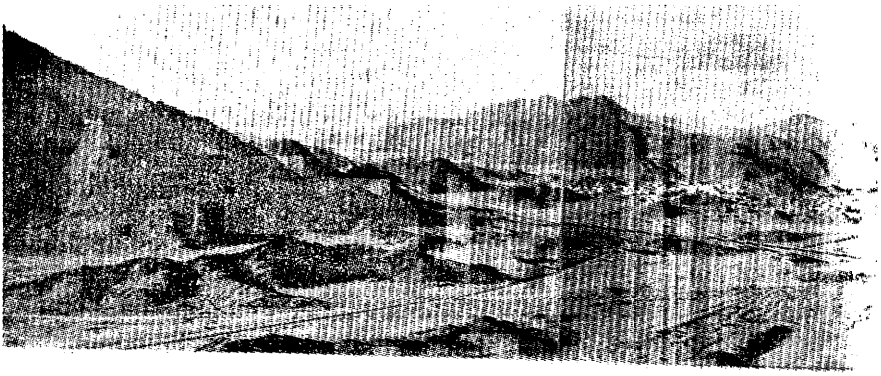

مکّے کی وہ وادی جس میں سے گزر کر حضورؐ غارِ حرا تشریف لے جاتے تھے۔

کوہِ صفا جس کی بلندیوں سے آپ نے حق کی دعوت دی۔ اب اس مقام پر
عالی شان دروازہ تعمیر ہو چکا ہے۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

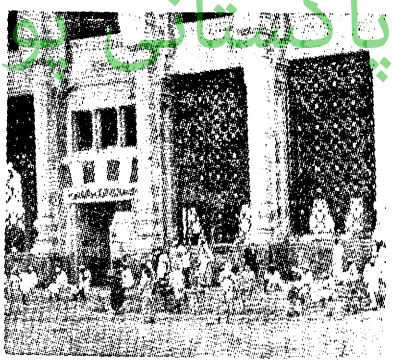

دارِ ارقم ــــ کوہِ صفا کے دامن میں دعوتِ اسلامی کا پہلا مرکز۔
جہاں حضرت عمرؓ نے حق کے آگے سر جھکایا۔

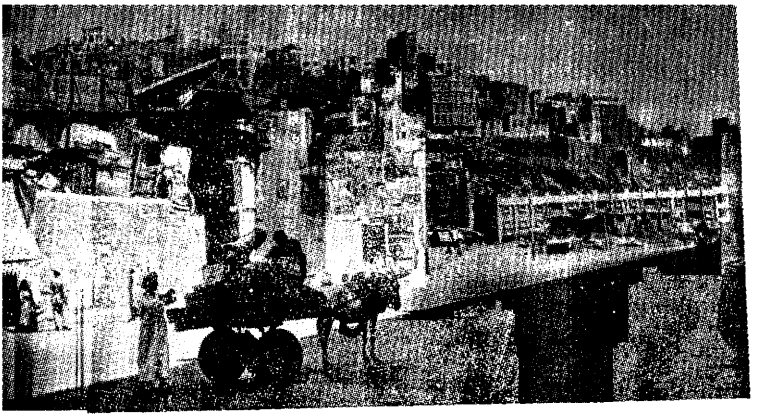

شعبِ ابی طالب ——— جہاں حضورؐ اور آپ کے جانثار تین سال محصور رہے۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

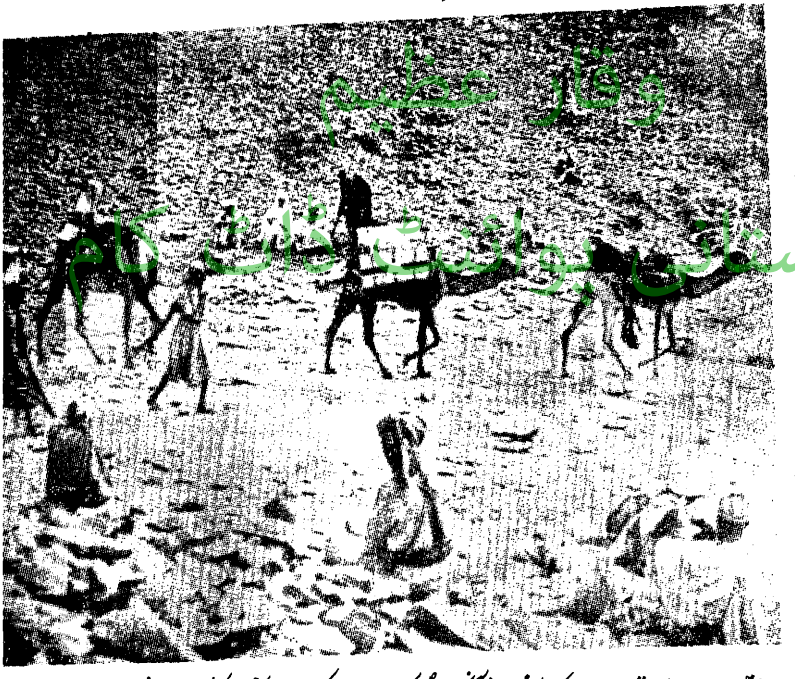

وقار عظیم
پاکستان ویلفیئر ٹرسٹ کام

عقبہ ——— اس مقام پر مدینے کے مسلمانوں نے آنحضرتؐ کے دستِ مبارک پر یہ تاریخی عہد کیا کہ "ہم رنج و راحت اور سختی و نرمی میں حضورؐ کا ساتھ دیں گے اور جہاں کہیں بھی ہوں گے لوگوں کی پروا کیے بغیر اعلانِ حق کریں گے۔"

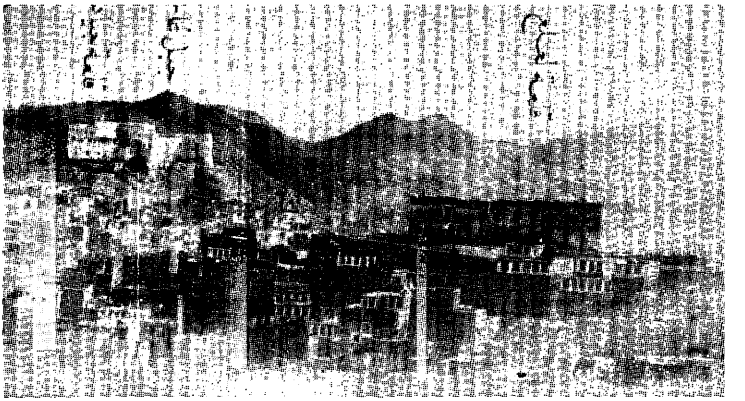

"غم نہ کر۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے" محبوبؐ نے محبؐ سے فرمایا۔
غارِ ثور ـــــ جہاں مکّے سے مدینے کی طرف ہجرت کرتے ہوئے آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ صدیق نے تین روز قیام کیا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

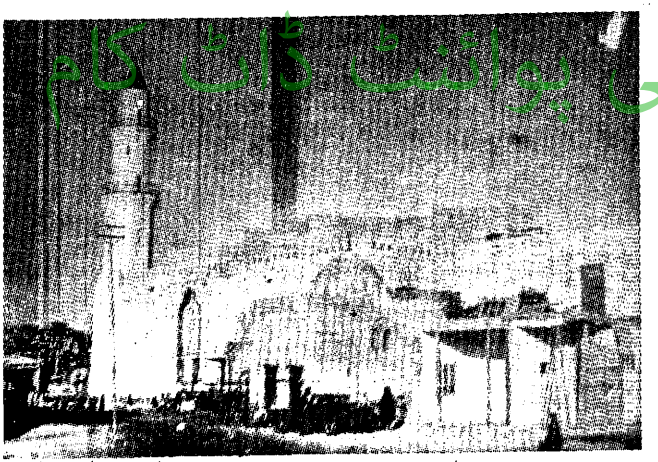

مسجدِ قبا ـــــ آٹھ دن کے سفر کے بعد نواحِ مدینہ میں "قبا" پہنچے اور اسلام کی پہلی مسجد کی بنیاد رکھی۔

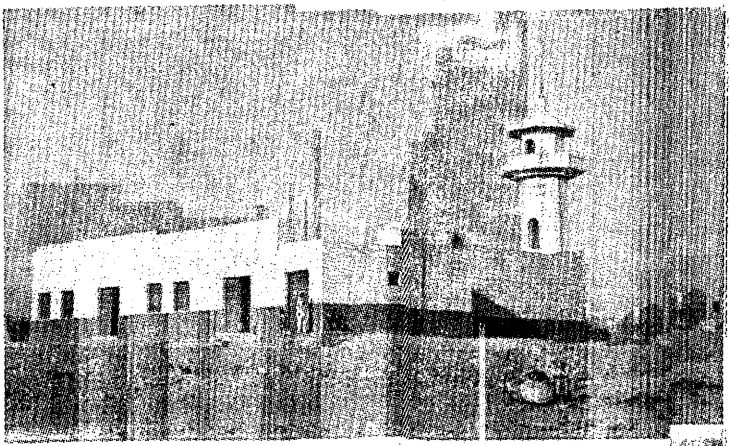

مسجد جمعہ
یہاں آپؐ نے مدینے میں
داخل ہونے سے پہلے
اسلام کا اوّلیں جمعہ ادا کیا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مکان،
جسے حضور صلعم کی
مدینے میں پہلی قیام گاہ
بننے کا شرف حاصل ہوا۔

وقار عظیم
پاکستان ہیوائنٹ ڈاٹ کام

بیرِ عثمانؓ
اسلام کا پہلا وقف، جسے حضرت
عثمانؓ نے حضورؐ کے فرمان پر
یہودیوں سے خرید کر مسلمانوں
کے لیے وقف کیا۔

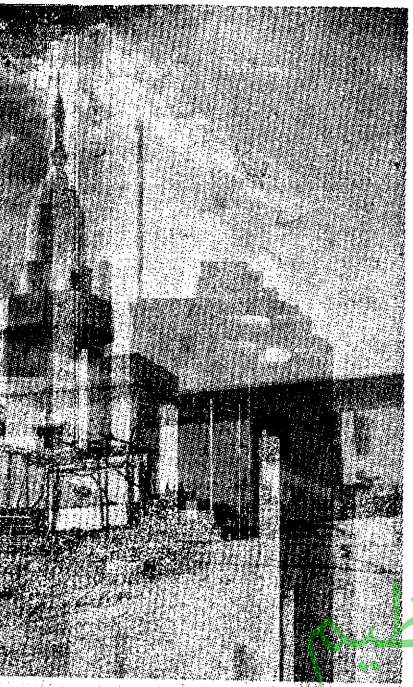

مسجدِ قبلتین
حق نے حضورؐ کے لیے قبلہ بدل دیا۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
چاند نکل آیا کوہِ وداع کی گھاٹیوں سے
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
ہم پر خدا کا شکر لازم ہے، جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

نحن جوار من بنی نجار، یا حبذا محمد من جار
ہم خاندان بنو نجار کی لڑکیاں ہیں، محمدؐ کیسا اچھا ہمسایہ ہے

بستانِ سلمانؓ
کھجور کے دو یادگار درخت، حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے لگائے اور آج تک پھل دے رہے ہیں۔

وقار عظیم
پاکستانی ویب سائٹ ڈاٹ کام

وادیٔ بدر ——— حق و باطل کا پہلا معرکہ اس خاک نے دیکھا۔

وقار عظیم

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

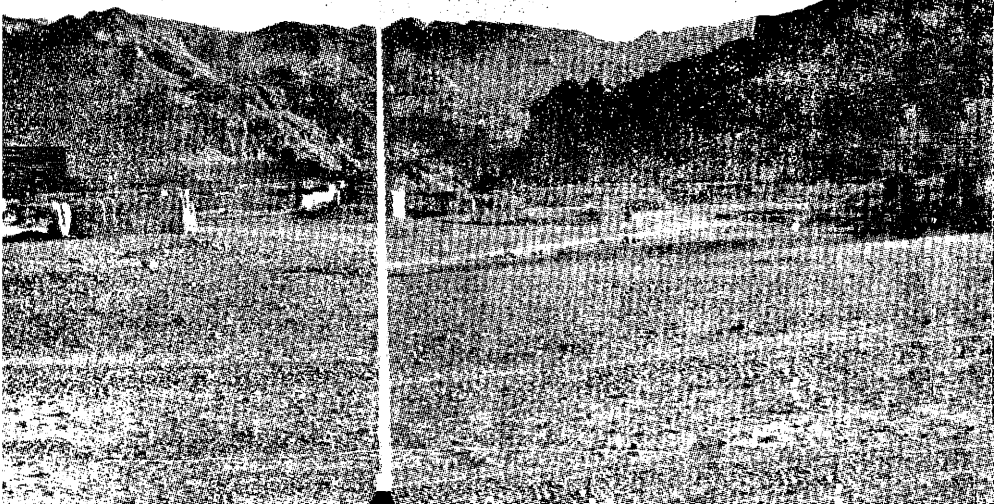

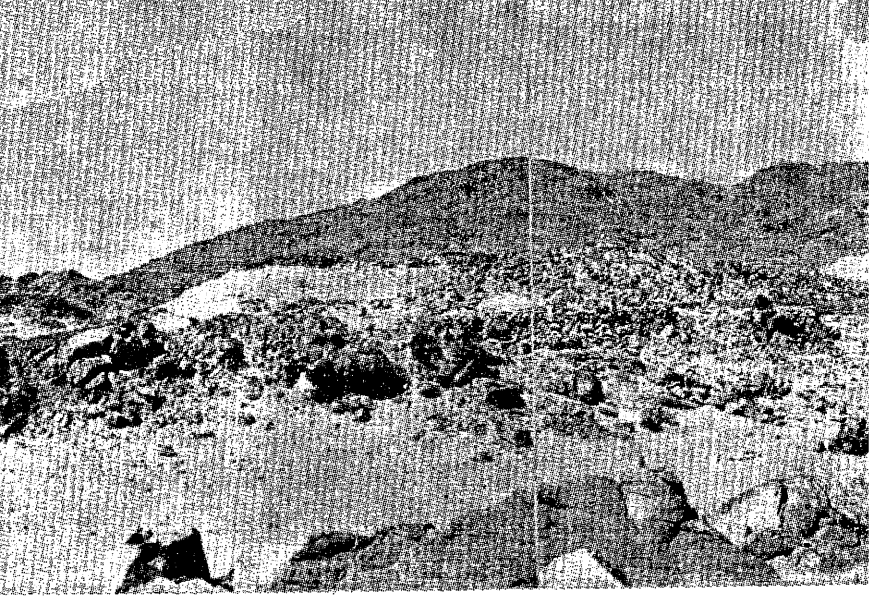

وقار عظیم

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وادیٔ اُحد ——— اُحد کی داستاں رنگین ہے خونِ شہیداں سے

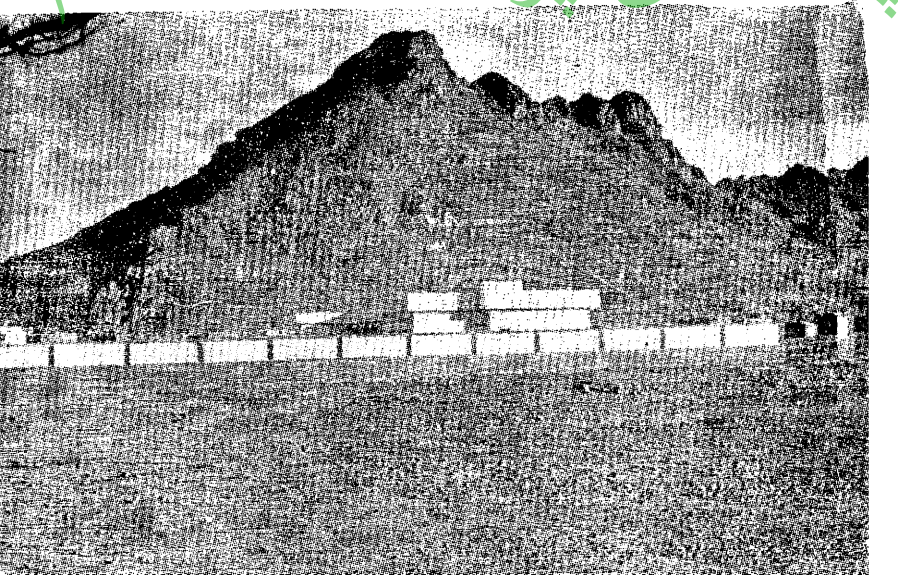

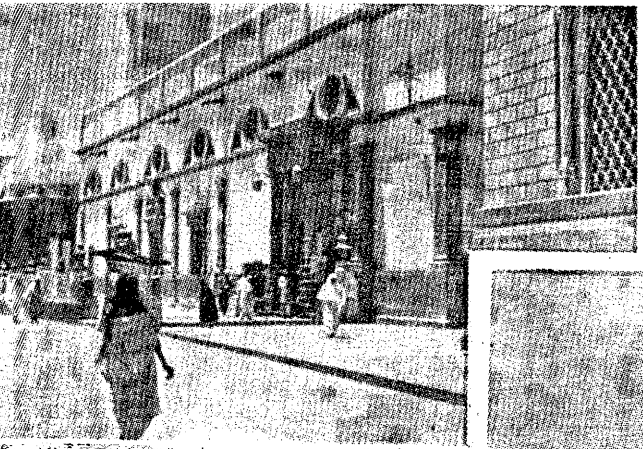

مسجدِ نبویؐ کے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

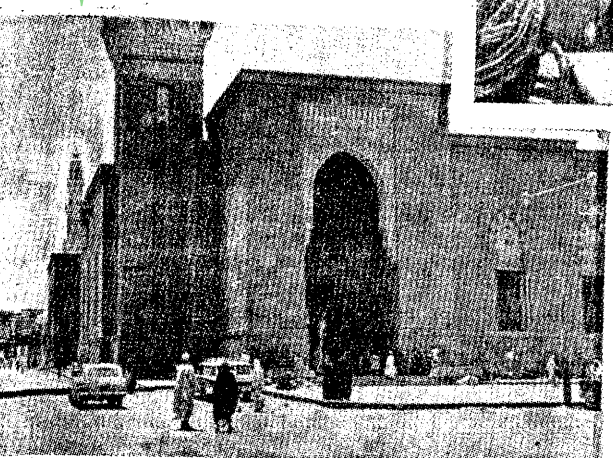

تین مناظر

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جنگِ خندق

جس میں حضورؐ اور مسلمان پیٹ پر پتھر باندھ کر لڑ رہے تھے

نحن الذین بایعوا محمدا
ہم نے محمدؐ کے نام پر ہمیشہ
علی الجهاد ما بقینا ابدا
کے لیے اسلام کی بیعت کر رکھی ہے

فتح مکہ —— (حرم شریف کا باب سعود)
بیعت گئے اسلام کے غازی ہری آخر کفر کی بازی
جھک نہ سکا توحید کا پرچم، صلی اللہ علیہ وسلم

جبلِ عرفات
جہاں رسولِ اکرم صلعم نے
آخری خطبہ دیا۔

اے لوگو، میری بات خوب توجہ سے سُن لو شاید پھر اس جگہ میں تم سے نہ مل سکوں۔

اے لوگو، تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح ایک دوسرے کے لیے محترم ہے جس طرح یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر محترم ہے۔

آج سے ہر قسم کا سُود ختم کیا جاتا ہے تم صرف اصل رقم کے حق دار ہو تم کسی پر ظلم نہ کرو۔ تمہارے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔

جس شخص کے پاس کوئی امانت ہو وہ اس کے مالک کو لوٹا دے۔

اے لوگو، عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آتے رہو۔ وہ تمہاری مددگار ہیں بے بس اور بے اختیار ہیں۔ تم نے اللہ کی اس امانت کو اپنی تحویل میں لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ کلمات (ایجاب وقبول) ادا کرنے کے ساتھ انہیں خود پر حلال کیا ہے۔

اے لوگو، میری باتیں گوش ہوش سے سُنو۔ میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم ان پر مضبوطی کے ساتھ کاربند رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سُنّت۔

اے لوگو، میری باتیں غور سے سُنو۔ دیکھو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تم ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے باز رہنا۔ خبردار گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے پامال ہو چکے ہیں۔

اے لوگو، اب جاہلیت کا غرور اور نسل و نسب کا گھمنڈ اللہ نے مٹا دیا۔ تمام انسان نسلِ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے تمہارے قبیلے اور خاندان محض ایک دوسرے سے تعارف کے لیے ہیں۔ اللہ کے نزدیک شریف و سربلند وہ ہے جو زیادہ خدا ترس اور متقی ہے۔

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

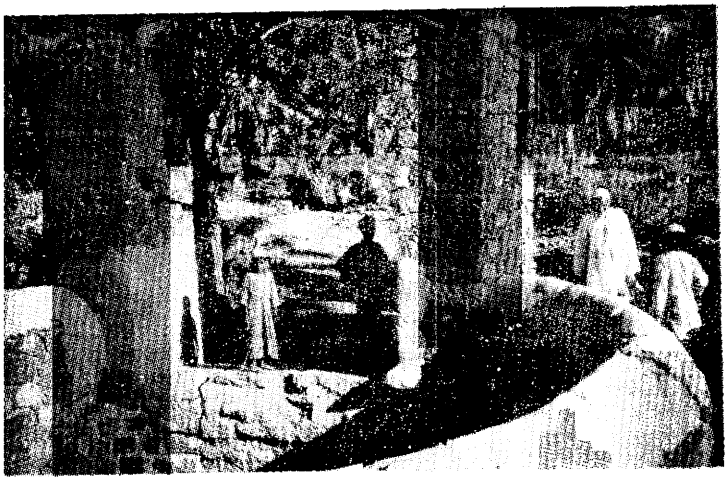

بیرِ عروس
جس کے پانی سے
آپؐ کو آخری غسل
دیا گیا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

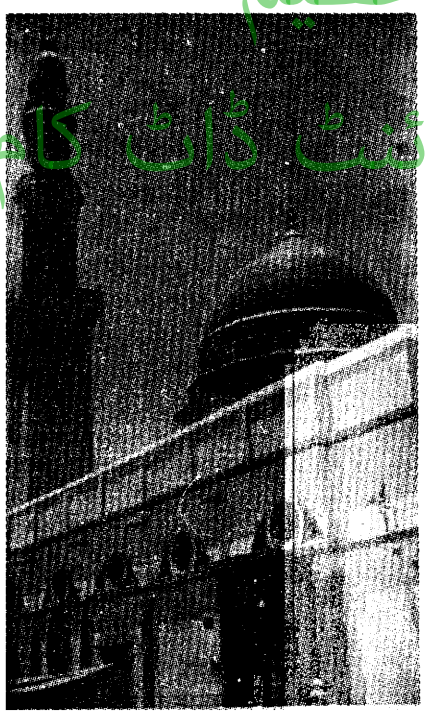

گنبدِ خضرا
ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

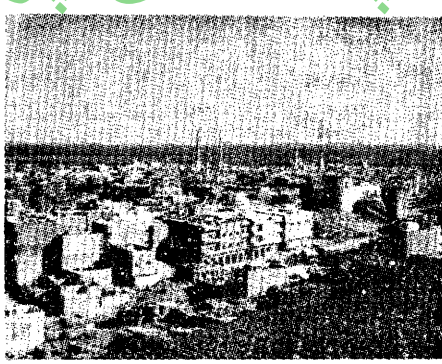

پیارے نبیؐ کا پیارا شہر
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

محبوبِ خدا کی محبوب دعائیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور میری یاد میں جب اس کے دونوں ہونٹ ہلتے ہیں تو اس وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْھَمِّ وَ الْحُزْنِ وَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَ الْجُبْنِ وَ الْبُخْلِ وَ ضَلَعِ الدَّیْنِ وَ غَلَبَۃِ الرِّجَالِ۔

بارِ الٰہا! میں رنج و غم، عاجزی، کسلمندی، بزدلی اور بخل، قرض اور ظالم لوگوں کے غلبے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَ وَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِکْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ۔

اے اللہ! میرے گناہ معاف کردے، میرے گھر میں فراغت عطا فرما اور میری روزی میں برکت دے۔

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَ سَکَرَاتِ الْمَوْتِ۔

اے میرے پروردگار! موت کی سختیوں اور جانکنی کی اذیتوں کے مقابلے میں میری مدد کر۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَ التُّقٰی وَ الْعَفَافَ وَ الْغِنٰی۔

اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ، عفت شعاری اور استغناء کا طلبگار ہوں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقِلَّۃِ وَ الذِّلَّۃِ وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ۔

اے اللہ! میں فقر، تنگ دستی اور ذلت و رسوائی سے پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظالموں اور ستمگروں یا مظلوموں اور ستم رسیدوں کے زمرے میں شامل ہوں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِکَ وَ تَحَوُّلِ عَافِیَتِکَ وَ فُجَاءَۃِ نِقْمَتِکَ وَ جَمِیْعِ سَخَطِکَ۔

اے اللہ! میں تیری نعمت کے زوال، تیری عافیت سے محرومی، ہجومِ مصیبت اور ہر قسم کی ناراضگی سے پناہ چاہتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِکَ

اے میرے اللہ! تو میری مدد فرما ذکر کے سلسلے میں، شکر کے سلسلے میں اور اچھی عبادت کے سلسلے میں۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ وَ ارْزُقْنِیْ وَ عَافِنِیْ وَارْحَمْنِیْ۔

اے میرے اللہ! مجھے راہ ہدایت دکھا، مجھے رزق عطا کر، مجھے عافیت سے نواز اور مجھ پر رحم فرما۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آخری قسط

فرار
فرار
فرار

مقبول جہانگیر

جرمن ٹینکوں کے جانے کے بعد ہماری جان میں جان آئی۔ ڈِک کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اُس نے باہر سرک کر دو تین مرتبہ اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کوئی جرمن سپاہی کھائی کے اُوپر چھپا ہوا نہیں تو ہمیں بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اب ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کھائی میں اُترا کیسے جائے، کیونکہ جرمن کسی وقت بھی دوبارہ نمودار ہو سکتے تھے۔ جس ٹیلے پر ہم نے پناہ لی تھی، اُس سے بارہ فٹ نیچے ایک اور چھوٹا سا ٹیلا نظر آ رہا تھا اور ان دونوں ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں ایسی جگہ موجود تھی جس پر پیر رکھ کر ہم احتیاط سے نیچے اُتر سکتے تھے۔ بارش کی وجہ سے کھائی کی دیواریں گیلی اور چکنی ہو چکی تھیں اور ویسے بھی تہہ کے اندر پانی بڑی مقدار میں جمع ہو چکا تھا۔ ان حالات میں نیچے اُترنا حماقت تھی۔

"بُرے پھنسے۔" ڈِک نے کہا۔ "اگر جرمن دوبارہ آ گئے تو ہم کُتّے کی موت مارے جائیں گے۔"

"مرنا تو ہر صورت میں ہے ہی۔" چارلس نے مُنہ بنا کر اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ اس پر وہ اور چڑ گیا اور کہنے لگا:

"جتنا ہنسنا ہے ہنس لو شاید پھر موقع نہ ملے۔"

"گھبراؤ مت یار۔۔۔" ڈِک نے کہا۔ "ذرا وہ کپڑے اور کمبل تو مجھے تھما دو۔"

اُس نے ایک بار پھر نچلے ٹیلے کا جائزہ لیا اور رائفل سے سنگین اُتار کر کمبل کی لمبی لمبی پٹیاں کاٹنے لگا۔ ہم دونوں خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہے۔ ان پٹیوں کے سروں پر گانٹھیں باندھ کر اس نے یہ خود ساختہ رسّا نیچے لٹکایا اور سنگین اس کے ایک سرے میں پرو کر نصف سے زائد حصّہ اُس ٹیلے کے اندر گھونپ دیا جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اگر ہم ذرا ہمّت کریں، تو اس طرح کھائی کے اندر اُتر سکتے ہیں۔ پانی ایک گھنٹے کے اندر اندر یقیناً جذب ہو جائے گا۔ آؤ، اب دوسرے ٹیلے پر پہنچیں۔"

ڈِک کا کہنا صحیح تھا۔ کھائی کا پانی ایک گھنٹے سے بھی پہلے خشک ہو گیا۔ ہم آہستہ آہستہ کمبل کے بنائے ہوئے رسّے پر پھسلتے ہوئے دوسرے ٹیلے پر اُتر گئے۔ اب یہاں سے مزید نیچے اُترنے کے لیے ہمیں دوپہر تک انتظار کرنا تھا۔ اس دوران میں ایک چھوٹا فوجی ہوائی جہاز کئی بار کھائی کے اُوپر سے گزرا۔ ایک مرتبہ تو وہ اس قدر نیچے اُڑ رہا تھا کہ ہمیں یوں احساس

ہوا جیسے جہاز کا پائلٹ ہم پر گولیاں برسانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"یہ جہاز ہماری نگرانی کر رہا ہے،" ڈِک نے کہا۔ "ہمیں آج ہی سُورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اِس کھائی کو عبور کرنا ہوگا۔"

ڈیڑھ سَو فٹ گہری کھائی میں جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم اُترے ہیں، وہ ایسا بھیانک تجربہ تھا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جسموں پر جا بجا خراشیں، ہاتھ سُوجے ہوئے اور کیچڑ میں لت پت بھُوت بنے ہوئے ہم اِس روز کھائی کے اندر ہی اندر کئی فرلانگ گئے۔ ایک جگہ یہ کھائی کئی شاخوں میں بٹ گئی تھی۔ کہیں دم لیے بغیر ہم آگے بڑھتے گئے۔ ایک مقام پر دلدل میں دفن ہوتے ہوتے بچے، دوسری جگہ سانپوں کے نرغے میں پھنسے، لیکن زندگی کے کچھ دن باقی تھے، ان تمام آفتوں اور سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخر ایسی جگہ آ نکلے جہاں سطح آہستہ آہستہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ سُورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پیشتر ہم نے اپنے آپ کو ایک وسیع و عریض میدان میں پایا جہاں کہیں کہیں بارش کا پانی جوہڑوں اور چھوٹے تالابوں کی صورت میں جمع ہو رہا تھا، کہیں گہری دلدل تھی، کہیں خشک اور خار دار جھاڑیوں کے سلسلے۔ فوجی ٹرکوں اور جیپوں کے نشان جا بجا پھیلے ہوئے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جرمن گاڑیوں کی آمد و رفت اِدھر سے بھی ہوتی ہے۔

سُورج چُھپنے کے بعد بھی ہم چلتے رہے۔ ڈِک کھائی میں اُترتے وقت دو مرتبہ گرا تھا اور اس کی حالت ہم سے کہیں بدتر تھی، لیکن وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ چار پس بار بار کمپاس سے راستے کی نشان دہی کرتا اور مَیں نے بچا کھچا سامان اُٹھا رکھا تھا۔ مزید چار میل چلنے کے بعد ایک بلند پہاڑی کے آثار دکھائی دیے جس کی چاروں طرف درختوں کے جُھنڈ تھے۔ جب ہم قریب پہنچے، تو یہ دیکھ کر سٹی گُم ہو گئی کہ پہاڑی کے اردگرد جرمن فوجی گاڑیاں نقل و حرکت کر رہی ہیں۔ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے گرتے پڑتے ہم پھر واپس ہوئے اور ایک لمبا چکر کاٹ کر ایسی جگہ آ نکلے جہاں چند جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں، لیکن ان کے مکیں نہ جانے کہاں جا چکے تھے۔ ایک خالی جھونپڑی کے اندر گُھس کر ہم فرش پر ڈھیر ہو گئے اور اپنے آپ کو نیند کے حوالے کر دیا۔

صبح سات بجے آنکھ کھلی، تو اردگرد کا منظر پوری طرح ہمارے سامنے تھا۔ اپنی دانست میں جس پہاڑی سے ہم دُور بھاگے تھے، وہ تین سَو گز کے فاصلے پر ہماری نگاہوں کے سامنے موجود تھی اور جرمنوں کی آوازیں ہمارے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھیں۔

ڈِک نے دانت پیستے ہوئے کہا:

"خدا ان جرمنوں کو جہنّم رسید کرے، کم بختوں نے پہاڑی پر بھی مورچے بنا رکھے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے اپنی دُوربین آنکھوں سے لگا لی، تو ہم دیکھ لیے جائیں گے۔ انھوں نے اینٹی ایئر کرافٹ گنیں بھی نصب کر رکھی ہیں۔ غالباً وہ کھانے پینے کی چیزیں کسی قریبی گاؤں سے لاتے ہوں گے اور دن بھر میں نہ جانے ان جھونپڑیوں کے آگے سے کتنی مرتبہ گزرتے ہوں گے۔ یہاں سے ہمیں ہٹ جانا چاہیے۔"

پہاڑی پر چونکہ چہل پہل شروع ہو چکی تھی، اس لیے ہم چلنے کے بجائے رینگتے ہوئے جھونپڑی سے نکلے اور ایک گھنٹے کی فنا کر دینے والی جدّوجہد کے ساتھ تقریباً دو سَو گز پیچھے ہٹے اور ایک محفوظ مقام پر رُک گئے۔ یہاں دلدلی زمین پر قدِ آدم گھاس اُگی ہوئی تھی جس کے اندر ہم جرمنوں کی عقابی نظروں سے بآسانی محفوظ ہو سکتے تھے۔ بھوک اور تھکن کے باعث ہم بیحد نڈھال ہو رہے تھے۔ کھانے کے لیے بسکٹ اور پنیر کے چند ٹکڑے باقی تھے، لیکن ان سے کچھ نہ بنا، بلکہ بھوک اور تیز ہو گئی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ ہم نے اِدھر اُدھر جوہڑ تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ اس ڈھلوان علاقے میں پانی کہاں رُکتا؟

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم نے نقشہ سامنے پھیلایا اور بچاؤ کی تدبیروں پر از سرِ نو غور کرنے لگے۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے تھے، کیونکہ پہاڑی پر بنا ہوا جرمن مورچہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس تمام راستے پر جرمنوں کا قبضہ ہے اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں مورچے بنائے گئے ہیں۔ کھائی سے لے کر اس پہاڑی تک کا درمیانی فاصلہ تقریباً آٹھ میل تھا اور اب ہم کھائی کے دوسرے کنارے پر سفر کر رہے تھے۔ چارلس کی رائے تھی کہ اگر کوئی گاؤں نزدیک ہے تو ہمیں وہاں پہنچ کر مقامی باشندوں سے مدد حاصل کرنی چاہیے۔ کھانے پینے کا سامان لے کر ہی ہم چاروں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ دن کے وقت جرمنوں سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ بھی سامنے تھا، اس لیے ہم رات کو ایک بجے کے لگ بھگ، جبکہ چاروں طرف جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، اپنی کمین گاہ سے نکلے اور سایوں کی مانند اس پگڈنڈی پر چلنے لگے جو چکر کاٹ کر پہاڑی کے عقب میں گم ہو جاتی تھی۔ گاؤں تک پہنچنے کے لیے ہمیں لازماً جرمنوں کے اس مورچے کے قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ دل کو اکڑا کر کے نہایت حوصلے اور استقلال کے ساتھ ہم آگے بڑھنے لگے اور عین پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ ہم مورچے سے اس قدر قریب تھے کہ پہاڑی کی چاروں طرف لگے ہوئے لکڑی کے کھمبے اور لوہے کے خاردار تار صاف نظر آ رہے تھے۔ جرمن سپاہی بیس بیس گز کے فاصلے سے پہاڑی کے اردگرد پہرہ دے رہے تھے۔ وہ اپنی حد میں ٹہلتے جاتے اور اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ ہم کچھوے کی طرح زمین پر رینگ رہے تھے اور آنکھیں انہی پہرے داروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں احساس تھا کہ ذرا سی آہٹ پاتے ہی نہ جانے کتنی گولیاں ہمارے جسموں میں پیوست ہو جائیں گی۔

پَو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے ہم بَل کھاتی ہوئی ایک کچی سڑک پر جا نکلے۔ اب مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہیں گھاس کے اندر لیٹ کر ہانپتے رہے۔ یکایک ہمارے کانوں میں موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ چارلس نے سر اُٹھا کر دیکھا، دُور پہاڑی کی جانب سے روشنی کا ایک ننھا سا دائرہ ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔

"کوئی جرمن پیغام رساں اپنی ڈیوٹی پر جا رہا ہے۔" ڈِک نے کہا۔ "ممکن ہے اس کے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں ہوں۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔ چارلس، جلدی کرو، پگڈنڈی کے عین درمیان بے ہوش بن کر لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں وہ اس طرف سے گزرے گا، باقی کام میں سنبھال لوں گا۔"

"اگر وہ مجھ پر توجہ دیے بغیر کنّی کاٹ کر نکل گیا تو؟" چارلس نے پُوچھا۔

"بکو مت، جو میں کہتا ہوں، وہ کرو۔"

چارلس نے خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا اور خود رینگتا ہوا سڑک کے عین درمیان لاش کی طرح لیٹ گیا۔ موٹر سائیکل کی آواز ہر لمحہ قریب آ رہی تھی۔ پھر وہ میرے بالکل سر پر آ گئی۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا، جرمن فوجی مجھے وہاں پڑے دیکھ کر بڑبڑایا، شاید گالی دے رہا ہوگا۔ انجن بند کیے بغیر وہ موٹر سائیکل سے اُترا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے پاس آیا اور جُھک کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ میں زندہ ہوں یا مرا ہوا، میرے دل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا، وہ اُلٹ کر گرا۔ اتنے میں میرے دونوں ساتھی بھوکے چیتوں کی مانند اس پر جھپٹے اور ڈِک کے چند ہی گھونسوں نے اسے بے جان کر دیا۔

"ذرا اس کی تلاشی تو لو۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اس کا پستول مجھے دے دو اور کارتوسوں کی پیٹی بھی، بلکہ بہتر یہی ہے کہ وردی بھی اُتار لو، ہمارے کام آئے گی۔"

تین اصحاب

جو انتظار کرتے رہے ــــــ

★ ایک صاحب یہ سوچتے رہے کہ بیمۂ زندگی کب کرایا جائے۔ عمر بڑھتی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو پالیسی ارزاں نرخ پر مل سکتی تھی زیادہ شرح پریمیم پر خریدنی پڑی۔

★ دوسرے صاحب کے انتظار کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیماری کے باعث بیمۂ زندگی کے ناقابل ہو گئے۔

★ تیسرے صاحب نے حالتِ انتظار میں اچانک جانِ جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

صحت اور بیماری، جوانی اور بڑھاپے، زندگی اور موت، کا درمیانی فاصلہ آنِ واحد میں طے ہو سکتا ہے!

بیمۂ زندگی خوشگوار مستقبل اور پُر اطمینان زندگی کا ضامن ہے۔

مسلم انشورنس کمپنی لمیٹڈ

بانی علامہ اقبال رح

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہم اُسے گھسیٹ کر گھاس میں لے گئے۔ چارلس نے انجن بند کیا اور موٹر سائیکل کو ایک گہرے گڑھے میں پھینک دیا۔ بدنصیب جرمن کی وردی اُتار کر ہم نے اسے بالکل برہنہ کر دیا۔ اس کے پاس کوئی خاص چیز نہ تھی۔ شراب کی ایک چھوٹی سی بوتل، لفافے میں رکھے ہوئے چند سینڈوچز، ایک کنگھا، آئینہ، شیو کا سامان، ٹارچ اور چند کاغذات جن پر جرمن زبان میں نہ جانے کیا لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اسی کی پیٹی سے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر سڑک کے کنارے لٹا دیا۔ پھر جلدی جلدی بوتل کھولی، ایک ایک گھونٹ پی کر حلق تر کیا اور سینڈوچز کھاتے ہوئے وہاں سے بھاگ اُٹھے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ شخص کسی قریبی گاؤں سے صبح ناشتے کے لیے انڈے اور دودھ وغیرہ لینے جا رہا ہوگا۔ اگر ہم اسی پگڈنڈی پر دوڑتے رہیں تو کسی نہ کسی گاؤں میں جا نکلیں گے۔" چارلس نے کہا۔

"پہلی مرتبہ تم نے صحیح بات کی ہے۔" ڈک نے کہا۔ "لیکن یہ دیکھ لو کہ سورج نکلنے والا ہے۔ ہمیں اس سے پہلے کہیں پناہ لینی ہوگی۔ یہ علاقہ جرمنوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کو عنقریب وہاں پڑے دیکھ لیں گے اور خونخوار کتوں کی طرح ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔"

شراب اور سینڈوچز پیٹ میں جانے سے ہمارے اندر نئی قوت پیدا ہو گئی اور جب سورج کی سنہری کرنیں شفق سے پھوٹنے لگیں تو ہم ایک ویران گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ باغ اور کھیت اُجڑے ہوئے تھے اور کوئی کسان دکھائی نہ دیتا تھا۔

"عجب معاملہ ہے، آدمی نہ آدم زاد۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو، مَیں گاؤں کے اندر جاتا ہوں۔" ڈک نے کہا۔ اُس نے جرمن سپاہی کی وردی پہنی اور رائفل لے کر بے نیازی سے چلتا ہُوا آگے بڑھ گیا اور ہم اس کے صحیح سلامت واپس آجانے کی دعائیں مانگتے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد اس کی صورت نظر آئی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"گاؤں بھر میں سوائے ایک بُڈھے کسان اور اس کی بیوی کے اور کوئی شخص نہیں۔ جرمنوں نے گاؤں کے اکثر افراد کو مار دیا اور کچھ جان بچا کر بھاگ گئے۔ کسان دراصل بیمار ہے اور اس کی بیوی کو تیمارداری کے علاوہ جرمن سپاہیوں کے لیے انڈے، دودھ اور بعض اوقات کھانا بھی پکانا پڑتا ہے۔ مجھے وردی میں دیکھ کر پہلے تو وہ ڈرے مگر جب مَیں نے اپنی مصیبت کی داستان سنائی، تو مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔ اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ ایک جرمن سپاہی روزانہ صبح شام گاؤں میں آتا ہے اور کھانے پینے کی چیزیں لے جاتا ہے۔ کسان نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ مَیں کہیں چھُپ جاؤں کیونکہ جرمن آنے والا ہے۔ جب مَیں نے اسے بتایا کہ اس جرمن کا ہم نے کیا حشر کیا ہے تو میاں بیوی بے حد خوش ہوئے۔ جرمنوں سے ان کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ انہوں نے مجھے اپنے مکان کا ایک تہ خانہ دکھایا اور کہا کہ ہم جب تک چاہیں، اس میں رہ سکتے ہیں۔"

جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے، تو دو تین کُتّوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ گاؤں کی حالت دیکھ کر رونا آتا تھا۔ کوئی مکان اور کوئی جھونپڑی سلامت نہ تھی۔ ٹینکوں نے جا بجا کھیتوں کو روند ڈالا تھا اور جرمن طیاروں نے خوب بمباری کی تھی۔ آوارہ مویشی، بھیڑ بکریاں اور گنتے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بوڑھا فرانسیسی کسان اور اس کی بیوی ہمیں دیکھ کر رونے لگے اور انہوں نے التجا کی کہ اگر ہم یہاں سے جانے کا پروگرام بنائیں تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں، کیونکہ خدشہ ہے کہ اگر کسی دن بھی انہوں نے جرمنوں کو کھانا پکا کر نہ دیا، تو وہ انہیں مار ڈالیں گے۔ ہم نے انہیں تسلّی دی اور اپنی رائفل اور پستول دکھا کر اشاروں سے کہا کہ فکر نہ کریں، ہم کئی جرمنوں کو جہنّم رسید کر کے ہی مریں گے۔

انہوں نے جلدی سے ہمیں تہہ خانے کا راستہ دکھایا۔ اِس قسم کے تہہ خانے فرانس کے کسانوں کے ہاں بنائے جاتے ہیں، ان میں ضرورت کا اناج اور دوسرا سامان محفوظ رہتا ہے۔ برفباری کے زمانے میں بھی یہ تہہ خانے آرام دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ہم جس تہہ خانے میں داخل ہوئے، وہ بارہ فٹ لمبا، اسی قدر چوڑا اور چھ فٹ اونچا تھا۔ اس کے فرش پر نرم نرم گھاس بچھی ہوئی تھی چھت کے عین درمیان میں لکڑی کا ایک تختہ لگا ہُوا تھا جسے حسبِ ضرورت ہٹا کر ہم اندر اور باہر آجا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ایک چھوٹی سی سیڑھی تہہ خانے میں رکھی تھی۔ اِس تہہ خانے کے اُوپر فرش پر بھی گھاس بچھی ہوئی تھی اور اسی گھاس کے نیچے وہ تختہ چھپا ہُوا تھا جس کو اُٹھا کر ہمارے میزبانوں نے ہمیں تہہ خانے میں پہنچایا تھا۔ دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ تھے جن سے تازہ ہَوا اندر آرہی تھی۔

کسان کی بیوی ہماری آمد سے بے حد خوش تھی۔ اس نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہم بڑی مشکل سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ گرم پانی سے اچھی طرح نہائے، پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر ایسے بے خبر سوئے کہ اگلے روز صبح سویرے آنکھ کھلی۔ بُوڑھا کسان بیمار ہونے کے باوجود نہ جانے کہاں سے اس علاقے کا ایک نقشہ لے کر آیا۔ اِس نقشے سے علم ہوا کہ ہم لاگس کورٹ، ویرون چوکس اور ویڈی کورٹ نامی دیہاتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے گاؤں کرسیی میں قیام پذیر ہیں۔ بُڈھا بار بار کہتا تھا کہ اگر ہم ذرا ہمت کریں تو کوینڈ پلیج کے ساحلی مقام پر کوئی نہ کوئی کشتی ضرور مل جائے گی، اس کے لیے دریائے سومی کو عبور کرنا لازمی ہے، لیکن یہ افواہیں بھی سُنی جارہی ہیں کہ جرمنوں نے ان تمام ساحلی علاقوں کی کشتیاں اپنے قبضے میں کر لی ہیں۔ ایک گھنٹے کی بحث کے بعد ہم نے دریائے سومی کو عبُور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کرسیی سے دریائے سومی صرف دس میل دُور تھا۔

اس گاؤں میں زیادہ دیر تک ٹھہرنا نہ صرف ہمارے بلکہ ان بُڈھے میاں بیوی کے لیے بھی مہلک تھا۔

دوپہر کو بُھنے ہوئے گوشت اور تلے ہوئے آلوؤں سے پیٹ بھرنے کے بعد ہم پھر خراٹے لینے لگے اور ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ بُڈھے کسان اور اس کی بیوی نے ہمیں جگا دیا۔ ان کے چہرے فرطِ خوف سے زرد اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے رُک رُک کر بتایا کہ ایک فوجی گاڑی ابھی ابھی گاؤں میں آئی ہے اور مسلح جرمن سپاہی ایک ایک مکان اور جھونپڑی کی تلاشی لے رہے ہیں۔

"آپ لوگ فوراً اُوپر چلے جائیں۔" ڈِک نے کسان اور اس کی بیوی کو اشارے سے سمجھایا۔ "ہم اپنی حفاظت خود کر لیں گے۔ وہ تعداد میں کتنے ہیں؟"

"سات آٹھ ہیں۔" عورت نے کہا اور اپنے شوہر کا بازو پکڑ کر اُوپر چلی گئی اور تختہ بند کر دیا۔

"اگر انہوں نے تشدد سے گھبرا کر ہمارا اَتا پتا بتا دیا تو اپنا خاتمہ یقینی ہے۔" چارلس نے کہا۔

"میرا خیال ہے اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" ڈِک نے جواب دیا اور سوراخ کے قریب جا کر جھانکنے لگا۔ "مجھے ان کا ٹرک نظر آرہا ہے۔ دو افسر ٹرک کے پاس کھڑے ہیں، بقیہ سپاہی ہماری تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہوں گے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ سب سے پہلے اس مکان میں کیوں نہیں آئے؟"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے جنگل کی طرف نکل گئے ہوں۔" مَیں نے رائے دی۔

ایک لمحے کے لیے ڈِک کی آنکھوں میں مَیں نے وہی چمک دیکھی جو کسی خطرناک فیصلے کے وقت نمودار ہوتی تھی۔ اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی، رائفل کے میگزین کا معائنہ کیا اور ٹوپی اور ترچھی کر کے نصف چہرہ چُھپا لیا۔

"ودستو! میرے ذہن میں اِس مصیبت سے بچنے کی

ایک تدبیر آئی ہے۔ میں اس وقت ایک جرمن سپاہی ہوں، رائفل میرے پاس ہے، میں تم دونوں کے ہاتھ اُوپر اُٹھوا کر باہر لے چلتا ہوں۔ وہ احمق سمجھیں گے کہ مفرور قیدیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں تمہیں آہستہ آہستہ ان کے قریب لے جاؤں گا اور جونہی میں ہلکی آواز سے کھنکھاروں، تم فوراً زمین پر لیٹ جانا۔ باقی کارروائی میرے ذمے۔۔۔۔ چلو، ہینڈز اپ۔۔۔۔"

ہم نے اپنے چہروں پر خوف کے آثار پیدا کیے اور ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے اور تختہ اُٹھا کر باہر نکلے، تو کسان اور اس کی بیوی نے ہمیں حیرت سے دیکھا اور جب ان کی نظر ڈِک پر پڑی جو رائفل تانے خونیں نظروں سے انہیں گھور رہا تھا، تو بیچاروں کی چیخیں نکل گئیں۔ ڈِک نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر انہیں چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور ہمیں دھکیلتا ہوا میدان میں لے آیا۔ دونوں جرمن افسر ٹہلتے ہوئے اِس مکان کی طرف آ رہے تھے۔ یکایک ان کی نظریں ہم پر پڑیں اور وہ وہیں رُک گئے۔ ڈِک اب سیٹی بجا بجا کر یوں مار کر ہمیں آگے بڑھا رہا تھا اور ہم ہاتھ اُوپر اٹھائے بڑی بے بسی سے چل رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ جرمن افسروں نے قہقہہ لگایا، ایک دوسرے سے کچھ کہا اور اکڑتے ہوئے ہماری جانب آئے۔ وہ نازک موقع لحظہ بہ لحظہ قریب آ رہا تھا جب ہمارا اور ان کا درمیانی فاصلہ پندرہ فٹ کا رہ گیا، تو ڈِک یک لخت کھانسا۔ یہ آواز سُنتے ہی ہم اوندھے مُنہ زمین پر گر پڑے، پھر ڈِک کی رائفل شعلے اُگلنے لگی اور جرمن افسر پلک جھپکنے میں دوسری دُنیا کی سَیر کر رہے تھے۔

"اٹھاؤ ان کم بختوں کو اور لے چلو مکان میں ——" فائر کی آواز سُن کر دوسرے بدمعاش بھی آتے ہی ہوں گے۔" ڈِک چلّایا۔ "ان کے ریوالور قبضے میں کر لو۔"

ایک منٹ کے اندر اندر ہم نے دونوں جرمن افسروں کی لاشیں اُس تہہ خانے میں پھینک دیں جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم خود چھپے ہوئے تھے۔ اتنے میں ڈِک ٹرک سٹارٹ کر کے مکان کے قریب لے آیا اور کسان سے کہا: "جتنا سامان رکھ سکتے ہو ٹرک میں رکھ لو، ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔" پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا:

"تم لوگ کس مرض کی دوا ہو۔۔۔ وحشیوں کی طرح میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ان جرمن افسروں کی وردیاں اُتار لو، کام آئیں گی۔"

ہم دوبارہ تہہ خانے میں اُترے اور وردیاں اُتار ہی رہے تھے کہ ڈِک اندر آیا:

"جرمن سپاہی اس طرف آ رہے ہیں، غالباً انہوں نے فائر کی آواز نہیں سُنی۔ وہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لو اور اِدھر اُدھر چھُپ جاؤ۔ میں ان سے ہتھیار رکھوانے کی کوشش کروں گا۔"

کسان اور اس کی بیوی گھاس میں چھُپ گئے، ہم نے ریوالور سنبھالے اور کواڑوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ ڈِک دوسری جانب دیوار سے چپک گیا چند لمحے بعد جرمن سپاہیوں کے بولنے کی آوازیں ہمارے کانوں میں آئیں، پھر وہ بھاری جُوتوں سے لکڑی کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اب وہ ہمارے نشانے کی زد میں تھے۔

"اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اٹھا لو۔" ڈِک نے جرمن لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے کہا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا، تو جرمن وردی پہنے اپنے ہی ایک ساتھی کو رائفل تانے دیکھ کر سٹپٹائے۔ بعض اِس پُرلطف مذاق پر ہنسے اور کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ ڈِک کی رائفل سے گولی نکلی اور سامنے کھڑے ہوئے پہلے سپاہی کے بازو میں لگی۔ ایک دردناک چیخ کے ساتھ وہ وہیں گرا اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں ہم اپنے ریوالور سنبھالے سامنے آ گئے۔ چشم زدن میں جرمن سپاہی اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اُوپر اُٹھائے کھڑے تھے۔

"اپنی پشت میری طرف کر لو اور اُس دیوار کی طرف

یادگار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دو سحر انگیز ٹالکم پوڈر

محمد عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وہائٹ لیس - بلیک لیس

وہائٹ لیس: اس کا استعمال ہر وقت تر و تازہ رہنے کی ضمانت ہے
خوشبو بھینی اور خوشگوار ہے۔

بلیک لیس: جسم کو ہر موسم میں پھولوں کی طرح تر و تازہ رکھتا ہے۔ اس کی رومان انگیز خوشبو آپ کو مزید دلکش بنا دیگی۔

دونوں ٹالکم پوڈر کوالٹی میں معیاری
اور خوشبو میں لاجواب ہیں

outdoor Girl

GIRL COSMETICS LTD., LONDON

NATIONAL 577 D

مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" ڈک نے کہا۔ "اگر کسی نے شرارت کی، تو بھیجا نکال دوں گا۔"

انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ ڈک نے بڈھے کسان کو اشارہ کیا۔ وہ بھاگتا ہوا اندر گیا اور موٹی موٹی رسّیاں اُٹھا لایا۔ دس منٹ کے اندر اندر ہم نے ان آٹھوں کو اس طرح باندھ کر ڈال دیا کہ وہ کوشش کے باوجود حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے حلق میں کپڑے کی دھجیاں بھی ٹھونس دی گئی تھیں۔

"بہتر ہے کہ تم لوگ بھی اپنی اپنی وردیاں پہن لو۔" ڈک نے کہا۔ "کھانے پینے اور ضرورت کی جتنی چیزیں لے سکتے ہو، لے لو۔ دریائے سوئی تک اس ٹرک میں ہم آسانی سے مزاحمت کے بغیر سفر کر سکیں گے۔ ممکن ہوا، تو ان بڑے میاں کو بھی راستے میں کہیں اُتار دیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہمارا ٹرک بیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُس سڑک پر دوڑ رہا تھا جو نقشے کے مطابق سیدھی دریائے سوئی کے دائیں کنارے پر نکلتی تھی۔ تین میل تک کوئی متنفس راستے میں نہ ملا۔ چوتھا میل شروع ہوتے ہی سڑک کے عین درمیان ایک چھوٹی سی جرمن چوکی نظر آئی جہاں دو مسلّح پہریدار ڈیوٹی دے رہے تھے۔ لکڑی کا ایک کھمبا سڑک بند کیے ہوئے تھا۔ ٹرک دیکھتے ہی یہ کھمبا اُٹھا لیا گیا، پہرے داروں نے سلیوٹ کیا اور ہم بھی جواب میں فوجی سلیوٹ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"خدا کا شکر ہے ہم اس چوکی سے نکل آئے۔" بڈھے نے کہا۔ "اب آپ ہمیں کسی بھی درمیانی گاؤں میں چھوڑ سکتے ہیں۔"

ہم جس سڑک پر جا رہے تھے، اس پر جرمن فوجی گاڑیوں کی آمد و رفت کثرت سے جاری تھی، لیکن کسی نے ہمیں روکنے یا کچھ پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ مخالف سمت سے آنے والا کوئی ٹرک ہمارے قریب سے گزرتا، تو اندر بیٹھے ہوئے جرمن سپاہی ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے اور ہنستے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

کوینڈ کے نواح میں ریلوے پُل کے قریب ایک دوسری چوکی پر ہمیں روکا گیا، کیونکہ ٹریفک ایک طرف سے جاری تھی۔ ہم دھڑکتے دل سے جرمن سنتریوں کو دیکھ رہے تھے اور ڈر تھا کہ شاید وہ کسی پاس کا مطالبہ کریں۔ ڈک نے کمال ہوشیاری سے چارلس کو اپنی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا اور مجھے بھی آنکھ کے اشارے سے خبردار رہنے کی ہدایت کی۔ ٹرک کی تینوں سائڈوں میں کینوس پڑا ہوا تھا جس کی رسّیاں ہم نے پہلے ہی کس دی تھیں تاکہ اندر بیٹھے ہوئے کسان میاں بیوی نظر نہ آئیں۔

ہمارے آگے تین ٹرک اور رُکے ہوئے تھے اور جرمن سنتری ان کے ڈرائیوروں کے قریب کھڑے نہ جانے کیا کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ڈک نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا اور میرے کان میں کہا:

"بُرے پھنسے۔۔۔۔ وہ ان سے فارغ ہو کر ہمارے پاس بھی آئیں گے اور مصیبت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی جرمن زبان روانی سے نہیں بول سکتا۔"

"وہ تعداد میں صرف تین ہیں۔۔۔۔ ان سے نمٹ لینا کچھ مشکل نہیں۔" چارلس نے جواب دیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بڑی بے تکلفی سے ہاتھ ہلا کر جرمن سنتریوں کو اس قسم کا اشارہ کیا جس سے وہ سمجھیں کہ ہم جلدی جانا چاہتے ہیں۔ سپاہیوں نے جواباً ہاتھ ہلایا اور اونچی آواز میں کچھ کہا جس سے ہمارے پلّے کچھ نہ پڑا۔

"جیمز، تیار ہو جاؤ۔" ڈک نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ٹرک کے پچھلے حصّے سے کینوس کھول کر وہیں جا بیٹھو، اپنا ریوالور بھی سنبھال لو۔ چارلس، تم اُس تیسرے سپاہی کا خیال رکھو اور اشارہ ملتے ہی اُسے گولی سے اُڑا دینا۔ بقیہ دونوں سپاہی ہم سے پوچھ گچھ کرنے آئیں گے۔"

مَیں نے حکم کی تعمیل کی، ٹرک کے پچھلے حصّے میں جا

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بیٹھا اور کنپٹیوں اتنا کھول دیا کہ ضرورت کے وقت آسانی سے باہر کود سکتا تھا۔ دو منٹ بعد ہمارے آگے کھڑے ہوئے تینوں ٹرک سٹارٹ ہوئے اور پُل پار کرنے لگے۔ اب سنتریوں نے ہماری طرف قدم بڑھائے۔ ڈِک اپنی کلائی باہر نکال کر بار بار وہ گھڑی دیکھ رہا تھا جو اُس نے جرمن افسروں کو مار کر حاصل کی تھی۔ غالباً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔

دونوں جرمن سنتری ٹرک کی دائیں بائیں کھڑکیوں کے پاس آن کر کھڑے ہو گئے۔ تیسرا پُل کے دروازے ہی پر پہرہ دے رہا تھا۔ بائیں جانب کھڑا ہوا سپاہی چارلس کی طرف دیکھ کر مُسکرایا اور کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ اس انداز میں آگے بڑھایا جیسے کچھ طلب کر رہا ہے۔ یقیناً وہ کاغذات دیکھنا چاہتا تھا۔

چارلس نے گردن ہلائی اور ڈِک کی طرف اشارہ کر دیا۔ بھلا سپاہی ہنستا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ میں نے ڈِک کے گھٹنا مارنے کی آواز سُنی اور آہستہ سے کنپٹیوں اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ میں نے ٹرک کی اوٹ سے دیکھا کہ کھڑکی کھُلی، ڈِک نیچے اُتر آیا اور پریشانی کے عالم میں اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ دونوں جرمن سپاہی حیرت سے ڈِک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یکایک ڈِک نے گردن جُھکائی اور پوری قوّت سے آگے کھڑے ہوئے سنتری کی ناک پر ٹکر ماری۔ یہ ضرب اتنی شدید اور غیر متوقع تھی کہ وہ لڑکھڑا دُور جا گرا۔ ڈِک چیتے کی مانند اس پر جھپٹا اور اب میرے لیے راستہ صاف تھا۔ اِس سے پیشتر کہ دوسرا سنتری ڈِک پر فائر کرے، میرے ریوالور کی ایک گولی اس کے بھیجے کے پار ہو گئی۔ پُل پر کھڑے تیسرے سپاہی نے یہ تماشہ دیکھا، تو اس نے بدحواس ہو کر پُل کے نیچے کھائی میں چھلانگ لگا دی۔

چارلس ٹرک سے اُتر کر پُل کی طرف دوڑا ——— ڈِک سنتری کی گھونسوں سے تواضع کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کے کپڑے خون سے تر ہو گئے اور وہ بیہوش ہو گیا۔ ہم نے اُسے اُٹھایا اور کھائی میں پھینک دیا۔ چارلس پُل پر کھڑا فائرنگ کر رہا تھا۔ ڈِک نے اسے آواز دی:

"وقت ضائع نہ کرو، آؤ اب یہاں سے کھسک چلیں، راستہ صاف ہے۔"

اندر کسان اور اس کی بیوی خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جرمن سنتریوں کا خاتمہ ہُوا تو اُن کی جان میں جان آئی۔ ڈِک نے ٹرک سٹارٹ کیا اور پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ دو میل کے بعد آبادی کے آثار نظر آئے۔ کسان نے بتایا کہ اس قصبے کا نام مون ہکس ہے اور یہاں اُس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ اگر ہم پسند کریں تو وہ پناہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ڈِک کا خیال بھی یہی تھا کہ چونکہ شام ہو گئی ہے اور جلد یا بدیر پُل پر ہونے والے حادثے کی خبر جرمنوں تک پہنچ جائے گی، اس لیے کہیں پناہ لینی ضروری ہے اور اس ٹرک سے بھی پیچھا چھُڑانا ہوگا۔ گاؤں میں زندگی کے بظاہر کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ ممکن ہے سُورج غروب ہونے کے بعد لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جاتی ہو۔ ہم نے کسان اور اس کی بیوی کو گاؤں کی طرف روانہ کیا، ٹرک میں سے وہ تمام سامان نکالا جس کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی تھی اور ٹرک کو ایک کھڈ کے اندر دھکیل دیا۔

ہر طرف ہیبت ناک سناٹا طاری تھا۔ ہم سڑک سے ہٹ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں چلے گئے، کیونکہ ٹریفک کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ پُل والے حادثے کے بعد ہمارا یوں شکستہ حالت میں پھرنا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد بُڈھا کسان دُور سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان اور تھے۔ جب وہ سڑک پر کسی جرمن ٹرک کی ہیڈ لائٹس دیکھتے، تو وہیں دبک جاتے اور ٹرک گزر جانے کے بعد آگے بڑھتے۔ جب وہ قریب آئے، تو ہم نے اپنی کمیں گاہ سے نکل کر انہیں آواز دی۔ بُڈھے کے ساتھ آنے والے نوجوان بلجیم کے رہنے والے

تھے اور اب اپنے وطن واپس جانا چاہتے تھے، لیکن جرمنوں کا خوف اِس حد تک اُن پر طاری تھا کہ کوئی فیصلہ کُن قدم اُٹھانے سے قاصر تھے۔ بڈھا کسان انہیں ہمارے کارناموں سے آگاہ کر چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہمارے استقبال کے لیے اپنی جان پر کھیل کر گاؤں سے باہر آ گئے تھے، کیونکہ جرمن ان کی تلاش میں تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کا ایک اور ساتھی گاؤں میں موجود ہے، اس کی ٹانگ پر پھوڑا نکل آیا ہے جس کے باعث وہ چل نہیں سکتا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ گاؤں میں پچاس ساٹھ افراد موجود ہیں، لیکن وہ سب کے سب عُمر رسیدہ ہیں۔

گاؤں میں داخل ہوئے، تو کُتّوں نے حشر برپا کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ موذی حیوان ہماری آمد کے منتظر ہی تھے۔ مون چکیں کی گلیاں اور بازار ویران اور مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سُن کر کچھ لوگوں نے کھڑکیوں میں سے جھانکا اور ہمیں جرمن سمجھ کر کھڑکیاں بند کر دیں۔ اپنے ساتھیوں کی رہنمائی میں مون چکیں کی درمیانی گلی سے گزرتے ہوئے ہم شمال کی طرف بڑھے اور فورٹ موہون تک پہنچ گئے۔ راستے میں بڈھا کسان اور اس کی بیوی ہم سے جُدا ہو گئے اور کسان کہنے لگا کہ وہ صبح کسی وقت فورٹ موہون آ کر ہم سے ملے گا۔

فورٹ موہون وہ مقام تھا جہاں ہمارے بلجی دوست چُھپے ہوئے تھے۔ یہ ایک وسیع و عریض دلدلی میدان تھا جہاں قدم قدم پر بے شمار رکاوٹیں کھڑی تھیں اور یہاں جرمنوں کے ٹرک آ سکتے تھے نہ جیپ گاڑیاں، اسی لیے بلجی نوجوانوں نے اِس مقام کا انتخاب کیا تھا۔ مغرب کی جانب ایک ڈیڑھ فرلانگ گھٹنوں گھٹنوں تک گہری دلدل میں چلنے کے بعد ایک پُرانی اور بوسیدہ عمارت کے آثار دکھائی دیے۔ دن بھر یہ نوجوان اس عمارت کے ایک تہہ خانے میں چُھپے رہتے اور رات کو گاؤں میں آ کر کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے۔ ابتدا میں انہوں

نے بلجیم کی سرحد پار کرنے کی کوشش کی اور ایک مرتبہ تو جرمنوں کے نرغے میں بھی آ گئے، لیکن دو ہفتے بعد قید سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ تینوں آدمی انجینیر تھے اور اِن سے جرمنوں نے دن رات پُل اور سڑکیں بنوانے کا کام لیا تھا۔

جب ہم تاریک تہہ خانے کے اندر اُترے تو موم بتی کی کانپتی ہوئی مدھم روشنی میں تیسرا شخص گھاس کے بستر پر لیٹا دکھائی دیا اس کی دائیں ٹانگ پر دو ٹہنیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہمیں جرمن وردیوں میں دیکھ کر اس کا مُنہ دہشت سے کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر کروٹ کے بل گر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے جلدی جلدی ہمارے متعلق بتایا، تو اسے کچھ حوصلہ ہوا، تاہم خوف اب بھی اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے، کھانے پینے کا جو سامان لائے تھے، اس میں سے دوستوں کو بھی شریک کیا۔ بلجی نوجوانوں نے بتایا کہ دریائے سومی کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے اور جرمنوں نے مقامی ملّاحوں اور مچھیروں کی تمام کشتیاں اپنے قبضے میں کر لی ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی شخص دریا کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ وہاں نہ صرف طیارہ شکن توپیں نصب ہیں، بلکہ اسلحے اور ایندھن کے ذخائر بھی ہیں۔ جرمنوں کو خدشہ ہے کہ برطانوی جاسوس اور مفرور قیدی ان ذخائر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، اس لیے وہ بہت محتاط ہو گئے ہیں۔

"جو واقعات آپ پر گزرے ہیں، وہ ہمارے لیے حیرت انگیز ہیں۔" ایک بلجی نوجوان بولا۔ اس کا نام برزد، دوسرے کا رینی اور تیسرے کو کریگ کہتے تھے۔ "آپ نے جس طرح یہ جرمن وردیاں اور ہتھیار حاصل کیے ہیں، اس پر ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟ کیا آپ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟"

عمر عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ننھے ننھے کومل بچے
کیسے پیاس بجھاتے ہیں
الابلا پیتے رہتے ہیں
اور کھلنے نہیں پاتے ہیں"

بچّوں کی صحت کو فیشن کا شکار ہونے سے بچایئے۔
جب آپ ان کی غذا کا خیال رکھتے ہیں تو ان کے مشروبات
کی چھان بین بھی آپ ہی کا فرض ہے۔
انہیں ایسے مشروبات سے دُور رکھیئے جو صرف وقتی سکون
پہنچاتے ہوں اور جس کی عادت پڑ جانے کا امکان ہو۔

وقار عظیم

پھلوں کے رس بہترین مشروبات ہیں

پاکستانی ویب سائٹ ڈاٹ کام

پھل قدرت کا بہترین تحفہ ہے۔ پھلوں کا رس ہمیشہ بڑے شوق سے
پیا جاتا ہے۔ بچے بڑے سبھی پھلوں کا رس پسند کرتے ہیں۔ جب پھلوں کا
رس آسانی سے ملے تو الابلا کیوں پی جائے۔ مچلز پھلوں کے بہترین
رس بناتے ہیں۔ انکے اپنے باغات ہیں جہاں ماہرین کی نگرانی میں
سائینٹفک طریقے پر عمدہ قسم کے پھل پیدا کئے جاتے ہیں جن سے مچلز
مدتوں سے کئی قسم کے لذیذ غذائیت سے بھرپور اور مفید صحت مشروبات
بنانے کیلئے مشہور ہیں۔ آج ہی مچلز اسکواش کی ایک بوتل خرید لیجئے۔
اور تازہ پھلوں کی لذت کا لطف اٹھایئے۔

مچلز اسکواش سب سے بہتر

مینگو، اورینج، لیمن، فالسہ، گریپ فروٹ، لیمن بارلے، اورینج بارلے، اورینج کرش، لائم کارڈیئل

"ہم ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہیں۔" ڈک نے کہا۔ "دریا یہاں سے بالکل نزدیک ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ چند منٹ آرام کرنے کے بعد آپ میں سے کسی کو دریا تک لے جاؤں اور دیکھوں کہ جرمنوں نے وہاں کیا کچھ انتظام کر رکھا ہے۔ جب تک ان تمام حالات کا بغور جائزہ نہ لیا جائے گا، ہم اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیا اتحادی طیاروں نے کبھی اس علاقے پر بم برسانے کی کوشش کی ہے؟"

"صرف ایک بار۔" کریگ نے جواب دیا۔ "وہ تعداد میں تیس چالیس طیارے تھے، لیکن جب جرمن طیارہ شکن توپوں کے دہانے کھلے تو ان میں سے بیشتر فضا ہی میں تباہ ہو گئے اور باقی اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے۔ جرمن توپچیوں کے نشانے اس قدر صحیح ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اتحادی بمباروں نے جتنے بھی بم برسائے ان میں سے بہت کم صحیح نشانوں پر لگے اور اکثر بم تو دریا ہی میں گر جاتے تھے۔"

"کیا دریا کے دونوں کنارے جرمنوں کے قبضے میں ہیں؟" چارلس نے پوچھا۔

"جی ہاں، ہمارے شناسا کے مطابق تو یہی صورت تھی۔ ایک ماہ سے ہمیں دریا کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا، اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اب کیا معاملہ ہے، بہرحال دونوں کناروں پر ان کی طیارہ شکن توپیں نصب ہیں اور جا بجا زمین دوز مورچوں میں ٹینک بھی کھڑے ہیں۔ دریا کی نگرانی دن رات ہوتی ہے اور آمد و رفت ڈبل پل سے ہوتی ہے جس کے اوپر سڑک ہے اور نیچے ریلوے لائن۔ ہمارے لیے اس پل کے ذریعے دریا پار کرنا ناممکن ہے، البتہ کشتی کا انتظام ہو جائے تو بہت آگے جا کر رات کے اندھیرے میں دریا عبور کر سکتے ہیں۔"

اسی طرح کی باتیں کرتے اور مختلف تجاویز پر بحث کرتے ہوئے ہم اونگھنے لگے۔ رات کے تین بجے تھے کہ مسلسل فائروں کی آواز سے ہم ہوشیار ہو گئے۔ یہ آوازیں گاؤں کی طرف سے آ رہی تھیں۔ پھر دستی بم پھٹنے کے دھماکے بھی سنائی دینے لگے۔ ان دھماکوں میں مردوں اور عورتوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

"گاؤں والوں پر آفت آ گئی۔" کریگ نے کہا۔ "جرمن آپ لوگوں کی تلاش میں آئے ہیں اور اب وہ جنگل میں نہ صرف آگ لگائیں گے بلکہ گاؤں کو بھی تباہ کر دیں گے۔ انہوں نے پہلے بھی دھمکی دی تھی کہ اگر کسی شخص نے اتحادی جاسوسوں یا مفرور قیدیوں کو پناہ دی تو گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔"

ہم اپنی کمیں گاہ سے آگ اور خون کا یہ کھیل دیکھنے کے لیے نکلے۔ گاؤں شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور اکّا دُکّا فائر کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جرمن ادھر آ جائیں؟"

"آج تک تو وہ ادھر نہیں آئے، دراصل انہیں دلدل میں گھستے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" بلجی نوجوان نے جواب دیا۔

"بہرحال اب ہمارا زیادہ دیر تک یہاں رُکنا خطرناک ہے۔" ڈک نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "آپ میں سے ایک صاحب چلنے پھرنے سے معذور ہیں، ان کے متعلق میں بڑا فکرمند ہوں۔"

"جناب! آپ میری فکر نہ کیجیے۔" زخمی نوجوان نے کہا۔ "میرے ساتھیوں کو کسی نہ کسی طرح اس منحوس جگہ سے نکال لے جائیے۔ زندگی رہی تو میں بھی ان سے آملوں گا۔"

"مجھے اس وقت جرمن زبان پر عبور نہ ہونے کا سخت افسوس ہو رہا ہے۔" ڈک نے کہا۔ "ورنہ ہم کبھی کے دریا تک پہنچ چکے ہوتے۔ زبان نہ جاننے کے سبب وردیاں اور یہ ہتھیار سب بے کار ہیں۔ ہم کسی بھی وقت چوہوں کی مانند پکڑے جا سکتے ہیں۔ ہم ان وردیوں کے باعث کسی حد تک بچ بھی سکتے ہیں، لیکن آپ لوگ کیا کریں گے؟"

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے بلکہ آپ کا "تعاقب" کریں گے۔" رینی نے کہا۔ "آپ کا کام صرف راستہ صاف کرنا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ جیٹی پر ایک بار پہنچ جانے کے بعد آپ کوئی نہ کوئی کشتی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

"کیا جیٹی کی نگرانی نہیں کی جاتی؟" میں نے پوچھا۔

"نگرانی تو کی جاتی ہے لیکن ہماری معلومات کے مطابق صبح چار بجے سنتریوں کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں۔ رات بھر کے جاگے ہوئے سنتری ویسے بھی غنودگی کے عالم میں ہوتے ہیں اور ان کی جگہ آنے والے ہمیشہ چند منٹ کی تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ یہی وہ چند منٹ ہیں جب جیٹی خالی ہوتی ہے اور اگر۔۔۔۔"

"شش۔۔۔۔ چپ ہو جاؤ۔" ڈِک نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی رائفل اٹھا کر تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بلجی نوجوانوں نے جلد جلد اپنی ضروری چیزیں سمیٹنا شروع کیں اور کریگ کو خود ساختہ سٹریچر پر لیٹ جانے کی ہدایت کی۔ یکایک ڈِک اندر آیا اور کہنے لگا:

"وہ اِدھر ہی آ رہے ہیں، ان کے ساتھ کتے بھی ہیں۔۔۔۔ جلدی کرو، یہاں سے نکل چلو۔"

پلک جھپکنے میں ہم تہہ خانے سے باہر تھے۔ رینی کی ہدایت کے مطابق ہم مشرق کی طرف بھاگنے لگے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور دُور مغربی اُفق پر بجلی چمک رہی تھی۔ بارش یقیناً ہونے والی تھی۔

"یہ سڑک قصبہ لی کروٹائے کی طرف جاتی ہے۔" رینی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ اور برزو اپنے زخمی ساتھی کا سٹریچر اٹھائے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ "ہم اس سڑک پر کہیں چھپ سکتے ہیں۔ جرمن اِدھر نہ آئیں گے، وہ سمجھیں گے کہ ہم شہر کی طرف نہیں جا سکتے، وہ شمال کی طرف جنگل کا رُخ کریں گے۔"

"میرا خیال ہے آج ہی جیٹی پر قسمت آزمائی کی جائے۔"

ڈِک نے کہا۔ "چار بجنے میں دیر ہی کتنی ہے اور اگر بارش شروع ہو گئی، تو ہمیں جیٹی تک پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی۔"

اب ہم صنوبر کے درختوں کے ایک گنجان جُھنڈ میں سے گزر رہے تھے۔ بجلی چمکتی، تو راستہ ایک ثانیے کے لیے نظر آتا اور پھر وہی گھُپ اندھیرا۔ ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے آگے ہی بڑھتے رہے۔ عقب میں کُتوں کے بھونکنے کی آوازیں ہماری رفتار اور تیز کر دیتی تھیں۔ ڈِک کی ہدایت پر ایک جگہ رُک کر ہم نے پیروں سے جُوتے کھولے اور ان کے تسموں کو گرہ دے کر گردن میں ڈال لیا۔ اِن جوتوں کی وجہ سے ہم بار بار پھسلتے تھے۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہَوا کے جھونکے مسلسل آنے لگے اور ابھی ہم نے ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور اس انداز میں شروع ہوئی کہ خدا کی پناہ ۔۔۔۔ بارش کے تھپیڑے برچھیوں کی مانند ہمارے چہروں پر پڑنے لگے، لیکن اب رُکنے کا موقع نہ تھا۔

"دریا قریب آ گیا ہے۔" رینی نے بتایا۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک دو منزلہ عمارت کی سب سے اونچی کھڑکی سے معمولی وقفوں کے بعد فلش لائٹ چاروں طرف پھینکی جا رہی ہے۔ دریا کی طرف سے بھی جواب میں اسی قسم کی روشنی نمودار ہوتی تھی۔

"آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔" ڈِک نے چہرے سے پانی کے قطرے پونچھتے ہوئے بلجی نوجوانوں سے کہا۔ "ہم کشتی کی تلاش میں جاتے ہیں، کشتی مل گئی، تو ہم میں سے ایک آدمی آپ کو بُلانے آئے گا۔ شاید ڈیوٹیاں بدلنے والی ہیں۔"

موسلا دھار بارش میں کریگ کا سٹریچر رکھ دیا گیا اور دونوں بلجی اس کے قریب بیٹھ گئے۔ ڈِک نے مجھے اور چارلس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور چند منٹ بعد ہم ہاتھ پیروں کے بل چلتے ہوئے اس عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔" ڈِک دبی آواز میں کہنے لگا۔ "مجھے کوئی سنتری نظر نہیں آ رہا۔ شاید وہ

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

بارش سے پناہ لینے کے لیے عمارت کے اندر چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔

وہ جیٹی نظر آ رہی ہے لیکن وہاں کچھ سپاہی موجود ہیں۔ جیٹی کے قریب کچھ لانچیں اور چھوٹی کشتیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ دریا پُوری طرح چڑھا ہوا ہے اور ہم اگر کامیاب ہو گئے، تو یقیناً بہت جلد سمندر میں داخل ہو جائیں گے۔"

اب ہم اس عمارت سے صرف تیس فٹ دُور گھاس میں لیٹے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ یکایک اس کے صدر دروازے سے ایک سپاہی نکلا اور جیٹی کی طرف چلا۔ پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا سپاہی بھی باہر آیا۔ انہوں نے برساتیاں پہن رکھی تھیں۔ جیٹی اور اس عمارت کا درمیانی فاصلہ ڈیڑھ سو گز سے زیادہ نہ تھا۔

"ڈیوٹی بدل گئی۔" ڈِک نے مضطرب ہو کر کہا۔ "یہ سپاہی جیٹی پر جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اُس وقت وہاں بھی چار ہی سنتری ہوں گے۔ اگر ہم انہیں راستے ہی میں جا لیں اور کچھ دیر تک ان پر قابو پا لیں تو پہرے دار سپاہی ٹھیک وقت پر جیٹی چھوڑ کر عمارت کی طرف آ جائیں گے۔ پھر ہمیں روکنے والا کوئی نہ ہو گا اور سورج نکلنے تک ہم ان کی قید سے آزاد ہوں گے۔" پھر وہ چارلس کی طرف مُنہ کر کے کہنے لگا: "تعجب ہے، فائر کی آوازیں جیٹی پر موجود سپاہیوں نے نہیں سُنیں۔ لو دیکھو، وہ ڈیوٹی ختم کر کے چل پڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دوسرے پہریدار وں سے راستے ہی میں مل لیں گے۔ تم دائیں جانب چکّر کاٹ کر جیٹی تک پہنچنے کی کوشش کرو، مَیں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ ٹاپرچ کا خیال رکھنا، سگنل کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔"

جیٹی والے سپاہی بلاشبہ اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے اور آہستہ آہستہ عمارت کی طرف جا رہے تھے، راستہ صاف تھا ہم کچھوؤں کی طرح رینگتے ہوئے جیٹی کی طرف بڑھنے لگے اور پانچ منٹ بعد ہم اس کے بالکل نیچے کھڑی ہوئی ایک جرمن لانچ میں کُود گئے۔ جس میں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ مَیں نے ٹاپرچ سے بار بار اپنے

تھا، وہ ہم سے بے خبر آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے کہ ہم نے پیچھے سے رائفلوں سے گُندے پُوری قوت سے دونوں سپاہیوں کے سر پر دے مارے، وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر ہو گئے۔ دونوں طرف سے گھومتی ہوئی فلش لائٹ، بجلی کی چمک اور موسلا دھار بارش کے باعث آگے جانے والے سپاہیوں کو پتا ہی نہ چلا کہ ان کے دو ساتھیوں پر کیا بیت گئی ہے۔ ہمیں یقین نہ تھا کہ اس آسانی سے یہ مہم سَر ہو جائے گی۔ ہمارے حوصلے بڑھ گئے۔ جیٹی اَب سو گز دُور تھی۔۔۔۔ اَب ہم اگلے دونوں سپاہیوں پر وہی حربہ آزمانے کے لیے بالکل مستعد تھے کہ یک لخت ڈِک کا پیر کیچڑ میں پھسلا اور وہ مُنہ کے بل گرا۔ اس کے گرتے ہی دونوں سپاہی پیچھے مڑے۔ اَب میرے لیے فائر کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ مَیں نے مشین گن سیدھی کی اور چند ثانیے کے اندر اندر انہیں بھُون دیا۔

"غضب کر دیا۔" ڈِک چلّایا۔ "تمہیں فائر ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا، تم تو خود جرمن وردی میں ہو، وہ بلاتحقیق تم پر فائر نہ کرتے اور اتنی دیر میں ہم ان پر قابو پا لیتے۔"

وہ کیچڑ میں سے اُٹھا اور جیٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ "تعجب ہے، فائر کی آوازیں جیٹی پر موجود سپاہیوں نے نہیں سُنیں۔ لو دیکھو، وہ ڈیوٹی ختم کر کے چل پڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دوسرے پہریداروں سے راستے ہی میں مل لیں گے۔ تم دائیں جانب چکّر کاٹ کر جیٹی تک پہنچنے کی کوشش کرو، مَیں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ ٹاپرچ کا خیال رکھنا، سگنل کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔"

جیٹی والے سپاہی بلاشبہ اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے اور آہستہ آہستہ عمارت کی طرف جا رہے تھے، راستہ صاف تھا ہم کچھوؤں کی طرح رینگتے ہوئے جیٹی کی طرف بڑھنے لگے اور پانچ منٹ بعد ہم اس کے بالکل نیچے کھڑی ہوئی ایک جرمن لانچ میں کُود گئے۔ جس میں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ مَیں نے ٹاپرچ سے بار بار اپنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ساتھیوں کو سگنل دیا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ صدیوں کی مانند گزر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد عمارت کی اوٹ سے جواب میں ٹارچ روشن ہوئی اور بجھ گئی۔

"یہ بلجمی انجینیر سارا کام خراب کر دیں گے۔ اُف . . . انہیں اب تک پہنچ جانا چاہیے، بخدا، میں دو منٹ سے زیادہ نہ رکوں گا، لانچ کا انجن سٹارٹ کر دو، وہ آ رہے ہیں۔"

کچھ فاصلے پر ہم نے چند سایوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا! ایک دو مرتبہ وہ فلش لائٹ کی زد میں بھی آئے اور ابھی وہ جیٹی سے پچاس گز دور تھے کہ عمارت پر لگے ہوئے سائرن چلا اُٹھے اور اتنی سرچ لائٹیں روشن ہو گئیں کہ دور دور تک کا سارا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ عمارت کے سائرن بجتے ہی دریا کی طرف سے بھی سائرن بجنے لگے اور پھر جیسے سینکڑوں مشین گنوں کے منہ کھل گئے۔ گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے دائیں بائیں اور اوپر سے گزر رہی تھیں اور ہم لانچ کے اندر لیٹے دل ہی دل میں بلجمی انجینیروں کو کوس رہے تھے۔ اگر چارلس ان کے ساتھ نہ ہوتا، تو ہم اتنی دیر میں لانچ کو لے کر کہیں کے کہیں نکل گئے ہوتے۔

اتنے میں بلجمی انجینیر آ گئے۔ انہوں نے پہلے سٹریچر لانچ میں پھینکا، پھر خود پھلانگیں لگا کر لانچ میں کود گئے۔

"چارلس کہاں ہے؟" ڈک نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

"وہ تھوڑی دیر پہلے ہمارے ساتھ تھا، غالباً اُسے گولی لگی ہے اور راستے میں پڑا ہوا ہے۔"

"کتنی دُور؟"

"قریب ہی ہے، اس نے کئی مرتبہ اُٹھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے آتے، مگر اس نے اُفتاد ہم پر تان لی اور کہا بھاگ جاؤ، ورنہ فائر کر دوں گا۔ اس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔" رینی تھرتھر کانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیا خیال ہے جیمز، لانچ چلا دی جائے؟" ڈک نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" میں چلایا۔ "میں چارلس کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا، وہ میرا پرانا دوست ہے، ہم اکٹھے ہی مریں گے۔" اور اس سے پہلے کہ ڈک مجھے روکے، میں لانچ سے باہر نکلا، برستی گولیوں میں جیٹی پر آیا اور چارلس کی تلاش میں دیوانہ وار دوڑا، لیکن اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چارلس مجھ سے بے خبر لنگڑاتا ہوا جیٹی کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اسے لانچ میں کودتے دیکھ لیا تھا۔ میرے بازو میں ایک گولی لگی اور میں جیسے تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

■■

جیمز ہارگیٹ کی خود نوشت داستان یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ گولی لگنے سے زخمی ہو کر وہ بے ہوش ہو گیا اور جرمنوں نے اسے پکڑ کر دوبارہ کیمپ میں بھیج دیا۔ وہ جنگ ختم ہونے کے بعد رہا ہو کر اپنے وطن پہنچا۔ اس دوران میں ڈک اور چارلس بخیر و عافیت لانچ سمیت اتحادیوں کے پاس پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔

اُردو میں ریڈیو پر معیاری کتابیں

ریڈیو، ٹیلی ویژن پر پھر ہلو مطالعہ کا عظیم سلسلہ "گھر بیٹھے دعوت کے اوقات میں ریڈیو ماہر بن کر اپنا مستقبل بہتر بنائیے۔ ایک وقت میں پانچ سبق دیئے جاتے ہیں۔ قیمت فی سبق: ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

"ریڈیو کوائل" (ہر قسم کی ریڈیو کوائل بنانے کے لیے) قیمت: چھ روپے
"ٹرانزسٹر" (ٹرانزسٹر ریڈیو کو سمجھنے اور مرمت کیلئے) قیمت: ۱½ روپے
"دولاکھ میرے ریڈیو مرمت" مرمت پر بہترین کتاب) قیمت ۳: روپے
"یونیورسل ریڈیو ریپیئر" ریڈیو مرمت پر معیاری کتاب) قیمت: ۴ روپے
ریڈیو کے راز چھ روپے ٹرانزسٹری پہلی کتاب از عسکر، قیمت: ۵ روپے

اسپیس ایج۔ ۶۵ وی مال (ریگل سنیما لین) لاہور

اُردو زبان میں فنی کتابیں لکھنے والے حضرات سے درخواست ہے کہ اگر کسی تکنیک یا فنِ جدید پر کوئی معیاری مسودہ تیار ہو یا لکھنے کا ارادہ ہو، تو مندرجہ بالا پتے پر ملیں یا خط و کتابت کریں۔

وقار عظیم
پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام

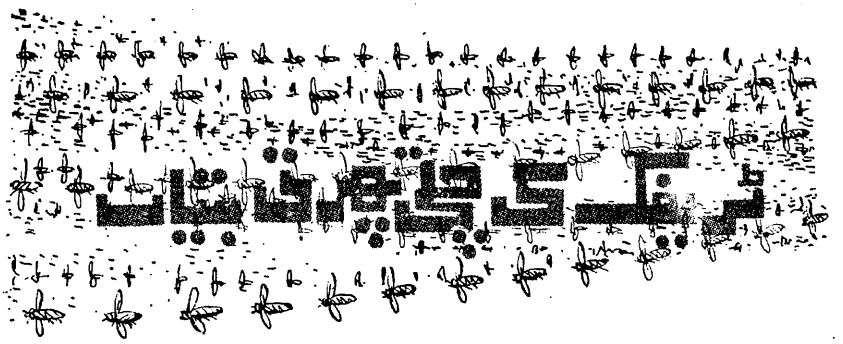

جگنو دنیا کے تقریباً ہر براعظم میں پایا جاتا ہے۔ زیادہ تر منطقۂ حارّہ میں ملتا ہے۔ شمالی امریکہ، برطانیہ، برازیل، کیوبا اور یورپ اس کے خاص مسکن ہیں، صرف آسٹریلیا میں اس کی بیس اور دنیا بھر میں دو ہزار سے زائد اقسام ہیں۔ بنیادی طور پر جگنو کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم چمکنے والا کیڑا GLOW WORM کہلاتی ہے۔ اس کی مادہ کے پر نہیں ہوتے اور یہ رات کے وقت زمین پر رینگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس نر اُڑ سکتا ہے۔ مادہ کے جسم سے تیز روشنی نکلتی ہے لیکن نر کے چمکنے والے اعضا بہت مدھم ہوتے ہیں بلکہ بعض اقسام میں تو سرے سے ہوتے ہی نہیں۔

دوسری قسم کو چمکدار مکھیاں FIRE FLIES کہتے ہیں۔ اس قسم کے نر اور مادہ دونوں اُڑنے کے ساتھ ساتھ چمکنے کی یکساں صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

شکل و شباہت میں نر جگنو کے جسم کا رنگ گہرا بھورا اور چھاتی زرد اور گلابی ہوتی ہے۔ اگر اس کے جسم کو آٹھ مختلف حصّوں میں تقسیم کیا جائے، تو چھٹے اور ساتویں حصّے میں پیٹ کی دونوں جانب دو بڑے بڑے سُرخ نشان ہوتے ہیں۔ یہی نشان جگنو کی روشنی کا منبع ہیں۔ سائنس دانوں نے خاصی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جگنو کے جسم میں دو کیمیائی مواد ہیں جنہیں لوسیفرین LUCIFERIN اور لوسیفریز LUCIFERASE کہا جاتا ہے۔ لوسیفرین "جگنو کی لالٹین" کے لیے تیل کا کام دیتا ہے اور ہوا سے آکسیجن ملتے ہی بھڑک اٹھتا ہے۔ لوسیفریز پروٹین جلنے کے عمل کو جاری رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لوسیفریز لالٹین کے لیے "پائپ لائن" بنتا ہے۔

جگنو کا نظامِ تنفس اور عصبی نظام روشنی پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جگنو سانس لیتا ہے، تو سانس کی نالی کے ذریعے ہوا اُس کیمیائی مادّے کو چھوتی ہے جسے لوسیفرین کہتے ہیں۔ ہوا لگتے ہی یہ مادّہ مشعلے کی صورت میں جل اُٹھتا ہے۔ سانس لینے کا عمل ہوا اندر لے جانے اور باہر نکالنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جگنو مسلسل ہوا اندر نہیں لے جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کا جسم کبھی روشن دکھائی دیتا ہے تو کبھی تاریک ــــ وہ تیز تیز سانس لینے لگے تو روشنی اور تاریکی کے درمیان وقفہ کم ہو جاتا ہے۔

جگنو کی اس روشنی کے بارے میں کئی اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ بعض ماہرینِ حیاتیات کا خیال ہے کہ نر جگنو روشنی پیدا کر کے مادہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، لیکن یہ نظریہ حقیقت پر مبنی نہیں کیونکہ بعض قسموں میں نر سرے سے روشنی ہی نہیں دیتے۔ گمانِ غالب ہے کہ جگنو کی روشنی ایک مدافعتی قوّت ہے جو اُسے کیڑے مکوڑے کھانے والے جانوروں سے بچاتی ہے۔ مثال کے طور پر رات کو اُڑنے والے شکاری پرندے، چمگادڑ، اُلّو وغیرہ جگنو کی روشنی سے خائف ہو کر اُسے ہڑپ کرنے سے

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

چمکچماتے ہیں۔

ہم موم بتی کے شعلے کو نہیں چھو سکتے، لیکن جگنو کو ہاتھ میں پکڑنے سے ہمارا ہاتھ نہیں جلتا۔ جگنو کی روشنی "سرد" ہوتی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس روشنی کو پیدا کرنے کے لیے بہت کم قوت صرف ہوتی ہے، اس لیے گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر جگنو کے سائز کی موم بتی روشن کی جائے، تو موم بتی سے پیدا ہونے والی گرمی، جگنو کی روشنی میں پائی جانے والی گرمی سے ۸۰۰۰ گنا زیادہ ہوگی۔

اس تجربے سے یہ نتیجہ بھی نکالا گیا ہے کہ جگنو کی روشنی اپنی جسامت کے برابر موم بتی کی روشنی سے دس گنا طاقتور ہوتی ہے۔

جگنو کے جسم سے پیدا ہونے والی روشنی کے لیے آکسیجن بہت ضروری ہے۔ ایک سائنس دان نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایک دلچسپ تجربہ کیا۔ اُس نے ایک جگنو پکڑا اور چمکنے والے اعضا علیحدہ کرکے پانی سے بھرے ہوئے شیشے کے ایک گلاس میں ڈال دیے۔ رات کا وقت تھا۔ کچھ دیر تو ان اعضا سے روشنی پیدا ہوتی رہی، پھر آہستہ آہستہ غائب ہوگئی۔ پانی میں ان اعضا کو ہوا میسر نہ تھی۔

اب ذرا اِس بھونرے کی "عام زندگی" پر نظر ڈالیے۔

جگنو دن بھر بدبودار ٹٹیوں، سیلی گھاس اور فصلوں میں چھپا رہتا ہے اور رات کے وقت باہر نکلتا ہے۔ ندی، جگہوں، باغوں اور لہلہاتے سبزہ زاروں میں عام ملتا ہے۔ جھیل، ندی اور دریا کے کنارے اس کی مرغوب ترین جگہ ہیں۔ اس کی خوراک گھونگھوں اور چھوٹے موٹے کیڑوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گوشت کھانے کا بہت رسیا ہے۔ دوسرے کیڑوں کو چبانے میں ماہر شکاری کی طرح داؤں پیچ لڑاتا ہے، چنانچہ شکار پھانسنے سے پیشتر اُسے بے ہوش کر لیتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے سرجن آپریشن سے پہلے مریض کو کلوروفارم سے بے ہوش کر دیتے ہیں۔ ایک سائنس دان نے جگنو کے شکار کو بے ہوش کرنے کا عمل جاننے کے لیے ایک دلچسپ تجربہ کیا۔ اس نے شیشے کے ایک گلاس میں سبز گھاس کے چند تنکے ڈالے اور ان پر ایک گھونگا رکھ دیا۔ ایک جگنو کو بھی گلاس میں چھوڑ دیا گیا۔ کمرے میں جلتی ہوئی بتی گل کرکے سائنس دان خوردبین کی مدد سے جگنو کا مشاہدہ کرنے لگا۔ جگنو کے دو جبڑے مچھلی پکڑنے والی کنڈی سے مشابہ ہوتے ہیں۔ ان اعضا کو وہ گھونگھے کے مُنہ پر مارنے لگا ــــ گھونگا "مست" ہوگیا۔ جگنو نے گھونگھے کے مُنہ پر تقریباً نصف درجن ضربیں لگائیں۔ بالآخر گھونگا مکمل طور پر بے ہوش ہوگیا۔ بعد کی تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ جگنو ان ضربوں کے ذریعے اپنے شکار کے جسم میں زہر داخل کر دیتا ہے۔ وہی سائنس داں ایک اور واقعہ بیان کرتا ہے۔ ایک مرتبہ جگنو گھونگھے کے جسم میں زہر داخل کرنے کے لیے اس کے "چٹکیاں" لے رہا تھا، سائنس داں نے گھونگھے کو اُٹھا لیا اور اس کے جسم میں چُبھو دی، مگر وہ بے حس و حرکت پڑا رہا، حالانکہ ابھی جگنو نے صرف پانچ مرتبہ اپنا "ہتھیار" استعمال کیا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں گھونگھے پر فوراً ہی پانی کے چھینٹے دے جائیں تو وہ ہوش میں آجاتا ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ جگنو اپنے جسم سے کئی گنا بڑے گھونگھے کو کس طرح کھاتا ہے۔ سائنس دانوں کے تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہو چکا ہے کہ جگنو اپنے شکار کو کھاتا نہیں، بلکہ "پیتا" ہے۔ جگنو کے مُنہ پر چٹے نما دو اعضا ہوتے ہیں۔ ان اعضا کی مدد سے وہ شکار کے جسم میں ایک لیس دار مادّہ داخل کرتا ہے۔ یہ مادّہ فوراً گیہرے کوڑے یا گھونگھے کے گوشت کو مائع میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اب جگنو اپنی "نلکیوں" کے ذریعے اِس مائع کو پی لیتا ہے۔

جگنو کی ٹانگیں چھوٹی چھوٹی اور تعداد میں چھ ہوتی ہیں، لیکن ٹانگوں کی مدد سے وہ درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔ قدرت نے اسے ایک عجیب و غریب عضو سے نوازا ہے جسے سائنسداں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"اُنگلیوں کا گچھا" کہتے ہیں۔ یہ سفید سفید عضو اس کی ٹانگوں کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ اُنگلیاں لچکدار ہوتی ہیں اور بوقتِ ضرورت انہیں ہر طرف موڑا جاسکتا ہے۔ یہ عضو ایک لیس دار مادّہ بھی خارج کرتا ہے جس کی مدد سے جُگنو دیوار یا درخت کی سطح سے چپک جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگتا ہے۔

مادہ جُگنو کی نسبت نر بہت حساس ہوتا ہے۔ نر کی قوّتِ سامعہ بھی مادہ کی نسبت تیز ہوتی ہے۔ ایک ماہرِ حیاتیات نے نر جُگنو کے پاس ذرا سا کھٹکا کیا۔ نر فوراً خطرے کو بھانپ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی "بتّیاں" بجھ گئیں جو یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ سانس روک کر صورتِ حال کا جائزہ لے رہا ہے۔ نصف منٹ بعد وہ تیزی سے اُڑ گیا۔ اِس کے برعکس، مادہ جُگنو کے قریب بندوق کا فائر کیا۔ کڑ واد دھواں چھوڑا، پانی کے چھینٹے دیے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

زمانۂ قدیم ہی سے انسان جُگنوؤں سے فائدہ حاصل کرتا چلا آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایزٹکس ASTECS نسل کے لوگ بید کی بنی ہوئی ٹوکریوں میں بہت سے جگنوؤں کو بند کر لیتے تھے اور راتوں کو سفر کے دوران میں اُن کی روشنی سے مدد لیتے تھے۔ ڈوری میں قبائل جُگنوؤں کو پکڑ کر انہیں تاگے کی مدد سے ہاتھ پاؤں کے ساتھ باندھ لیتے تاکہ جنگل میں سفر کرتے وقت اِن ننھے مُنّے چراغوں سے اپنا راستہ تلاش کر سکیں۔

جنوبی اور وسطی امریکہ کے بعض باشندے آج بھی جُگنو پکڑ کر تاروں سے بنے ہوئے پنجروں میں رکھتے ہیں۔ انہیں گنّے کے ٹکڑے اور قیمہ کھانے کو ملتا ہے۔ دن میں دو مرتبہ نیم گرم پانی سے انہیں نہلایا جاتا ہے۔ قومی تہواروں پر جُگنوؤں کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ خواتین اپنی دلکشی دوبالا کرنے کے لیے بھاری داموں پر جُگنو خریدتی ہیں اور انہیں دھاگے سے باندھ کر اپنے بالوں میں سجا لیتی ہیں۔ رات کے وقت یہ جُگنو اِس طرح چمکتے ہیں جیسے میرے جواہرات جڑے ہوں۔ جنوبی امریکہ

کے بعض لوگوں نے جُگنوؤں کی خرید و فروخت کو بطور پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

جگنو ایسے کیڑوں کا جانی دشمن ہے جو پھل دار پودوں کے لیے مُضر ہیں کیونکہ باغوں میں پودوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں کا قلع قمع کرنے کے لیے یورپ سے جگنو منگوائے گئے تھے۔ چند روز کے اندر اندر یہ جگنو تمام ضرر رساں کیڑے مکوڑے چٹ کر گئے۔

جُگنوؤں کے مختلف قبیلوں میں خاندانی محبّت نہیں ہوتی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ بعض اوقات تو یہ بیگانگی، حسد اور خاندانی عناد دو قبیلوں کے درمیان باقاعدہ جنگ کا رُوپ دھار لیتا ہے۔

مادہ جُگنو انڈے دینے میں بہت لاپروا ہوتی ہے — چلتے پھرتے یا پرواز کے وقت گھاس میں یا کسی درخت کے تنے پر انڈے دے کر اُڑ جاتی ہے۔ ان انڈوں سے خود بخود بچّے نکل آتے ہیں۔

عام طور پر جُگنو کی لمبائی نصف انچ سے زیادہ نہیں ہوتی، البتّہ جنوبی امریکہ اور پراگ میں ایک ایسا جُگنو پایا جاتا ہے جو تین انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ اِس جُگنو کے جسم سے بیک وقت سُرخ اور سبز روشنیاں نکلتی ہیں۔ سُرخ روشنی سر کی جانب سے اور سبز دُم کے نیچے سے پیدا ہوتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر کسی بوتل میں ایسے دس جُگنو ڈال دیے جائیں، تو یہ بوتل رات کے وقت ٹیبل لیمپ کا کام دے سکتی ہے۔

لمبائی کے اعتبار سے برازیل کا جُگنو دوسرے درجے پر ہے۔ یہ دو انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ تاریک کمرے میں ایک جُگنو کو کتاب کی سطروں کے ساتھ ساتھ گھما کر انسان بآسانی مطالعہ کر سکتا ہے۔ اِس جُگنو کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ تاریکی میں اس کے انڈے بھی چمکتے ہیں۔

■■

وقار عظیم
پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

زعفران کے پھول

خواجہ احمد عباس

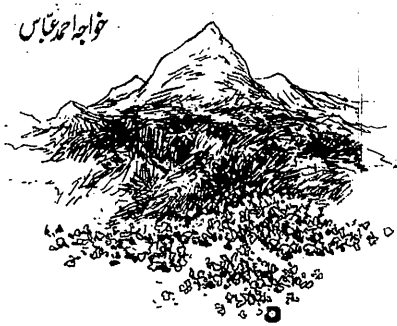

"آؤ مسافر، یہاں اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ میں ابھی پانی پلاتی ہوں..... وہ نیلی نیلی جو موٹر ہے نا تمہاری.. ..... پنکچر ہو گیا ہے..... کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے..... اب بیس کوس کی بات ہی ہے ..... نہیں بیٹا، مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہیئے اور پھر پیسہ لے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون..... اکیلی جان ہوں، دیدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں۔ چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے۔ پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی ہے اور چاہیے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن..... تم بھی کہتے ہو گے کس بکواس سے پالا پڑ گیا ہے.....

کیا کہا تم نے بٹیا؟..... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں۔ یہ زعفران کا کھیت ہے۔ ٹھیک کہتے ہو۔ زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔

پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں ..... اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ خدا کی قدرت ہے بٹیا، پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی..... موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں بٹیا، پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یونہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوان پر مہکے گی اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟..... پر کوئی نہ بتا پائے گا کیوں کہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا..... دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے..... ہے نا؟... پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟..... یا ابھی تمہاری موٹر کے ٹھیک ہونے میں دیر ہے اور تم وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟.... ... خیر جو بھی ہو سننا چاہتے ہو تو سنو.....

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں۔ پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کوئی متی تو بی دُلہن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوتی ہے۔ تمہاری طرح ایک اور مسافر بھی اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا۔..... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بے چارہ کھیت میں جا کر پھولوں کے پیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر سانس لینے ناک سے، جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو۔ بلکہ اُن کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا

"کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو؟"

تو جواب ملا

ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو....."

تو بیٹا تب پتا چلا کہ وہ بے چارا کتابوں میں پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ ہی آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے زعفرانی آگئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو لگی کھل کھلا کر ہنسنے اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا ہو گیا مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے تھم ہونے ہی میں نہیں آتے تو وہ بھی لگا ہنسنے۔ دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا، کیوں کہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

..... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں..... ہاں تو زعفرانی.... کیا کہا... زعفرانی کون؟ ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی۔ نہیں بتایا تھا؟... بھول گئی ہوں گی..... لو دیکھ لو یاد کا یہ حال ہے بیٹا..... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نورآں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی۔ لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ کدال مچایا کرتی تھی وہ زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا ہی وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے، زعفرانی زعفرانی۔

تم جانو نیچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں..... ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نورآں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھولوں کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں۔ مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی نظر آتی نہیں تھی۔ ایک تو دُبلی تھی جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید مجنوں۔ رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔

وید سے پھٹے ہوئے اوپر سے یہ کمبخت نام کو نہیں۔ نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما کو چوکڑی سے مطلب۔ میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی۔ وہ بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا میں سوچتی ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر وہاں تو جسے دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا..... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا۔

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے، یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ بھلا ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون سا بَر مل سکتا تھا؟..... میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کھل گئی..... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اسے جنّت نصیب کرے! اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہوگئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرض لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہوگئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے، زمین سے کیا ہوتا ہے۔ میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم بچی کو کون بیاہے گا۔

سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بُری۔ کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں، کبھی برف میں تباہ ہوجاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو انسان کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر بھی ظلم کرتے رہتے ہیں۔ راجہ پرجا کا کیا مقابلہ؟ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہوتی جاتی ہے۔ مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے..... کئی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا نورو چلّاتا ہوا آیا۔

ماں ماں! شیر کشمیر آئے ہیں۔ شیر کشمیر

بس اتنا کہہ کر یہ جا وہ جا۔ میں چلّاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آویں..... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے... کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جارہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہوگا تبھی تو تو تیں بچے بھی نڈر ہو کر جارہے ہیں چلو میں بھی تماشا دیکھوں۔

وہ نقشہ آج تک یاد ہے۔ مجھے گاؤں کے اس سرے پر..... ارے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے..... ایک اسکول ہے..... اب تو مڈل کا میاب ہوگیا ہے پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی..... ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں اور سامنے نہ شیر تھا نہ چیتا۔ ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترہ پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لوجی یہ تھا شیر کشمیر..... میں نے کہا تو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر ہے کوئی معمولی چیز کا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔ بھلا آفیسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں جس طرح وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا نوار کھ کے بھونپو والا باجا بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو ملے گی اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہوگئی، پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا اور اگر چلنے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی یا اللہ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھانا چاہیے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سُنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں کھڑی تھی۔

میں اس کا ہاتھ گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کر اس کے باپ سے ایسا بٹواؤں گی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سُن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں تم تو جانتے ہی ہو تلاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو تو سارے پانی میں ہل چل مچ جاتی ہے تو بیٹا یہ شیر کشمیر بھی ایک ایسا ہی پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، آرام اور چین صلح اور شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین، جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت، ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں اس کو بدلنے پر تُلا ہوا۔ میں کہتی ارے تمہارے باپ دادا نے بھی اپنی عمریں انہی راجوں مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے رُوکھی سُوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں۔ تم میں کون سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تُلے ہو..... پر میری کون سنتا ہے بیٹا..... وہ تو شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا..... تم میری باتوں سے اُلٹا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گئے ہوتا ؟ وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں ہاں بٹیا اسی کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کہتے ہوگے یہ کہاں کا بھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے ٹھہرے ہوتے شانت تلاؤں میں شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے .... یہ کیسے ؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا اب سب اس کی سکھائی پڑھائی کی باتیں بھول جائیں گے اور گاؤں میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی ان کی گرفتاری پر اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصّے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں اور ایسی باتیں کرنے والوں میں میرے لڑکے سب سے آگے آگے تھے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہی اچھا ہوا نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو بُرا بھلا کہتے رہتے اور زمیندار یا کوئی سرکاری افسر نہ لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

جب تک باپ زندہ رہا بیٹے کچھ قابو میں رہے۔ اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی۔ بڑا غلام نبی کہنے لگا میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا اس سے تو بہتر ہے سری نگر گمرگ میں مسافروں کا سامان اٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا مگر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا۔ اس کے چھ مہینہ بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہنچا مشکل سے بھی زیادہ پہلی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ماتھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڑھا جہاں بوجھ سنبھالنے کے لیے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانستا کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہوگئی تیری؟ کیا بیمار ہے؟ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسا گڑھا تو پڑا رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن ننگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش

آ گئی بھیگنے سے زکام کھانسی ہوگئی۔ چار دن بعد جب وہ ننگ مرگ گیا تو منجھلا نور بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نور کو گئے ہوئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آ کر کہا، غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا منجھلا بیٹا نور شیخ عبداللہ کی پارٹی میں شامل ہوگیا ہے دن کو کشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسے میں جا کر تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا بی منیڈ کی کو بھی زکام ہوا۔ وہ شیر کشمیر تو ناپہلے سے سُنتا تھا پہلے اس کسانوں کے چھوکرے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا نہ میں اس کی ماں۔.....

زعفرانی تو میں اس کا ذکر کرنا ہی بھول گئی تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون؟ بس میں، زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی من بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں اور یہاں آوّل تو آمدنی ہی صفر تھی، اِدھر سُنا سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہوگئی مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھیے۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر کبھی جنگل سے لکڑیاں چُن لاتے کبھی پانی بھرتے، کبھی اُون کاتتے تب جا کے دو وقت چولھا جلتا۔ میں نے کہا غفورا دس برس کا ہوگیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پر لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں ہم تو غفورے کو مدرسہ پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہوگئی ہے، پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سُنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسہ میں داخل کروا آئی جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں۔ پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دُکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہوگئی۔ مگر میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسہ گیا ہے۔ اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی۔..... پر بیٹی اس لونڈیا پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا۔ دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ..... مدرسہ سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر پڑھو، حساب کا سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جایا کرے۔ وہ کہ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے..... جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے

بیٹیا وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں..... بیس اکیس برس کی لڑکی پتھر شکل وصورت میں حُور کا بچہ نہیں تھی تو کانی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے شہر جا کر سینما بائیسکوپ ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کر کتنے آوارہ ہو گئے ہیں۔ ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آ رہی ہے زار و قطار روتے ہوئے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تو کچھ جواب نہیں دیا۔ روئے چلی جا رہی ہے۔ اری کم بخت کچھ کہے گی بھی، کیا ہوا کسی نے مارا، گالی دی، چوٹ لگ گئی۔ آخر کیا ہوا؟ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی۔ بیٹیا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہو گی۔۔ کہنے لگی...

ماں میرا بیاہ کر دو۔ اور پھر رونے لگی۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چُن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر ارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہوس دل میں تھی۔..... میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی اور جب ذرا ہچکیاں رُکیں تو یہی کہتی:

ماں میرا بیاہ کر دو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی.....

اب تم ہی بولو بیٹیا غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب بڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے..... پھر بھی میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے تو یہ فکر دُور ہو جائے مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرض ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک آدمی ایک دن آیا۔ شکل وصورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ وہی ماتھے پر پٹے کا نشان۔ عمر تیتیس کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا:

غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمدو۔ یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا:

غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں۔

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمدو کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر پوچھا: کہو غلام نبی کا کیا حال ہے وہ نہیں آیا۔

محمدو کے گلے میں آواز پھنسی معلوم ہوتی تھی ٹھہر ٹھہر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

"ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اسے دِق ہو گئی تھی۔" اور بس چپ ہو گیا۔

..... بیٹیا تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیجے کا ٹکڑا کاٹ کر کسی نے نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی الٹی کھانستا ہوا مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے۔

میرا تو بہ حال ہوا سو ہوا۔ زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا، چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی فکر اور بھی بڑھ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار رہتی کہ پڑھ۔ تختی لکھ، مدرسے کا کام کر۔ گھڑی بھر کھیلنے کو بھی نہیں دیتی۔ جیسے اسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدّے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اسے نہ جانے کیوں؟ ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی کے بھائی کے آخری ایام کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔ کب اور کیسے بیمار پڑا۔ علاج ہوا یا نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دقت ہو جاتی ہے؟

اور جب محمدو نے کہا:

"ہاں بہت سوں کو" تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا:

تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟..... نہ جانے کیوں... میرے کہنے سے محمدو یہاں تین دن اور ٹھہرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا:

"کیوں محمدو! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا

چھوڑ کر کیا کروں گا ماں جی۔ اور کوئی کام آتا نہیں ہے اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے، نہ ماں نہ باپ۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔

اور بیوی؟

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

کب کی مر گئی۔

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں پر میں نے کہا:

دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟

اس کو تین دن میں ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھرّیاں پڑ گئیں۔

مجھ سے کون بیاہ کرے ہے ماں جی!

لو بیٹا، یوں زعفرانی کا بیاہ محمدو سے طے پایا۔

... کیا کہا زعفرانی کی رائے؟ بیٹا تو بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمدو اسے بیاہنے آئے گا تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سُن کر خوش ہو گئی، بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا

دُور ہو گئی ہے۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بیٹا ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمدو آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دُھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھُولدار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کی کشمیری عورتیں بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں مگر اس شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں یہاں تک کہ زعفرانی بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر ویر سے تو ڈرے میری بلا، پر عورتیں بھی شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے سوچا میں ہی کیوں نکّو بنوں سو میں نے سلوائی۔ اتنا غصّہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کم بخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے۔ مجھے کیا پتہ۔ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا.... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا، پر یہ ضرور سالہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر کرنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمدو اور اس کے ساتھی برات لائے ہوں۔ مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر لال بنا ہوا تھا لیے شیر کشمیر زندہ باد، ڈوگرا راج مُردہ باد کہتے پھر رہے تھے اور ہمارا غفورا اچھا انیٹوں کا چبوترہ بنائے سیفدکھریا سے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا اور زور زور سے بچے پڑھتا جاتا تھا۔

ک۔ ش۔ م۔ ی۔ ر چھوڑ دو..... اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی کہ جیسے اس نے ایک بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلّانے کی آوازیں آئیں جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خالی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی اور اس میں سے سپاہی کود کر بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے۔ میں دیوار کی طرف دوڑی جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا ہوا کھرپا مٹی سے لکھ رہا تھا۔ غفورا اب نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھرپا کا ٹکڑا تھا۔ میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انتہ کرسی کو دُہراتے رہے جنہیں وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ک۔ش۔م۔ی۔ راور ابھی انہیں کہہ پایا تھا کہ کڑاہٹ کے ساتھ ہچکی آئی اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی۔

اور اس کے بعد کیا ہوا بیٹا یہ مجھے ایسا یاد ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جاتے۔

..... زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنوں سے مثی جلتی ہوا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں۔ آنسوؤں کا نام نہیں تھا نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سُلگ رہی تھی ..... اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں اور عورتوں میں سب سے آگے آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ اور یہ سارا مجمع گاہے ہوتے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

.... بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف، ان عورتوں کی طرف، زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں .....

..... ایک تڑاخہ دس بار تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری، جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے۔ میں ادھر بھاگی۔ پر جب تک میں پہنچوں زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی۔ عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کے بجائے خون مٹی میں مل رہا تھا اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا:

"میرا بیاہ ہو گیا ماں"۔

..... یہیں اس کھیت میں جہاں تم اب گُل لالہ کی طرح سُرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو"۔

سُن لی بیٹا تم نے میری کہانی؟ ..... پر تم کہاں ہو..... چلے گئے نا تم ..... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سن پاؤ گے۔

موٹریں تو اس سڑک سے گزرتی ہی رہتی ہیں بیٹا، پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں، تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں، پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی، یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آجائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندیں جیسے شگوفے سکھا کر دسو دیہ بھیج دیے جائیں گے اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوان پر مہکے گی اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے!..... پر کوئی نہ بتا پائے گا کیوں کہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

■ ■

فیصلہ کُن قوت

نیکی کی قوتیں دائمی اور لازوال ہیں۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بُرائی کی قوتیں عارضی اور فانی ہیں۔ وہ اُبھرتی ہیں اور اُبھر کر ختم ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی بُرائی کی قوتوں کو غلبہ ملتا ہے وہ اپنی فانی ہستی کو بھول کر خدا کی مخلوق پر ظلم کرتی ہیں۔ ایسے میں قدرت نیکی کی قوتوں کو شر کی سرکوبی کے لیے مامور کرتی ہے۔ نیکی کی قوتیں بظاہر کمزور اور ظاہری شان و شوکت سے محروم نظر آتی ہیں لیکن انجام کار وہ بُرائی کو ملیا میٹ کر دیتی ہیں۔

پاکستان ویب آئیٹ ڈاٹ کام

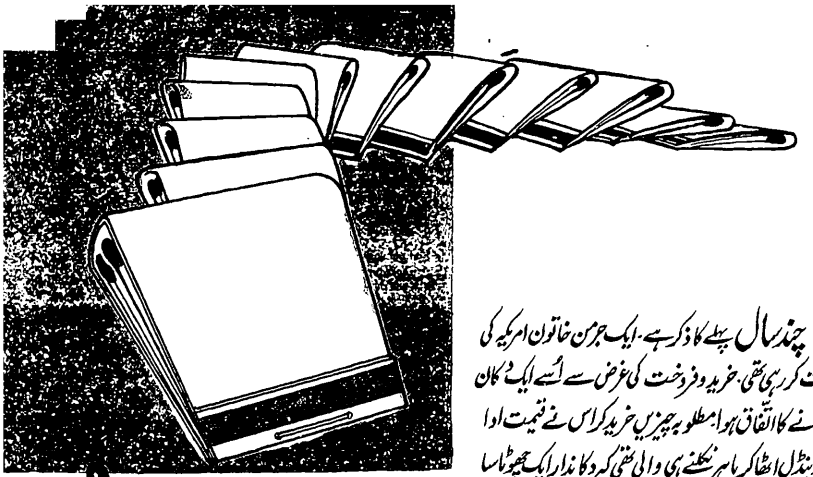

ماچس

چند سال پہلے کا ذکر ہے۔ ایک جرمن خاتون امریکہ کی سیاحت کر رہی تھی۔ خرید و فروخت کی غرض سے اُسے ایک دُکان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مطلوبہ چیزیں خرید کر اس نے قیمت ادا کی اور بنڈل اٹھا کر باہر نکلنے ہی والی تھی کہ دکاندار ایک چھوٹا سا خوبصورت پیکٹ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولا:

"محترمہ، یہ بھی لیتی جائیے۔"

خاتون نے مڑ کر دیکھا۔ ایک پیکٹ میں گتے کی بنی ہوئی پانچ ماچسیں رکھی تھیں۔

"شکریہ، مجھے ماچسیں نہیں چاہییں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"رکھ لیجیے، ان کی قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

دکاندار کی بات سُن کر خاتون کچھ حیران سی رہ گئی۔ جرمنی میں پانچ ماچسوں کی قیمت تقریباً تین امریکی سینٹ تھی، لیکن یہاں یہ مُفت مل رہی تھیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دُنیا کا غالباً واحد ملک ہے جہاں ماچسیں مفت ملتی ہیں۔ تمباکو، سگریٹ اور ادویات بیچنے والے، ہوٹلوں کے کیشیر، کاروباری ایجنسیوں کے میزبان کلرک، آپ کو بلامعاوضہ ماچسیں پیش کریں گے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں ہر سال ..... ۱۲۵ ماچسیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ ماچسیں کہاں سے آتی ہیں۔ دراصل کاغذی ماچسیں چلتے پھرتے اشتہار ہیں جو مختلف کمپنیاں اپنی اپنی مصنوعات کو عوام میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے لیے تقسیم کرتی ہیں۔ دھوبی دُھلے ہوئے کپڑوں کے پیکٹ میں ایک ماچس رکھ دے گا جس پر اس کی دکان کا نام اور پتا چھپا ہوا ہے۔ جنرل سٹور والا آپ کو سامان بھجوائے گا، تو ساتھ میں ایک ماچس بھی ہوگی۔ اس ماچس پر اس کی دکان کا اشتہار ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے کاروباری اداروں سے لے کر بڑے کارخانوں تک، ہر تنظیم اپنے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کاغذی ماچسیں بنواتی ہے اور عوام میں مفت تقسیم کرتی ہے۔ نیویارک کے ہر شہری کو اکثر و بیشتر ڈاک کے ذریعے ماچسیں ملتی رہتی ہیں۔ کاروباری ادارے ہر ممکن طریق سے لوگوں کے پتے جمع کرتے ہیں اور ماچسوں کی صورت میں اپنے اشتہار بھیج دیتے ہیں۔ بچوں کی پیدائش پر ہر شخص کو بچے کا نام وغیرہ درج کروانا پڑتا ہے۔ بچوں کے لیے ادویات اور دوسرا سامان تیار کرنے والی کمپنیاں یہ پتے حاصل کر لیتی ہیں اور شادی شدہ جوڑوں کو ڈاک کے ذریعے "مبارکباد کی ماچسیں" بھیجتی ہیں۔ ان کاغذی ماچسوں پر مبارکباد کا مضمون پہلے سے چھپوا لیا جاتا ہے۔

بعض کاروباری ادارے ماچسوں پر صرف اشتہار ہی نہیں دیتے، بلکہ اپنی تیار کردہ کسی خاص چیز کا نمونہ بھی ساتھ شامل کر دیتے ہیں۔ گلٹ بلیڈ پہلے پہل عوام میں ماچسوں کے ذریعے متعارف ہوا۔ گلٹ بلیڈ فیکٹری نے ایسی پچاس کروڑ ماچسیں تقسیم کی تھیں جن میں نمونے کا ایک ایک بلیڈ رکھا گیا تھا۔ نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے اور صرف چند ہفتوں میں گلٹ بلیڈ عوام و خواص تک پہنچ گیا۔ بلیڈ کے علاوہ بعض دوسری فیکٹریاں بھی ماچسوں میں نمونے کی چیزیں شامل کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر سر درد، بخار اور کھانسی کی گولیاں، کاغذی ماچس کے ساتھ چپکا دی جاتی ہیں — بُو سنے والا گوند، میٹھی ٹکیاں اور ٹافیاں تیار کرنے والے بھی اپنی اپنی چیزیں کاغذ کی خوبصورت پیکنگ میں ماچسوں کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں عطر تیار کرنے والی ایک فرم نے ایک لاکھ کاغذی ماچسیں مفت تقسیم کیں جن کا بیرونی کاغذ خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بعض لوگوں نے انفرادی طور پر کاغذی ماچسوں کو اپنی مطلب براری کے لیے استعمال کیا۔ یہ لوگ ماچسوں پر اپنی تکلیفیں اور حاجتیں مضمون کی صورت میں چھپواتے اور انہیں گلیوں اور بازاروں میں تقسیم کر دیتے۔ مخیّر لوگ ماچس پر لکھے ہوئے پتے پر امدادی رقوم بھیج دیتے۔

خیال ہے کہ امریکہ کی تقریباً اڑھائی لاکھ فرمیں ہر سال کاغذی ماچسوں کی تیاری پر دو کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر خرچ کرتی ہیں۔ ماہرینِ صنعت و تجارت کا اندازہ ہے کہ یہ رقم کئی گنا زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے۔ ہر ماچس میں کاغذ کی بیس دیاسلائیاں ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر ماچس کو کم و بیش بیس مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے۔ معمولی سی رقم کے عوض اگر کوئی شخص آپ کا اشتہار بیس مرتبہ پڑھ لے، تو یہ سودا ہرگز مہنگا نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار "اشتہاری ماچسوں" میں سے صرف ایک ماچس استعمال کے بغیر پھینکی جاتی ہے، باقی ۹۹۹ ماچسیں باقاعدہ استعمال میں آتی ہیں۔ آیئے ہم اس صنعت کا شروع سے جائزہ لیں۔

آج سے ۷۶ سال پہلے فلاڈلفیا میں جوشوا پوسے نامی ایک وکیل رہتا تھا۔ پوسے بہت نازک طبع انسان تھا۔ اس دور میں لکڑی کی بنی ہوئی ماچسوں کا رواج زیادہ تھا، جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ہے۔ یہ ماچسیں جسامت میں موجودہ ماچسوں سے بڑی تھیں اور جیب میں رکھنے سے اچھا خاصا بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ ایک روز یونہی بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا کہ کاغذ لکڑی سے کم جگہ لیتا ہے اور زیادہ تیزی سے جلتا ہے۔ آخر لوگ کاغذ کی دیاسلائیاں کیوں استعمال نہیں کرتے۔ تھوڑی سی کوشش کرنے پر وہ ماچس فیکٹری سے مسالا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو عام دیاسلائی کے کنارے پر لگایا جاتا ہے۔ قینچی کی مدد سے اس نے کارڈ بورڈ سے پچاس چقماقیں کاٹیں اور انہیں مسالے میں ڈبویا۔ تجربہ کامیاب رہا۔

۲۶ ستمبر ۱۸۹۲ء کو اس نے یہ اچھوتا خیال واشنگٹن انڈسٹریز ایکٹ کے تحت پیٹنٹ کرا لیا۔ ڈائمنڈ میچ وہ پہلی فیکٹری تھی جس نے پوسے کی ایجاد کو دس ہزار ڈالر میں خرید لیا۔

۱۸۹۴ء میں ڈائمنڈ انڈسٹری نے کاغذی ماچسیں بنانا شروع کیں۔ یہ دیکھ کر کمپنی کے کارپرداز حیران رہ گئے کہ لوگ لکڑی کی بنی ہوئی ماچسوں کے بجائے کاغذی ماچسیں خریدنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان ماچسوں کو عوام میں روشناس کرانے کا سہرا ایک کاروباری ایجنٹ ہنری ٹراٹ کے سر ہے۔ ہنری ایک اٹھائیس سالہ نوجوان تھا اور سارے علاقے کا مشہور و معروف سیلز مین تھا۔ ڈائمنڈ انڈسٹری نے اس کی خدمات حاصل کیں۔ ہنری ٹراٹ نے حتی المقدور کوشش کی، لیکن دکاندار کاغذی ماچسیں خریدنے پر تیار نہ تھے۔ اس نے پرانے تعلقات کا واسطہ دیا، دلائل سے قائل کرنا چاہا، طرح طرح کے سبز باغ دکھائے، زیادہ کمیشن کا لالچ دیا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ڈائمنڈ انڈسٹری سے معاہدہ کیے اسے پندرہ دن سے زائد ہو چکے تھے، لیکن ابھی تک

وہ ایک ماچس بھی فروخت نہیں کر سکا تھا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان حال تھا۔ ایک شام ڈراما دیکھنے کی غرض سے وہ میٹرس اوپرا کمپنی چلا گیا۔ ٹکٹ خریدنے والوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں، وہ بھی ایک قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اگلے ڈرامے کے اشتہار تقسیم کیے جا رہے تھے۔ گرمی بہت تھی۔ ٹراٹ کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک شخص نے اشتہار کے کاغذ کو دوہرا کیا اور پنکھا کرنے لگا۔ پہلے کوئی شخص ان اشتہاروں پر توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بیسیوں لوگ اشتہاروں کو دستی پنکھے کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ ایک خیال بجلی کی طرح ٹراٹ کے ذہن میں آیا۔ وہ ڈراما دیکھے بغیر بھاگم بھاگ ڈائمنڈ کمپنی کے دفتر پہنچا۔ میز پر مختلف اخبار اور رسائل بکھرے پڑے تھے۔ اس نے جلد جلد ایک اخبار کی ورق گردانی کی اور بالآخر اسے مطلوبہ شے مل گئی۔ یہ چٹنی تیار کرنے والی ایک فیکٹری کا اشتہار تھا۔

"یہ اشتہار ماچس کے بیرونی کاغذ پر شائع کر دو۔" اس نے اشتہار کاٹتے ہوئے منیجر سے کہا۔

اگلے روز اسے ماچسوں کا ایک پیکٹ مل گیا جن پر پکس چٹنی کا اشتہار تھا۔ وہ فوراً ہی نیکس فیکٹری پہنچا۔ فیکٹری کے مینیجنگ ڈائریکٹر سے ملنے میں اُسے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ماچسوں کا پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے اس نے بڑے اعتماد سے کہا:

"دیکھیے صاحب، آپ اخبار میں اشتہار دیتے ہیں۔ اخبار زیادہ سے زیادہ لوگ ایک دفعہ پڑھتے ہیں اور ہر شام ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔ اگر آپ یہی اشتہار کاغذی ماچسوں پر چھپوائیں اور یہ ماچسیں مفت تقسیم کریں، تو ہر شخص انہیں خوشی خوشی لے گا،

ایک ماچس میں بیس دیا سلائیاں ہیں، یعنی کم از کم بیس مرتبہ ہر آدمی آپ کا اشتہار پڑھنے پر مجبور ہو گا۔"

خاصی بحث و تمحیص کے بعد ٹراٹ کامیاب ہو گیا۔ اسے بیس ہزار ماچسوں کا آرڈر مل گیا تھا۔ اگلے ایک ہفتے میں اسے تمباکو تیار کرنے والی تین فرموں سے کوئی تین کروڑ ماچسوں کے آرڈر ملے۔ ڈائمنڈ کمپنی نے نئی مشینری خریدی جس کی مدد سے ایک گھنٹے میں ایک ہزار ماچسیں تیار ہوتی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ کاروبار بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ ٹراٹ کو نمونے کی ماچسیں تھیلے میں رکھ کر سڑکوں کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہ رہی۔ اب اسے گھر بیٹھے روزانہ بیسیوں آرڈر مل جاتے تھے۔

آج کل صرف امریکہ میں بارہ لاکھ سے زائد افراد مشغلے کے طور پر کاغذی ماچسوں کے بیرونی لیبل جمع کرتے ہیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں کے بعد یہ عوام کا دوسرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ پہلی کاغذی ماچس کا لیبل آج تک موجود ہے۔ یہ بہت خستہ حالت میں ہے۔ ۱۸۹۵ء میں شائع شدہ اس لیبل کی صرف ایک کاپی بنک میں محفوظ ہے۔ یہ لیبل جس کمپنی کی ملکیت ہے، اس نے یہ ماچس ۲۵ ہزار ڈالر میں خرید لی تھی۔

سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہتر مشینری بھی معرضِ وجود میں آئی ــــ چنانچہ آج کل ماچسوں کی فیکٹریاں ایک گھنٹے میں اوسطاً اسی ہزار ماچسیں تیار کرتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں ہر شخص سال میں تین ہزار ماچسیں استعمال کرتا ہے جن میں سے اسی فیصد مفت ملتی ہیں۔

میں نے دیکھا کہ خوشی ہو یا رنج، دونوں روح کو امتحان میں ڈالتے ہیں۔ اس امتحان میں خدا پر بھروسا ہی کام آتا ہے۔ عقل سے تو شاید خدا کا وجود کوئی ثابت نہ کر سکا، لیکن جس دل کی گہرائیاں خدا کے وجود کی شاہد ہوں، وہ آزمائش میں شکست نہیں کھاتا، اس لیے نہیں کہ ایسی حالت میں خوشی یا رنج کا دل پر اثر نہیں ہوتا، بلکہ اس وجہ سے کہ خدا پر بھروسا اس کا توازن درست رکھتا ہے۔

(ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی)

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

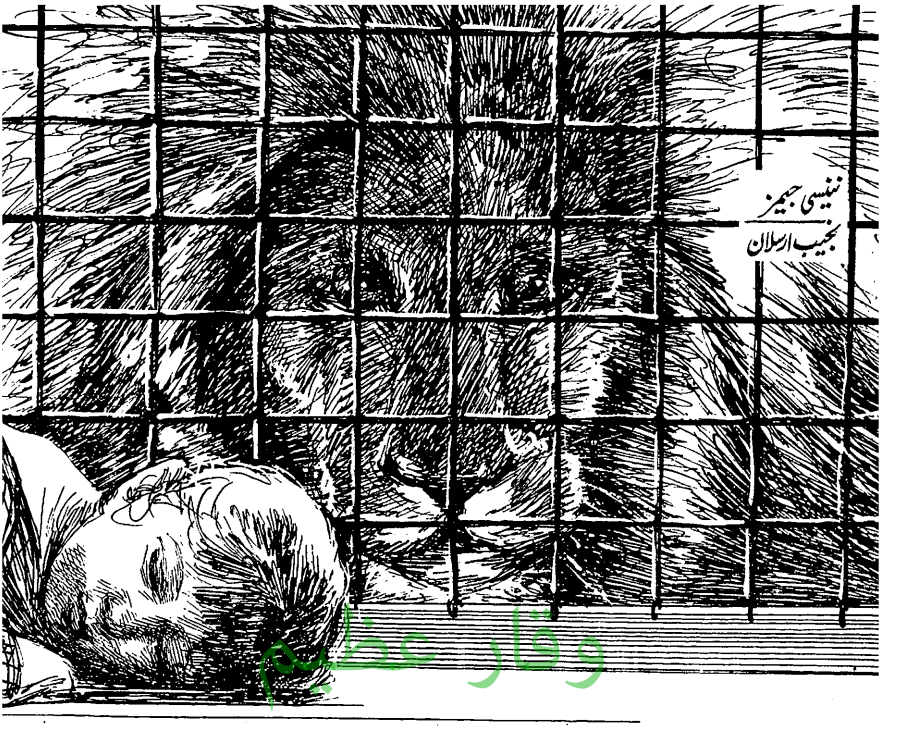

تنیسی جیمز
نجیب ارسلان

وقار عظیم

پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام

اُس روز شام ہی سے سرد ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کھانے کے فوراً بعد میں نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے اور کیرل کو ساتھ لے کر خواب گاہ میں چلی گئی۔ ننھی کیرل مُصر تھی کہ روز کی طرح پارک میں گھومنے چلیں۔ مگر سردی بے انداز تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں اُسے بُخار نہ ہو جائے؛ چنانچہ میں نے سمجھا بُجھا کر اُسے سونے پر راضی کر لیا۔ بستر میں لیٹ کر اس نے معمول کے مطابق دعا مانگنے کے لیے دونوں ہاتھ اُٹھائے۔ میں اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑی تھی اور شیشے میں سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔

"امّی، کیا یہ سچ ہے کہ خدا بچّوں کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے؟" کیرل نے دفعتاً پوچھا۔

"ہاں بیٹی۔" میں نے مختصر سا جواب دیا اور کھڑکی میں رکھی ہوئی چیزیں اُٹھانے لگی۔ باہر بارش ہونے لگی تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں پانی اندر نہ آ جائے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے کیرل کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر دوزانو بیٹھی تھی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ خدا کی بارگاہ میں پھیلے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ میں بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جانے آج وہ کیا دعا مانگنے والی تھی۔

"خدایا، میرے ابّی جہاں کہیں بھی ہوں، میرے پاس آ جائیں۔ اب میں ایک پل بھی ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یہ آج کیرل کو کیا ہو گیا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں نے قریب رکھی ہوئی ایک کرسی کا سہارا لیا اور گرتی پڑتی پلنگ تک پہنچ گئی، آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرے کا ایک لامحدود سمندر تھا۔ کہیں روشنی کی کرن نہ تھی، میرا دل نیچے ہی نیچے ڈوب رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے گلے میں کیرل کے بازو محسوس ہوئے۔

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"امّی، آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں بیٹی، تم سو جاؤ۔"

"لیکن آپ تو رو رہی ہیں ـــــ مجھے نیند کیسے آسکتی ہے؟" وہ فوراً بولی۔ شاید اُس نے میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے۔

مَیں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے اُسے بستر میں لٹا کر کمبل اوڑھا دیا اور بتی بُجھا کر کہانی سنانے لگی۔ خدا خدا کر کے کیرل کی آنکھ لگی۔ میں اُٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ باہر ابھی تک مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بجلی چمکتی، تو سارا ماحول روشن ہو جاتا۔ مَیں نے ٹیبل لیمپ جلایا اور اپنے اندر کے طوفان کو روکنے کے لیے کیرل کا فراک سینے لگی۔ خیالات کا ایک ہجوم تھا جو ذہن میں اُمنڈا چلا آ رہا تھا۔ مجبُور ہو کر مَیں نے فراک ایک طرف رکھ دیا اور کُرسی میں نیم دراز ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے میں بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں کھو گئی۔

جم میرے بچپن کا ساتھی تھا اور میرا چچا زاد بھائی بھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھیلے، ایک ہی سکول میں پڑھے اور ایک ہی محلّے میں پرورش پائی۔ میری عمر سترہ سال تھی جب ابّا جان دفعتاً اس دنیا سے چل بسے، امّی پہلے ہی سے بیمار تھیں۔ ابّا کی اچانک موت کا غم انہیں بھی مجھ سے دُور لے گیا۔ جم اُن دنوں حصولِ تعلیم کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ لوٹا اور مجھے ہر ممکن طریق سے تسلّی دینے لگا ـــــ ہمارا گھر ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا ـــــ امّی اور ابّا کی وفات کے بعد اکیلے گھر میں مَیں تنہائی محسوس کرتی تھی۔ جم نے تجویز پیش کی کہ مَیں اس کے ساتھ شہر چلوں۔ اگلے روز قصبے ہی میں چند عزیزوں اور دوستوں کی موجودگی میں ہماری شادی ہو گئی اور

میں جم کے ساتھ شہر آ گئی۔

شادی کے پہلے تین سال کچھ اس طرح گزر گئے کہ کوشش کے باوجود میں انہیں بیان نہیں کر سکتی۔ ہمارا چھوٹا سا گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کے دُکھ اور سُکھ کے ساتھی تھے۔ کیرل کی پیدائش نے ہماری محبت کو اور مستحکم کر دیا تھا۔ جم ایک شفیق باپ اور مہربان شوہر تھا۔ مجھے اس گھر میں زندگی کی تمام خوشیاں حاصل تھیں۔ ان دنوں جم تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور ایک فرم میں معقول مشاہرے پر ملازم تھا۔ جانے بیٹھے بٹھائے اسے کیا سُوجھی ملازمت سے استعفیٰ دے ڈالا اور اپنے ایک دوست سے مل کر کاروبار شروع کر دیا۔ اب وہ رات گئے گھر لوٹتا، انتظار کرتے کرتے میری آنکھ لگ جاتی۔ استفسار کرنے پر وہ ہمیشہ ایک سا جواب دیتا:

"نیا نیا کاروبار ہے۔ بس ایک آدھ مہینہ اور ہے پھر ہم ملازم رکھ لیں گے۔"

میں خاموش ہو جاتی۔ گھر سے اس کی دلچسپیاں ختم ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ کئی کئی روز اس کی صورت دکھائی نہ دیتی۔ میں جب بھی اسے توجہ دلاتی، وہ کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ اکثر شہر سے باہر رہنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے میں ہمیشہ اس کی بات کو سچ سمجھتی، لیکن ایک واقعے نے اس کا پول کھول دیا۔ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی کیرل کو بخار نے آ لیا۔ تین دن تک وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ اس دوران میں کئی مرتبہ میں نے جم کو فون کیا، ہر بار معلوم ہوا کہ وہ دفتر میں موجود نہیں ہے۔ چوتھے روز کیرل کی حالت اور بگڑ گئی۔ اسے ہسپتال میں چھوڑ کر میں جم کی تلاش میں نکلی۔ دفتر میں ایک ٹائپسٹ خاتون کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے جم کے بارے میں پوچھا۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی:

"وہ باہر گئے ہیں، آپ کون ہیں؟"

میرے بتانے پر وہ بے ساختہ بولی:

"اچھا، تو آپ ان کی پہلی بیوی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ کاروبار کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں، کل شام کو لوٹیں گے، تو آپ کو اطلاع کر دوں گی۔"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ٹائپسٹ کو کریدنے سے معلوم ہوا کہ جم نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ اس نے اپنی ایک کلاس فیلو کیتھی سے مل کر کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ کاروبار کے دوران میں دونوں نے شادی کر لی تھی۔

میں بوجھل دل سے واپس ہسپتال پہنچی۔ کیرل کی حالت خطرے سے باہر تھی، لیکن جم کی زیادتی سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ مجھے اب پتا چلا تھا کہ وہ کئی کئی دن گھر کیوں نہیں آتا تھا۔ وہ رات جس کرب سے گزری، کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ماضی کی ایک ایک یاد ذہن کو ڈس رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جم کی محبت اور شفقت سب ایک دھوکا تھی۔ میں ایک سال سے ایک ایسے شخص کو اپنا شوہر سمجھ رہی تھی جو نہ صرف اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا، بلکہ قانون کی نظر میں بھی مجرم تھا۔ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے اس نے محض روپے کے لالچ میں دوسری شادی کر لی تھی۔ صبح ہوئی، تو میری آنکھیں رات بھر جاگنے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں، دُنیا میری نظر میں اندھیر ہو گئی تھی، کیرل کے سوا میرا اور کون تھا۔ بجھے ہوئے دل سے میں اُسے گھر لے آئی۔ رات بھر بے کل رہنے کی وجہ سے وہ بہت تھکی ہوئی نظر آتی تھی۔ بستر میں لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور میں ایک بار پھر اندھیروں میں بھٹکنے لگی۔ عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ جم کی آواز سنتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اس سے علیحدہ رہوں گی۔ اپنی بچی کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر لوں گی۔ آخر دو جانوں کا خرچ ہی کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جم کمرے میں داخل ہوا:

"مجھے بہت افسوس ہے کہ میں . . . . ."

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

لیکن مَیں نے اس کی بات کاٹ دی اور شروع سے لے کر آخر تک سارا قصّہ کہہ سنایا۔ یہ جان کر کہ مَیں اس کی حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہوں، وہ سنّاٹے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکا، پھر رُکتے رُکتے بولا:

"نینسی، سمجھ میں نہیں آتا کہ یکایک تمہیں کیا ہو گیا ہے، مَیں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، یقین نہیں آتا تو"

"مجھے یقین آ گیا ہے، مَیں کچھ سننا نہیں چاہتی، براہِ کرم اس گھر سے رخصت ہو جایئے یا پھر مجھے جانے کی اجازت دیجیے"

"نینسی، خدا کے لیے اس گھر کو تباہ نہ کرو۔ مَیں مانتا ہوں کہ کسی حد تک مجھ سے غلطی ہوئی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ میرا نہیں تو کیرل کا ہی خیال کرو، اس کے مستقبل کا کیا ہو گا؟"

"تمہیں کیرل سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، چار دن وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی اور تم اپنی نئی بیوی کے ساتھ شہر بہ شہر گھومتے رہے۔ اب یہاں کیا لینے آئے ہو، چپ چاپ چلے جاؤ، ورنہ مَیں پولیس کو تمہاری خفیہ شادی کی اطلاع کر دوں گی۔ مَیں نے تو خیر تمہیں کچھ نہیں کہا، لیکن قانون کے پنجے سے کیسے بچو گے؟"

"نینسی، یقین جانو، مَیں نے کیتھی سے ہرگز شادی نہیں کی، وہ میرے کاروبار کی حصّے دار ضرور ہے۔ اس کے سوا تمہاری ساری معلومات غلط ہیں"

"تم نے کہا تھا کہ تم ایک دوست سے مل کر کاروبار کر رہے ہو، تمہارا جھوٹ تو یہیں کھل جاتا ہے"

جم نے کچھ اور کہنا چاہا، لیکن مَیں اس ناٹک سے عاجز آ چکی تھی۔ مَیں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ گھر سے چلا جائے، ورنہ میں پولیس کو فون کر دوں گی۔ پولیس کے نام سے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"نینسی، تم فون مت کرو، مَیں نہیں چاہتا کہ ہمارا گھریلو

جھگڑا پولیس تک پہنچے۔ مَیں جا رہا ہوں، کل تک تمہارا غصّہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، صبح میں آؤں گا اور تمہاری ساری غلط فہمیاں دُور کر دوں گا۔ اس وقت تک کے لیے خدا حافظ! خدا کے لیے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھنا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ کچھ دیر میں دروازے میں کھڑی سوچتی رہی اور دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ رات بھر میں کام میں مصروف رہی۔ اپنے اور کیرل کے تمام کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں ایک جگہ جمع کر کے تین بنڈل بنائے اور پو پھٹنے سے پیشتر ہی کیرل کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن چلی گئی۔ سیسل جانے والی پہلی گاڑی میں بیٹھ کر دل کو قدرے تسلّی ہوئی۔ ابھی تک سورج نہیں نکلا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ جم کو میرے نئے گھر کی کانوں کان خبر نہ ہو۔ مجھے اپنی بچّی کا مستقبل عزیز تھا۔ مَیں ہر قیمت پر اسے جم کے سایے سے دُور رکھنا چاہتی تھی۔ گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگی۔ مَیں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا، شہر کی عمارتیں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جا رہی تھیں۔ مَیں نے گود میں سوئی ہوئی کیرل کی طرف دیکھا بے اختیار آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

سیسل میں میری ایک پُرانی دوست مسز ڈینگ رہتی تھی۔ سیدھی اس کے ہاں پہنچی۔ اس نے مجھے تسلّی دی اور وعدہ کیا کہ ہر ممکن طریق سے میری مدد کرے گی۔ مسٹر ڈینگ ایک سیمنٹ فیکٹری میں ملازم تھے۔ ان کی وساطت سے مجھے جلد ہی ملازمت مل گئی۔ ہم نے ڈینگ گھرانے سے قریب ہی ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا۔ کیرل کی عمر اس وقت صرف تین سال تھی۔ ہر صبح میں اُسے مسز ڈینگ کے ہاں چھوڑ دیتی اور خود کام پر چلی جاتی۔ دوپہر کو گھر لوٹتے وقت اسے ساتھ لے آتی۔ سب لوگ مجھ پر مہربان تھے۔ مسٹر ڈینگ کیرل کے لیے ہمیشہ نت نئے کھلونے لے کر آتے۔ مسز ڈینگ بھی ہمارے آرام کا خاص خیال رکھتیں، لیکن دل کو کسی پل چین نہ آتا تھا۔ مَیں اندر ہی اندر کڑھتی اور جلتی رہی، یہاں تک کہ

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مجھے سرسام نے آلیا۔ وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے مَیں ہسپتال کے ایک کمرے میں بستر پر پڑی تھی، مسز ڈینگ کچھ دنوں کے لیے باہر گئی ہوئی تھیں، اس لیے کیرل گھر پر اکیلی تھی۔ جب مجھے کیرل کی تنہائی کا احساس ہوتا، دِل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا۔

تین ساڑھے تین سال کی بچّی کا گھر میں اکیلے رہنا واقعی تشویش ناک تھا۔ گو مَیں نے دفتر کی ایک ملازمہ کو فون کر دیا تھا کہ وہ چھٹی لے کر گھر چلی جائے، پھر بھی جی کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔

اچانک دروازہ کُھلا اور مسٹر سٹیوس بیساکھیوں کا سہارا لیے اندر آئے۔ مسٹر سٹیوس ہماری فرم کے مینجر تھے، بے چارے دونوں ٹانگوں سے معذور تھے۔ فالج کے ایک حملے نے ان کے نچلے دھڑ کو بے جان کر دیا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے کیرل آ رہی تھی۔ مَیں نے بستر سے اُٹھنا چاہا، لیکن مسٹر سٹیوس نے روک دیا۔

"معاف کیجیے، مجھے آپ کی بیماری کا علم نہ تھا، ورنہ ضرور خبر گیری کے لیے آتا۔ ابھی ابھی دفتر میں ایک ٹائپسٹ کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ ہسپتال میں ہیں اور آپ کی بچّی گھر پر اکیلی ہے، آپ بالکل مطمئن رہیں میں اسے دفتر ساتھ لے جاؤں گا۔"

تشکّر کے آنسوؤں سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر سٹیوس، کیرل سے گھُل مِل کر باتیں کر رہے تھے۔

ہسپتال سے واپسی پر زندگی پھر معمول کے مطابق بسر ہونے لگی۔ روزمرّہ میں صرف ایک تبدیلی آئی۔ مسٹر سٹیوس ہر اتوار کو ہمارے ہاں آنے لگے، وہ اُدھیڑ عمر کے آدمی تھے چند سال پیشتر ان کی بیوی اور تین بچّے ایک حادثے کی نذر ہو گئے تھے، وہ خود بھی فالج زدہ تھے ـــــ بہت ہی زندہ دِل اور بھلے انسان تھے۔ مجھ سے ان کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی، لیکن کیرل سے خوب کھُلتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے گھنٹوں باتیں کرتے۔ دن گزرتے چلے گئے، یہاں تک کہ کیرل پانچ سال کی ہو گئی۔ ان دو برسوں میں ایک خاص واقعہ پیش آیا جس نے ایک بار پھر میرے سکون کو تہ و بالا کر دیا۔

ایک اتوار کی شام، کیرل، مسٹر ڈینگ، مسز ڈینگ، مسٹر سٹیوس اور مَیں چڑیا گھر کی سیر کو گئے۔ کیرل بہت خوش تھی۔ ایک بڑے سے شیر کے سامنے پہنچ کر وہ رُک گئی۔

"امّی، اس شیر کا کیا نام ہے؟"

"مجھے کیا معلوم، تم ہی بتاؤ؟"

"اس کا نام علی بابا ہے، مَیں اسے جانتی ہوں، یہ میرا دوست ہے، ہم اکثر باتیں کیا کرتے ہیں۔"

"اچھا اچھا، زیادہ جھوٹ مت بولو۔"

"کمال ہے، مَیں جھوٹ نہیں بول رہی، مسٹر سٹیوس سے پوچھ لو۔ ہم اکثر یہاں آیا کرتے ہیں۔"

مسٹر سٹیوس کی تائید پر کیرل اور زیادہ چہکنے لگی ـــ ہم اس کی گپیں سن رہے تھے کہ اچانک میری نظر سنہرے بالوں والی اس لڑکی پر جا پڑی جسے مَیں نے جم کے دفتر میں دیکھا تھا۔ اس کے پاس جا کر میں نے سلام کیا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔

"معاف کیجیے، آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ مَیں نے آپ کو جیمز اینڈ جیمز کمپنی کے دفتر میں دیکھا تھا۔"

"جی، جی" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ نے وہاں سے ملازمت چھوڑ دی؟"

"جی ہاں، وہ فرم ہی بند ہو گئی تھی۔"

"کیوں؟"

"مسٹر جیمز امریکہ چھوڑ کر چلے گئے۔ کیتھی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے یہ جھگڑا کیوں اور کب ہوا تھا؟"

"تفصیل سے بتانا میرے لیے ممکن نہیں۔ سنا ہے مسٹر جیمز کی بیوی اور بچّی لاپتا ہو گئے تھے، صدمے سے وہ دل برداشتہ ہو گئے۔"

"کیا ان کی دوسری بیوی کیتھی بھی فرانس چلی گئی؟"

"معاف کیجیے، کیتھی اُن کی بیوی نہیں تھی۔ شروع میں مجھے بھی یہی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف کاروبار میں

فواد عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مجھے اُداس دیکھ کر کیرل بھی بے چین ہو جاتی۔ اکثر توتلے لہجے میں پوچھتی:

"امّی، آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں اسے کیسے بتاتی کہ یہ سب میری ذرا سی بھول کا نتیجہ ہے۔ انہی دنوں میں نے کیرل کو ایک اچھے سے سکول میں داخل کرا دیا۔ وہ الگ پریشان کرتی، ایک روز پوچھنے لگی:

"امّی، میرے ابّا کہاں ہیں؟"

"وہ بہت دُور گئے ہوئے ہیں۔"

"ہم ان کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"دیکھو کیرل، اگر تم خوب دل لگا کر پڑھو اور اپنی جماعت میں اوّل آؤ، تو وہ ہمارے پاس آ جائیں گے۔"

کہنے کو تو میں نے یہ فقرہ کہہ دیا لیکن بعد میں غلطی کا احساس ہوا۔ کیرل کتاب میں سے ایک سطر پڑھتی اور سر اُٹھا کر پوچھتی:

"امّی، میں پڑھ رہی ہوں، اب تو ابّا آ جائیں گے نا؟"

"ابّا، ابّا، ابّا ——" میں جھلا کر رہ گئی۔ "آخر تمہیں یہ ابّا کیوں یاد آنے لگے؟" میں نے ایک روز کیرل سے پوچھا۔

"امّی، سکول میں چھٹی ہوتی ہے تو سب بچوں کے ابّا انہیں لینے آتے ہیں، آخر میرے ابّا مجھے کیوں لینے نہیں آتے؟"

"وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ اگر ہمارے پاس ہوتے، تو ضرور تمہیں لینے جاتے۔"

"میری سہیلیاں کہتی ہیں، تمہارے ابّا ایک بار بھی سکول نہیں آئے۔ وہ مجھے بہت چھیڑتی ہیں۔ پرسوں ایلس نے کلاس روم میں کہا: 'کیرل یتیم ہے، اس کے ابّا مر چکے ہیں۔'"

میں نے اسے بہلانا چاہا، لیکن وہ مچل گئی۔

"اگر میرے ابّا زندہ ہیں، تو انہیں کہو ایک بار میرے سکول ضرور آئیں تاکہ سب لڑکیاں انہیں دیکھ لیں۔"

"اچھا، میں انہیں خط لکھوں گی۔"

ابّا کے متعلق کیرل کا اصرار بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ میں

حصّے دار ہے۔"

مجھ پر جیسے ایک بجلی سی گری۔ مطلب یہ کہ جم سچائی پر تھا۔ میں نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ کاش! میں ایک روز اور ٹھہر جاتی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری ساری غلط فہمیاں دُور کر دے گا، لیکن مجھ پر تو غصّے کا بھوت سوار تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا، اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں نے ایک اور سوال کیا:

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ آج کل کیا کر رہے ہیں؟"

"سنا ہے وہ میسل اینڈ کمپنی میں ملازم ہیں، مگر آپ کون ہیں اور یہ سب کچھ کس لیے دریافت کر رہی ہیں؟"

اس کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے میں وہاں سے چل دی۔ باقی وقت جانے کیسے گزرا۔ گھر پہنچ کر کمرے کے دروازے بند کیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اگلے روز کوشش کے باوجود دفتر نہ جا سکی۔ کیرل بار بار مجھ سے رونے کی وجہ پوچھتی، لیکن بھلا میں اسے کیا بتا سکتی تھی۔ میں نے جم سے بہت زیادتی کی تھی۔ پھر بھی ایک موہوم سی اُمید باقی تھی۔ میں نے اسے میسل اینڈ کمپنی پیرس کے پتے پر ایک خط لکھ دیا اور دن رات جواب کا انتظار کرنے لگی۔ تیسرے دن پیرس سے ایک چٹھی موصول ہوئی۔ لفافے کو دیکھتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا —— کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ ٹائپ کے ننھے منّے حروف آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ لکھا تھا:

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مسٹر جیمز بارلے ڈیڑھ سال ہوا ہماری ملازمت چھوڑ چکے ہیں۔ آپ کا خط واپس بھیج رہا ہوں۔"

نیچے جنرل منیجر کے دستخط تھے۔

جم کے بہت سے عزیزوں اور دوستوں کے پتے میرے پاس موجود تھے، ان سے رابطہ پیدا کیا، لیکن کچھ پتا نہ چلا کہ آج کل وہ کہاں ہے۔ آخر تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ ذہن پر ایک بوجھ سا تھا۔ زندگی چیونٹی کی چال چل رہی تھی۔ دن گزرنے میں نہ آتے تھے۔

www.taemeernews.com

اس سے عاجز آ گئی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس ضدی بچی کا کیا کرے۔ انہی دنوں ایک ستم یہ ہوا کہ مسٹر سٹیونس ملازمت چھوڑ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ کیرل ان کے ساتھ اکثر گھومنے جایا کرتی تھی، وہ بھی کیرل کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد کیرل اور زیادہ پریشان رہنے لگی۔ اب وہ ہر وقت ابا ابا کی رٹ لگاتی تھی۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اس طوفانی رات کو آرام کرسی میں دراز، میں ان ہی خیالوں میں گم تھی۔ آج کیرل نے اپنے ابا کے لیے دعا مانگ کر میرے غم کو ایک بار پھر تازہ کر دیا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو فوراً جم کو ڈھونڈ نکالتی، لیکن گیا وقت ہاتھ کب آتا۔ اب تو صرف پچھتاوا باقی تھا۔ ندامت کے آنسو فتح طور پر دل کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں، لیکن بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو واپس نہیں لا سکتے۔ رات دو بجے کے قریب [illegible] بعد بادل چھٹ گئے اور ہلکا نیلا آسمان دکھائی دینے لگا۔ صبح تک میں یہی سوچتی رہی کہ غم کے وہ بادل کب چھٹیں گے جو میری خوشیوں کے آسمان پر چھائے ہوئے ہیں۔

دفتر کے اوقات میں میرا دھیان کیرل کی بار بار یاد میں لگا رہا۔ دوپہر کو مجھے ہوسٹل سے فون آیا کہ کیرل ابھی تک سکول سے نہیں لوٹی تھی۔ معمول کے مطابق گیارہ بجے سکول کی بس اسے گھر چھوڑ جاتی تھی۔ میں نے پرنسپل کو فون کیا معلوم ہوا کہ بس سب بچوں کو چھوڑ کر واپس سکول آ چکی ہے۔ ڈرائیور سے دریافت کیا، تو بھی یہی معلوم ہوا ـــــ آخر کیرل کہاں چلی گئی ـــــ بھاگم بھاگ مسز ڈینگ کے ہاں پہنچی، لیکن کیرل وہاں بھی موجود نہ تھی۔ ایک گھنٹے میں میں نے سارا محلہ چھان مارا، کیرل کی ہم جماعتوں کے ہاں پتا کیا، سکول گئی، پارک میں دیکھا، لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ میں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ شام کے اخبارات میں کیرل کی تصویر کے ساتھ اس کی گم شدگی کی خبر شائع ہو گئی۔ رات گئے تک پولیس نے شہر کا گوشہ گوشہ چھان مارا، لیکن کیرل کا کہیں پتا نہ چلا۔ اس دوران میں مسٹر ڈینگ نے مسٹر سٹیونس کو بھی اطلاع کر دی تھی، وہ بے چارے علالت کے باوجود گاؤں سے آ گئے تھے اور کیرل کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ دو تین مرتبہ چڑیا گھر کا بھی چکر لگایا، لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ میرا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جاتا تھا۔ سب لوگ مجھے تسلیاں دے رہے تھے، لیکن مجھ میں ضبط کی طاقت نہ تھی۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو اُمنڈا چلا آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے شدت سے جم کی کمی محسوس ہوئی۔ جم کہاں تھا، میرا دوست، میرا [illegible] وہ جو میری اُنگلوں اور چاہتوں کا مرکز تھا، مجھے اس آزمائش میں مبتلا کر کے جانے کہاں غائب ہو گیا تھا، لیکن اب اس کی یاد سے کیا حاصل، میں نے خود اُسے اپنی زندگی میں سے نکال دیا تھا۔ مجھے ایک ایک کر کے جم کے احسان یاد آنے لگے۔ میں اپنی اور بے سہارا لڑکی تھی، اس نے مجھے سہارا دیا، [illegible] دی، [illegible] کے لیے ایک گھر دیا۔ زندگی کے اس طویل سفر میں مجھے ایک ساتھی ملا، لیکن میں نے اپنی جلد بازی سے اُسے کھو دیا، اس کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تو کیرل کو ظالمانہ طور پر مجھ سے چھین سکتا تھا، لیکن اس نے میری خوشیوں پر اپنی پدرانہ شفقت اور محبت کو قربان کر دیا۔ وہ خود تباہ ہو گیا، لیکن مجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں فطرتاً شکی اور متلون مزاج ہوں اور وہ کوشش کے باوجود مجھے اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکے گا۔ دل برداشتہ ہو کر وہ اس ملک ہی سے چلا گیا۔ میں نے کیرل سے بھی زیادتی کی تھی، اس کا ننھا سا دل دُکھایا تھا۔ کتنے عرصے سے وہ باپ کی شفقت کے لیے ترس رہی تھی، لیکن حسد اور جلن کی وجہ سے میں نے اسے باپ سے دُور رکھا تھا۔ جم بے گناہ تھا، لیکن اگر وہ گناہ گار ہوتا، تو بھی میرا فرض تھا کہ کیرل کو اس سے نہ چھینوں، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کی آندھیوں نے میرے شوہر کو مجھ سے دُور کر دیا تھا، کیرل اس کی نشانی تھی اور اب وہ بھی مجھ

PakistaniPoint
Waqar Azeem
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

سے جدا ہو گئی تھی۔ رو رو کر میرا بُرا حال ہو رہا تھا! اچانک دروازہ کھلا اور مسٹر سٹیوس بیساکھیوں کا سہارا لیے اندر آئے۔

"کیرل کا کچھ پتا چلا؟" مَیں نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں ـــــ میرا خیال ہے وہ ضرور چڑیا گھر گئی ہو گی۔ آج ہفتہ ہے نا؟ ـــ ہر ہفتے کی شام کو ہم دونوں چڑیا گھر جایا کرتے تھے۔"

"بھلا، وہ اکیلے چڑیا گھر کیسے جا سکتی ہے؟"

"کیرل بہت ذہین بچی ہے، چڑیا گھر میں اس کے بہت سے دوست ہیں، علی بابا ہی کو لو۔ مَیں اور کیرل اکثر اس کے پاس جا کر بیٹھتے تھے۔"

"کون علی بابا، چڑیا گھر کا وہ شیر؟"

"ہاں ہاں، وہی، تم جلدی سے کوٹ پہن لو ـــ ہم چڑیا گھر چل رہے ہیں۔"

مَیں کوٹ بدل رہی تھی کہ اچانک بیرونی دروازے پر گھنٹی بجی۔

"کون ہے؟ اندر آ جائیے۔"

"دیکھیے سر، مَیں آپ کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا، تاہم ایک پولیس افسر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ آپ کو حقیقتِ حال سے باخبر کر دوں۔"

"کیا بات ہے؟" مَیں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ابھی ابھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ جو سو سٹریٹ کے پاس ایک بچی بس کے نیچے آ کر کچلی گئی ہے۔ چہرے پر بے شمار زخم آنے کی وجہ سے ہمارے لیے اسے پہچاننا بہت مشکل ہے، وہ بچی آپ کی بیٹی سے قدرے مختلف ہے، تاہم اگر آپ ساتھ چل کر تصدیق کر سکیں، تو ـــــ"

ہم فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہسپتال پہنچے۔ بچی کا سارا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا، چہرے کے نقوش بگڑ چکے تھے ـــ ناک اور آنکھیں قیمہ بن گئی تھیں، پھر بھی مَیں نے فوراً پہچان لیا

کہ وہ کیرل نہیں ہے۔

ہم افسردہ دلی سے گھر لوٹ رہے تھے کہ راستے میں مسٹر سٹیوس نے چڑیا گھر چلنے کی تجویز پیش کی۔ مسٹر ڈینگ کا خیال تھا کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک کوئی بچہ چڑیا گھر میں نہیں رہ سکتا، کیونکہ شام کے چھ بجے گیٹ بند ہو جاتا ہے اور ساڑھے چھ بجے تک تمام تماشائی باہر آ جاتے ہیں، لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، مَیں نے فوراً ہامی بھر لی۔

رات کے سناٹے میں چڑیا گھر کی عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ جانوروں کی اس وسیع و عریض آبادی میں ہم چار پانچ انسان تھکے تھکے قدموں سے گھسٹ رہے تھے۔ اپنے لختِ جگر سے محرومی کے احساس میں ایک نامعلوم دہشت کا عنصر بھی شامل تھا۔ چڑیا گھر کے باسی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ گرتے پڑتے اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے چڑیا گھر کے دفتر میں پہنچے۔ کیوریٹر نے تمام بتیاں جلا دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی اُجالے میں تبدیل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم کیوریٹر کی معیت میں شیروں کے کٹہرے کی طرف چل دیے۔ میرے ہونٹوں سے بار بار یہ الفاظ نکل رہے تھے:

"خدایا! میری بچی مل جائے۔"

تمام شیر اپنے اپنے کٹہروں میں سو رہے تھے، صرف ایک شیر آخری پنجرے میں چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی کی رکھوالی کر رہا ہو۔ باہر پلیٹ پر سنہری حروف میں "علی بابا" لکھا تھا۔ اچانک مسٹر سٹیوس کی آواز فضا میں گونجی:

"وہ رہی کیرل۔"

مَیں نے غور سے دیکھا۔ بیرونی جنگلے اور اندرونی جنگلے کے درمیان پختہ چبوترے پر کیرل اوندھے منہ لیٹی میٹھی نیند سو رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی علی بابا نے ایک بڑی سی جمائی لی اور نتھنوں سے مانس چھوڑنے لگا، جیسے کیرل کو اجنبیوں سے خبردار کر رہا ہو۔ چڑیا گھر کا ایک ملازم فوراً کیرل کو اٹھا لایا۔

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

علی بابا کچھ دیر ہماری طرف دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ شاید وہ یہ جان گیا تھا کہ اس کا فرض پورا ہو چکا ہے۔ کیرل کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"امی، میں گھر نہیں جاؤں گی، علی بابا ناراض ہو جائے گا۔ اس نے کہا تھا تم یہیں سو جاؤ، تمہارے ابّی تمہیں لینے آئیں گے۔" کیرل نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹی، ہم صبح پھر یہاں آجائیں گے، ہماری بات مان لو۔ اچھی بچیاں بڑوں کا کہنا مانتی ہیں۔" مسٹر سٹیونس نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں، میں اس وقت یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک میرے ابّا نہیں آجاتے۔" مسز ڈینگ نے اسے بہلانے کی کوشش کی، لیکن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں خاموش کھڑی اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیرل کو روتے دیکھ کر مسٹر ڈینگ پریشان ہو گئے اور کیوریٹر سے بولے:

"اب کیا ہو گا؟"

کیوریٹر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تاریکی میں سے ایک سایہ آگے بڑھا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ جم تھا۔

"میں آگیا ہوں میری بچّی، میں آگیا ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

کیرل چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"میں ہی تمہارا بدنصیب باپ ہوں بیٹی — ڈرو نہیں، میرے قریب آؤ۔"

کیرل بھاگ کر اس سے چمٹ گئی۔

"جم تم یہاں کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پرسوں ایک ضروری کام سے یہاں پہنچا تھا۔ اخبارات میں کیرل کی گمشدگی کی خبر پڑھی، تو تمہارا پتا معلوم ہو گیا۔ پولیس سٹیشن گیا۔ انہوں نے بتایا کہ تم کیرل کو تلاش کرنے چڑیا گھر گئی ہوئی ہو۔"

"جم، میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"پچھلی باتوں کو بھول جاؤ نینسی۔ پہلی غلطی میری تھی۔ مجھے تم سے جھوٹ نہیں کہنا چاہیے تھا، لیکن یقین جانو، میں نے محض اس لیے تم سے بات چھپائی تھی کہ تم خواہ مخواہ شک کرو گی۔ کیتھی سے میرا تعلق صرف کاروبار میں شراکت تک تھا۔ میں نے تمہاری بہت تلاش کی، لیکن تم کہیں نہ مل سکیں، میں خود شرمندہ ہوں۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ندامت، رنج اور خوشی کے ملے جلے آنسو۔

جب ہم واپس جانے لگے تو کیرل بلند آواز میں بولی:

"خدا حافظ علی بابا، تمہارا بہت بہت شکریہ، میں تم سے ملنے ہر روز آیا کروں گی۔"

■■

باتیں لندن اور نیویارک کی

اگر اتفاق سے آپ کو کوئی انگریز مسکراتا مل جائے تو آسمان پر نظر ڈالے بغیر سمجھ لیجیے کہ لندن پر سورج چمک رہا ہے۔ اگر کوئی امریکی مسکراتا ہوا مل جائے تو اخبار دیکھے بغیر سمجھ لیجیے کہ کاستروپٹ رہا ہے۔ ایک قوم ناک سے ہنستی ہے اور دوسری دانتوں سے۔ تیلے دونوں نہیں پڑھیں۔ جب امریکی کا منہ ہل رہا ہو تو سمجھیے وہ چیونگم چبا رہا ہے، جب انگریز کا منہ ہلے تو سمجھیے کہ الفاظ چبا رہا ہے۔ نیویارک کی ٹیکسی میں ڈرائیور اکثر جوان حبشی ہوتا ہے جو بیٹھا ریڈیو پر "راک بے بی، رول بے بی" سنتا رہتا ہے۔ لندن کی ٹیکسی میں ستر سالہ "مغنک ڈرائیور" جاسوسی ناول یا گھڑدوڑ کی پیشگوئیاں پڑھ رہا ہوتا ہے اگر غریب ہو تو بیمار لندن میں پڑو۔ امیر ہو تو تفریح نیویارک میں کرو۔ لندن کے تھیٹر میں ٹکٹ پانچ روپے کا اور ڈرامہ لاکھ روپے کا۔ نیویارک میں ہی نشست ۲۵ روپے کی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ ایک جگہ ڈیڑھ پاؤ اخبار میں دنیا بھر کی خبریں۔ دوسری جگہ اڑھائی سیر اخبار کے ڈھیر میں سوا دو سیر اشتہارات، چار چھ خبریں۔

- (بیگم اختر ریاض) -

شہر میں داخل ہوتے ہی خطرے کی ایک سرد سی لہر اُسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہوٹل میں پہنچا، تو خطرے کا احساس اور بڑھ گیا جیسے وہ کسی پنجرے میں آگیا ہو اور اس کا دروازہ یکایک بند کر دیا گیا ہو۔ وہ شہر کے ایک مشہور سرمایہ کار مسٹر ایل۔ ایس روسٹ سے ملنے آیا تھا۔ روسٹ ایک بہت بڑی کمپنی کا مالک تھا۔ اس کمپنی کا "نیو آسٹریلیا" میں وسیع کاروبار تھا اور اس کے متعلق طلسمِ ہوشربا کی سی داستانیں مشہور

سنسنی کہانی

سائنس بھار

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جیک ولیم سن
آباد شاہ پوری

تھیں۔ خطرے کی بے آواز گھنٹی دیر تک اس کے دماغ میں بجتی رہی۔ اس کا ذہن اب بھی متلاطم تھا۔ آخر ٹیلیفون کی گھنٹی نے اُسے چونکا دیا۔

"ڈاکٹر ڈان ہیل؟" کوئی خاتون پوچھ رہی تھی۔ لب و لہجے سے دیرینہ شناسا معلوم ہوتی تھی، مگر وہ تو نیویارک میں بالکل اجنبی تھا۔

"میں جین سیملٹن، سیملٹن سروس سے بول رہی ہوں، کیا آپ گیارہ بجے ہمارے دفتر تشریف

لا سکتے ہیں ؟"

جین سیملٹن ؟ ہیل نے ذہن پر زور دیا، مگر اسے کچھ یاد نہ آیا کہ یہ عورت کون ہے۔ "آپ لوگ کون ہیں اور مجھ سے کیا کام ہے ؟ اس نے دریافت کیا۔

"بس، لائف انشورنس سمجھ لیجیے۔" جین نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔ "ڈاکٹر ہیل، آپ کی جان خطرے میں ہے اور شاید ہم آپ کو بچا سکیں۔"

"میری جان خطرے میں ہے ؟" ہیل نے حیرت سے پوچھا۔ "یہاں ایک اجنبی شہر میں کون لوگ میرے دشمن ہو سکتے ہیں ؟"

"بہت سے ..... ان میں سے ایک ہنری روزوڈ ہے ..... ٹیلی فون پر نہیں، آپ تشریف لائیے ..... پھر باتیں ہوں گی۔" اس نے اپنا پتا دیا اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

"ہنری روزوڈ ؟ یہ کون شخص ہے اور میری جان کا لاگو کیوں ہے ؟" وہ دیر تک دشمنی کے مختلف اسباب و محرکات سوچتا رہا۔ "خیر دشمن کوئی بھی ہو اور دشمنی کا محرک کچھ بھی ہو، میں گیارہ بجے سیملٹن سروس ضرور جاؤں گا۔" اس نے فیصلہ کر لیا۔

روسٹ سے ملاقات کے لیے وہ ہوٹل سے نکلا، تو کچھ پرانی یادیں اس کے ذہن میں ابھر آئیں۔ اس کا باپ ایک مشہور سائنس دان چارلس ونٹر کا اسسٹنٹ رہا تھا۔ ونٹر علم تولیدیات کا ماہر تھا اور انسانی نیضوں پر انقلاب انگیز مگر ناکام تجربے کر تا رہا تھا۔ مسٹر روسٹ اس تجربے میں سرمایہ کار تھے۔ ونٹر نے اپنے عظیم الشان خوابوں کے متعلق جو خطوط اس کے باپ کو لکھے تھے، وہ اب تک اس کے پاس محفوظ تھے۔ مدتوں مسٹر روسٹ کے خطوط بھی آتے رہے تھے جن میں اس نے سرمایہ لگانے کا وعدہ کیا تھا تاکہ ونٹر کا کام مکمل ہو سکے، مگر اس کے باپ کو بھی پے در پے ناکامیاں ہوئیں اور روسٹ نے مزید سرمایہ لگانے سے انکار کر دیا۔ اب خود اس نے ونٹر کے چھوڑے ہوئے کام کو ہاتھ میں لیا تھا اور وہ سرمایے کے حصول کے لیے روسٹ سے ملنے آیا تھا۔ روسٹ گھر پر نہیں تھا، وہ اپنا تعارفی کارڈ چھوڑ کر چلا آیا۔ ہوٹل پہنچا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی :

"معاف کیجیے گا، کیا آپ ہی ڈاکٹر ہیل ہیں ؟"

ہیل نے مڑ کر دیکھا، ایک لمبا تڑنگا آدمی اس سے مخاطب تھا۔ غیر مرئی خطرے کے تصوّر سے ایک سرد رَو پھر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

"میں ہیل ہوں۔" اس نے بھاری آواز میں اعتراف کیا۔

"اور شاید آپ ہنری روزوڈ ہیں ؟"

"جی ہاں، روزوڈ، ایجنسی کا ڈائرکٹر۔" اجنبی نے جواب دیا۔ "کیا آپ مجھے دو منٹ دیں گے ؟"

دونوں ہوٹل کی لابی کے ایک الگ تھلگ گوشے میں کھڑے تھے۔

"حیرت ہے، آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا ؟" روزوڈ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس کی تیز نگاہیں جیسے اس کے چہرے میں پیوست ہو رہی تھیں۔

"یہی سوال میں بھی کر سکتا ہوں۔" ہیل نے جواب دیا۔

"ہماری ایک پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسی ہے جو آپ کے متعلق معلومات فراہم کرتی رہی ہے۔ ہمیں علم تولید کے ایک ماہر کی ضرورت ہے، آپ کی علمی صلاحیتیں اور ان کا پس منظر بتاتا ہے کہ آپ موزوں ترین آدمی ہیں۔ ہم ایک جنگ لڑ رہے ہیں ..... مقدس جنگ ..... آپ چارلس ونٹر کو جانتے ہی ہیں جس کے نام پر آپ نے لیبارٹری قائم کر رکھی ہے۔ یہ مقدس جنگ اسی کی ناپاک اور انسانیت دشمن سرگرمیوں کے خلاف ہے۔" روزوڈ نے سب کچھ اُگل ڈالا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" ہیل نے کہا۔ اس کی آواز میں خاصی تیزی تھی۔ "ونٹر میرے باپ کا دیرینہ دوست تھا، وہ ایک لائق ماہر تولید بات تھا۔ چالیس برس پہلے اس نے کچھ انقلاب انگیز تجربات شروع کیے تھے۔ ایک خانگی ایلیے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نے اس کی زندگی تلپٹ کر دی۔ اس نے تحقیقاتی کام چھوڑ دیا اور پھر نظر نہ آیا۔"

"یہ غلط ہے۔" روز وُڈ نے کہا۔ "وہ جان بوجھ کر غائب ہو گیا۔ اس کے ناپاک تجربات دَر پَردہ آج بھی جاری ہیں۔"

"نہیں نہیں، مَیں نے ونٹر کے خطوط دیکھے ہیں، وہ کام ناپاک نہیں تھا، وہ صرف بھلائی چاہتا تھا۔"

"ہُونہہ، بھلائی، ہم نے اس بھلائی کے نتائج دیکھے ہیں۔"

"نتائج، کیسے نتائج؟"

"نئی مخلوق ـــــ انقلابِ نوعی کا شہ کار۔" روز وُڈ کے لہجے میں گہری طنز تھی۔

"وہ نئی مخلوق کہاں ہے؟"

"ہمارے گرد و پیش بھی اور نیو آسٹریلیا میں بھی۔ انسان اور انسانیت کے خلاف مکروہ سازش کی مظہر۔۔۔۔ ہم اسے "نامانس" کہتے ہیں۔۔۔۔ ونٹر کے تجربات کے نتائج یکساں نہیں نکلے ہیں، بلکہ گوناگوں شکل و صورت رکھنے والی مخلوق ہم لے رہی ہے جسے آپ عفریت تو کہہ سکتے ہیں، انسان نہیں کہہ سکتے۔۔۔۔ یہ ناپاک سرگرمیاں جاری رہیں تو انسان اس کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کی انسانیت کے سارے مظاہر تباہ ہو جائیں گے۔ ہم ونٹر کی بدکار سائنس کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہماری ایجنسی ہر نسل و رنگ کے انسانوں پر مشتمل ہے جو اپنی انسانی روایات کے وفادار ہیں۔ ہمیں آپ کا تعاون چاہیے۔"

ہیل کی نظر کے سامنے ونٹر کے خطوط اُبھرنے لگے۔ پودوں پر ونٹر کے تجربات کامیاب رہے تھے، مگر "نئے انسان" پیدا کرنے میں اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ "دنیا میں ایسی مخلوق موجود ہے، مجھے یقین نہیں آتا۔"

روز وُڈ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کیا آپ ہمارے دفتر تک چلیں گے؟ تھوڑی دیر کے لیے۔"

روز وُڈ ایجنسی کے دفتر میں قدم رکھتے ہی ہیل کے کانوں میں چین کے الفاظ گونج اُٹھے: "روز وُڈ سے تمہیں خطرہ ہے۔"

اُس کے کمرے میں دیوار پر دُنیا کا ایک بہت بڑا نقشہ آویزاں تھا جس پر جا بجا کالے پن لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں روز وُڈ کے قول کے مطابق نامانسوں کے پیدا ہونے کی خبر ملی تھی۔ ایک گوشے میں بڑا سا شیلف رکھا تھا جس میں انقلابِ نوعی اور تولیدیات کے موضوع پر متعدد کتابیں موجود تھیں۔ ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا کرسمس ٹری بڑے سے سُرخ گملے میں کھڑا تھا۔ درخت کے پتّے گہرے سبز اور سدا بہار تھے۔ گملا چٹانوں اور مختلف دھاتوں کی آمیزش سے بنا تھا۔ ایک شاخ پر ننھّا سا راکٹ لٹک رہا تھا، شاخیں اور پتّے مختلف دھاتوں اور چٹانوں سے وجود میں آئے تھے۔ میز پر ایک بڑے شیشے کے نیچے مختلف تصویریں رکھی تھیں۔ وُہ تصویریں عام انسانوں کی سی تھیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ قد کاٹھ سے وہ بالغ نظر آتے تھے، مگر روز وُڈ نے بتایا کہ وہ آٹھ سال سے زیادہ کے نہیں ہیں۔ باقی تصاویر عجیب و غریب اور ہیبت ناک تھیں ـــ وہ واقعتاً دیو دکھائی دیتے تھے جن کی کہانیاں انسان اپنے بچپن کے زمانے میں ہمیشہ سے سنتا آیا تھا۔

"یہ ہیں ونٹر صاحب کی سائنس کے شاہکار۔" روز وُڈ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ تو محض تصویریں ہیں۔ کیا کوئی نامانس آپ کے پاس موجود ہے؟"

"نہیں، نہ زندہ، نہ لیبارٹری میں۔ نامانس بڑے عیّار ہیں، ہاتھ آنے نہیں پاتے۔ پچھلے دنوں ایک لڑکی کا پتا چلا تھا۔ ہم نے چھاپا مارا، مگر وہ چُل دے کر نکل گئی، بس یہ پودا ہاتھ لگا۔ یہ برابر بڑھ رہا ہے۔ یہ ننھّا سا جہاز کھلونا نہیں ہے، بلکہ بڑھتے بڑھتے خلائی جہاز بن جائے گا۔ شاید نامانس سیاروں کی تسخیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

قار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اپنے شیرخوار بچے کے لئے لیکٹوجن ہی خریدیئے۔ یہ اعلیٰ قسم کا دودھ ہے جو بچوں کے ہاضمے کے لئے بہت مناسب ہے لیکٹوجن میں جسمانی نشوونما، ہڈیوں، اور دانتوں کی مضبوطی اور نزلے کی مدافعت کے لئے ۹ زائد وٹامن اور معدنیات شامل کئے گئے ہیں۔

بچوں کی پرورش پر لیکٹوجن کی بالتصویر کتاب "The Lactogen Mother Book" بالکل مفت حاصل کرنے کے لئے آج ہی اپنا نام و پتہ ۲۵ پیسے کے ٹکٹ کے ہمراہ بھیج دیجئے

نام: .....

پتہ: .....

نیسلز پروڈکٹس پوسٹ باکس ۴۹۶۴ ـ ۳۲ ویسٹ وہارف روڈ کراچی

"مگر کچھ بھی ہو، ونٹر انسانیت کا بہی خواہ تھا اور پھر وہ ناکام رہا تھا اور مدّت ہوئی غائب ہو چکا ہے۔ آپ لوگ تو تمّات پر مبنی مفروضات پر کام کر رہے ہیں۔"

"نہیں، ڈاکٹر ہیل نہیں، ہم حقیقت پرست ہیں۔ ونٹر ابھی زندہ ہے اور انسانیت کے خلاف سرگرم عمل۔ ہم نے گم شدہ کڑیاں ڈھونڈ نکالی ہیں۔"

"گم شدہ کڑیاں ڈھونڈ نکالی ہیں؟" ڈاکٹر ہیل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، وہ تیس برس پہلے اسبو کار میں تھا اور چار برس بعد اس کی بیوی نے گھر بھر کو آگ لگادی، اپنی بچّی کو گولی مار دی، تین گولیاں ونٹر پر چلائیں اور پھر خود آگ میں جل مری۔" روزوڈ، ونٹر کی زندگی کے ورق اُلٹنے لگا۔

"ٹھیک ہے، اس پر وحشت طاری ہو گئی تھی۔ ونٹر نے چند روز پہلے میرے والد کو لکھا تھا کہ ان کے معاشی حالات ابتر ہو چکے ہیں اور مارگریٹ کا ذہن سخت متاثر ہے۔" ہیل نے کہا۔

"نہیں، ڈاکٹر ہیل، آپ کی معلومات ناقص ہیں۔ مارگریٹ پورے ہوش و حواس میں تھی۔ معاشی بدحالی کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مارگریٹ ایک انسان تھی۔ اس کا جو پہلا بچّہ پیدا ہوا، وہ "نامانس" تھا۔ دوسرا بچّہ ہونے والا تھا اور آثار ہویدا تھے کہ وہ بھی نامانس ہوگا۔ اس کی انسانیت برداشت نہ کر سکی، مگر کرناک المیہ یہ ہے کہ ونٹر زندہ بچ نکلا اور اس نے اپنی بدکارانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ . . . اس کی سازش آج بھی جاری ہے۔ اس نے نئی مخلوق کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار دے دیا ہے جس کے آگے انسان بالکل بے بس ہے۔ یہ کوئی زہریلا مادّہ ہے جس سے انسان کی قوّتِ یادداشت سلب کر لی جاتی ہے۔ اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ ہمارا ایک تفتیش کنندہ اس کا شکار ہو چکا ہے۔ کوئی تین مہینے پہلے کی بات ہے، وہ اس آٹھ سالہ لڑکی کے کھوج میں نکلا، مگر پھر واپس نہ آیا۔ پچھلے ہفتے ہمارے ایک نمائندے نے اسے ڈارون کے ایک ہوٹل میں برتن دھوتے ہوئے پہچان لیا، اس کا دماغ تباہ کر دیا گیا تھا، اس کی یادداشت جاتی رہی تھی، اس نے اپنا نام بدل لیا تھا اور وہ برتن دھونے کے کام پر بالکل مطمئن تھا۔ اپنے پرانے دوست کو پہچان تک نہ سکا۔ مختلف شہادتیں بتاتی ہیں کہ یہ اُسی لڑکی کا کیا دھرا تھا۔ ایسے دشمن سے نبٹنے کے لیے ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" روزوڈ نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"میں انسان ہوں، اپنی نوع کا وفادار، مگر مجھے سوچ بچار کے لیے وقت چاہیے۔"

"وقت . . . . . ہم کل آٹھ بجے تک آپ کا جواب چاہتے ہیں۔ اُمید ہے آپ کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا، لیکن دیکھیے، سیملٹن سروس سے ہوشیار رہیے گا۔"

(۲)

ٹھیک گیارہ بجے ڈاکٹر ہیل، سیملٹن سروس کے دفتر میں جین سیملٹن سے مصروفِ گفتگو تھا۔

"خطرہ فی الواقع موجود ہے، لیکن ہم آپ کو بچانے کی کوشش کریں گے۔" جین سیملٹن کہہ رہی تھی۔ کھلتا ہوا گورا رنگ اور نکھرے ہوئے خدوخال، چہرے نے بشرے سے بچپن کا بھولپن صاف نمایاں تھا، وہ صرف آٹھ برس کی تھی۔ اس کا قد و قامت دیکھ کر کوئی باور نہیں کر سکتا تھا۔

"کیسا خطرہ؟" ہیل نے پوچھا۔

"پہلے ہم آپ کے ریکارڈ کا جائزہ لیں۔" جین نے کہا۔ اس نے میز کی دراز سے نیلے رنگ کا ایک کارڈ نکالا اور پھر پے در پے سوال کرتی چلی گئی۔ "آپ کا نام؟ باپ کا نام اور پیشہ؟ نسل و قوم؟ جائے پیدائش؟ بیماریاں اور کمزوریاں؟ تعلیم؟"

وقار عظیم
پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

ہیل جواب دیتا رہا۔ جین کارڈ پر نشان لگاتی گئی، پھر اس کا خون ٹیسٹ کرنے لگی۔

"یہ لڑکی یقیناً نامانس ہے اور اپنے عزیزوں کی تلاش میں ہے۔" ہیل کے ذہن میں خیال پیدا ہوا۔ جین خون ٹیسٹ کر چکی، تو ہیل نے پوچھا: "کیا میں کامیاب رہا ہوں؟"

"ابھی ذہنی امتحان باقی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ہیل کا جی چاہا کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے۔ وہ نامانسوں کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا اور شاید ایک بڑا عمدہ موقع اس کے ہاتھ آیا تھا۔

پورا ایک گھنٹہ ذہنی امتحان میں لگ گیا۔ سوالات کیا تھے، پیچیدہ پہیلیاں تھیں۔ امتحان کے دوران میں اس کے اندیشے کی توثیق ہو گئی۔ جین نے پتوں کا ایک بنڈل نکالا جن پر جیومیٹری کی سادہ سی اشکال چھپی ہوئی تھیں۔ یہ پتے اس نے ڈیوک یونیورسٹی میں کئی سال پہلے دیکھے تھے اور "پیس" کہلاتے تھے۔ روز وُڈ کا کہنا تھا کہ "پیس" نامانسوں کا نشان ہے۔

یقیناً یہ لڑکی نامانس ہے اور روز وُڈ کی طرح یہ بھی مجھے اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی ہے، لیکن میں کسی کا آلۂ کار نہیں بنوں گا۔ سوچ کی اس لہر نے اس کا ارادہ بدل دیا۔ وہ سوالات کا اُوٹ پٹانگ جواب دیتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ناکام رہا، لیکن نہ جانے جین اس کی ناکامی سے کیوں متاثر تھی۔ اس کا چہرہ افسوس، حیرت اور اضطراب کے امتزاج کا عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ کچھ دیر سوچ کے بعد جین نے کہا:

"شاید آپ روز وُڈ سے ملے تھے؟"

"ہاں، وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گیا تھا، اس نے مجھے ایک کہانی سنائی اور ایجنسی کے سٹاف میں شامل ہو جانے کی دعوت دی۔"

"کیا آپ نے دعوت قبول کر لی؟"

"نہیں، مجھے کل آٹھ بجے جواب دینا ہے؟"

"میرے متعلق بھی اس نے کچھ کہا؟"

"ہاں، اس نے کہا تھا کہ آپ نامانس ہیں۔"

"اس کی بات پر بالکل یقین نہ کریں، وہ شخص بیمار ہے، وحشت خیز توہمات کا شکار، بڑا خطرناک آدمی ہے، اس سے بچیے۔"

"لیکن کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی کمپنی کا کیا کام ہے؟"

"پہلے آپ وعدہ کیجیے کہ آپ روز وُڈ کو نہیں بتائیں گے۔"

"میں قول دیتا ہوں۔"

"اچھا، سنیے، میں بھی ماہر تولیدیات ہوں اور انسانی بیضویات پر ایک زبردست تجربہ کر رہی ہوں، ہماری سروس اسی کا ایک حصہ ہے۔"

"آپ کا مقصد؟"

"انسانی نسل کو تہذیب سے بچانا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ تہذیب نے ناتندرست اور غیر موزوں لوگوں کو پناہ دے کر فرد کے مزید ارتقا کو روک دیا ہے۔ ہم ذہانت آمیز مصنوعی انتخاب کے ذریعے ایک ارتقا یافتہ مخلوق وجود میں لانا چاہتے ہیں۔"

"ونٹر کا طریق کار؟" ہیل نے چونک کر کہا۔

جین جیسے سٹپٹا گئی۔ "نہیں، ہمارا طریق کار بیضویاتی انجینیرنگ نہیں ہے۔ ہمارا طریقہ وہی ہے جو انسان کا رہا ہے یعنی ہم خاطر خواہ خصوصیت رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو تلاش کر کے ان کی شادی کرتے ہیں۔ ہم انسانی بیضوں پر بس روحانی توجہ سے کام لیتے ہیں۔ اچھا، ڈاکٹر ہیل، خدا حافظ! اُمید ہے آپ اپنے قول کا پاس کریں گے۔"

(۳)

ٹھیک دو بجے ڈاکٹر ہیل، روسٹ کی کوٹھی پر پہنچا۔

کوٹھی کیا تھی ایک قلعہ تھا۔ روسٹ کی کمپنی "کاموس" کی قوت اور وسعت کا مظہر۔ وہ بڑی گرمجوشی سے پیش آیا۔ بڑھاپے نے اپنے چنگل پوری طرح اس کے جسم میں گاڑ دیے تھے۔ چہرے پر اَن گنت جھرّیاں تھیں، گلے اور بازو کا گوشت لٹک رہا تھا، رنگ پیلا تھا جیسے کوئی بیماری اندر ہی اندر کام کر رہی ہو۔ روسٹ نے ہیل سے دیر تک باتیں کیں۔ ونٹر کی ناکامی اور لاکھوں روپے کے ضیاع کا رونا رویا اور آخر میں کہا:

"کمپنی کی حالت ان دنوں سخت ناگفتہ بہ ہے۔ نیو آسٹریلیا میں سیلاب کی وجہ سے کمپنی کو شدید نقصان پہنچا ہے، اس لیے ریسرچ کا کام جاری رکھنا تو مشکل ہے۔ البتہ ہمیں ایک ایسے سپیشلسٹ کی ضرورت ہے جو کمپنی کے حاسدوں اور دشمنوں کا گلا گھونٹ سکے۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟" ہیل نے معاملے کی گہرائی میں اُترنے کے لیے پوچھا۔

"بہت سے ہیں۔" روسٹ نے کچھ ایسے انداز سے کہا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ "ان میں سے ایک ناہنجار گندا چوہا، اخباری رپورٹر ہے جو حال ہی میں نیو آسٹریلیا سے ہمارا راز چرا کر لایا ہے اور بزعم خویش کاموس پر "بم" پھینکنا چاہتا ہے۔"

"اگر کوئی شخص سچی بات لکھتا ہے، تو اس کا گلا گھونٹ دینا کہاں کی دیانت ہے؟" ہیل نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "ایسے گندے کام میں میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

(۴)

"اچھا۔"

نکولاس وین نے اپنی خوف زدہ نگاہیں ڈان ہیل پر گاڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیسے یقین ہو کہ آپ کاموس کے آدمی نہیں۔"

"میں ایک ماہر تولیدیات ہوں۔ میں نیو آسٹریلیا کے پودوں کی نئی جنس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں

میرے پاس کچھ دستاویزات ہیں۔" اس نے بریف کیس کھولنا چاہا۔ وین گھبرا سا گیا۔

"ہتھیار نہیں، صرف دستاویزات۔" ہیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ کو میرا پتا کیسے چلا اور یہاں ہوٹل تک کیسے پہنچے؟ روسٹ ہی آپ کو بھیج سکتا تھا۔"

"روسٹ نے مجھے نہیں بھیجا، ہاں، اس نے آپ کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اس نے مجھے بھاڑے کا ٹٹو بنانا چاہا، مگر میں نے انکار کر دیا۔"

"مگر آپ نے انکار کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ وہ ایک سائنسی انکشاف کو ایکسپلائٹ کر رہا ہے جو اس نے میرے باپ کے دوست سے چرایا اور پھر اسے مار ڈالا تھا۔ نئی انواع پیدا کرنے کا طریقہ۔ آپ نیو آسٹریلیا سے آئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔"

"ہاں میں وہاں سے دنیا کو چونکا دینے والی مخلوق لایا ہوں۔ آپ ماہر تولیدیات ہیں اور مجھے ایک ایسے ماہر کی ضرورت ہے۔"

"اچھا، وہ مخلوق کہاں ہے؟"

"دکھاتا ہوں، مگر پہلے سُنیے یہ مخلوق کیسے ہاتھ آئی۔"

"یقیناً یہ ایک دلچسپ داستان ہوگی!"

"کاموس کے متعلق عجیب و غریب خبریں آ رہی تھیں، مگر حقیقتِ حال کا کچھ پتا نہ تھا۔ میں خود نیو آسٹریلیا پہنچا۔ کمپنی والوں نے حیرت افزا ترقی کے اعداد و شمار دے کر ٹرخا دیا، لیکن اس ترقی کا راز کیا تھا، اس کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا۔ آخر میں نے کھوج لگا ہی لیا۔ یہ سب "خچروں" کا کارنامہ ہے، مگر رینگنے والے خچر نہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب جانور ہے۔ ہاتھیوں سے بھی زیادہ قوی اور چست و چالاک، گونگا اور بہرا، بس کام سے کام رکھتا ہے،

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

چراغ لیکے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟

زندگی میں طوفاں بھی آتے ہیں، خوشیاں بھی۔ جب بڑھاپا آپہنچے گا اور آپ کمانے کے لائق نہ رہیں گے تو بہاریں پھر کہاں؟ وقت ہمیشہ سازگار نہیں۔ خیر اندیشی کا تقاضہ ہے کہ آپ بیمہ کرا کے اپنی اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کریں۔

خیبر انشورنس آپ کی ضروریات کے مطابق مختلف اور مفید منصوبے پیش کرتی ہے جو خوش آئند مستقبل کے ضامن اور سکون و مسرت کا پیش خیمہ ہیں۔

خیبر انشورنس آپ کے مستقبل کی محافظ ہے۔

خیبر انشورنس کمپنی لمیٹڈ

محمدی ہاؤس، میکلوڈ روڈ، کراچی — شاخیں پاکستان کے ہر حصہ میں موجود ہیں

KHAIRI

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

. اور مرتے دم تک کام کیے جاتا ہے۔ یہ جانور گارزنا می ایک شخص کو بالائی کاٹ کی کسی وادی میں ملا تھا۔ میرے ایک دوست نے نشے میں دُھت ہونے کے بعد بتایا۔"

"خچّر؟ کیا کوئی نمونہ آپ کے پاس ہے؟"

"ہاں ہے، مجھے ایک دریا کے کنارے مُردہ ملا تھا۔" وین نے چارپائی کے نیچے سے سوٹ کیس کھینچا۔ اس میں سے کینوس میں لپٹا ہوا ایک بنڈل نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اچانک باہر برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ کوئی دبے پاؤں آرہا تھا۔ ہیل نے اُٹھ کر دروازے سے باہر جھانکا۔ وہاں دُور دُور تک کوئی نہ تھا۔ "محض واہمہ تھا۔" اس نے واپس آکر کہا۔

"واہمہ؟" وین بڑبڑایا۔ بنڈل کھولا تو ایک حیرت ناک وضع کی سبز سی شے ہیل کے سامنے تھی۔ ہاتھ بھر لمبی، سر انسانوں کی طرح تھا، مگر ناک، منہ اور ہاتھ پاؤں سے بالکل وہ ایک ننھا سا عفریت معلوم ہوتا تھا۔ ہیل کو جھرجھری سی آگئی۔ بظاہر وہ مادّی ڈھانچہ دکھائی دیتا تھا، لیکن اس سے بُو آرہی تھی۔ یکایک قدموں کی چاپ پھر سنائی دی۔ ہیل فوراً اُٹھا اور باہر کی طرف لپکا۔ برآمدے اب بھی خاموش اور خالی تھا۔

وین نیو آسٹر بلیا سے واپس آتے ہی رپورٹ مرتب کرنے بیٹھ گیا تھا۔ رپورٹ کیا تھی، ایک بم شیل تھا جو کاموس کے ٹکڑے اُڑا دینے والا تھا، لیکن اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں رہے تھے۔ ہیل کی جیب میں بھی تھوڑی سی رقم تھی، وہ اُٹھا اور بازار سے کھانا لانے چلا گیا۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ پھر وین کے کمرے میں تھا، مگر کمرے کا منظر دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وین خون میں لت پت اپنے بستر پر مُردہ پڑا تھا۔ مُردہ خچّر، ہیل کا بریف کیس، جس میں ونٹر کے خطوط وغیرہ تھے اور وین کی تحریر کردہ نامکمل رپورٹ سب غائب تھے۔ ہیل کو کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا، مگر یہ کیفیت صرف چند لمحے رہی۔ وہ فوراً سنبھلا، دروازے کے پٹ ہولے سے بند کیے اور ہوٹل کے کلرک کے پاس آیا۔

"کیا کوئی شخص مسٹر وین سے ملنے آیا تھا؟"

"ایک نوجوان عورت آئی تھی، لمبی تڑنگی، گورے رنگ کی، اوور کوٹ پہنے ہوئے، مگر چہرے بشرے سے بالکل لڑکی دکھائی دیتی تھی۔"

"پھر وہ چلی گئی؟"

"ابھی چند منٹ ہوئے ہیں، کیوں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں، میں مسٹر وین سے کچھ کاروباری معاملہ طے کرتے آیا تھا، تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا، واپس آیا ہوں، تو دروازہ اندر سے بند ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی اور گاہک آیا ہے، مگر شاید اب مسٹر وین سو گئے ہیں، وہ خاصی تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔" ہیل نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس ڈالر کا نوٹ نکال کر کلرک کو دے دیا اور خود باہر نکل گیا۔

"یقیناً یہ کارستانی جین سیلیٹن کی ہے، کلرک کا بیان کردہ حلیہ ٹھیک اس سے ملتا ہے۔" وہ سوچ رہا تھا۔

(۵)

جین سیلیٹن سے ڈاکٹر ہیل کی بڑی تند و تلخ باتیں ہوئیں۔ ہیل نے جب یہ کہا کہ اس نے وین کو قتل کیا ہے تو جین کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ "خیر، میں وہ خچّر لینے آیا ہوں اور اپنا بریف کیس بھی۔" آخر کار ڈاکٹر ہیل نے کہا۔

"ہاں، وہ میرے پاس ہے، لیبارٹری میں۔۔۔ اُسے دیکھنا چاہتے ہو، تو میرے ساتھ آؤ۔" جین نے کہا۔

ہیل اس کے پیچھے پیچھے لیبارٹری میں پہنچا جہاں اس نے ٹیسٹ دیا تھا۔ اس کی نظر جست کے ایک بڑے سے برتن پر پڑی جس سے جھاگ اُٹھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا "خچّر" سیاہ رنگ کے بے وضع ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا اور آہستہ آہستہ سبز رنگ کے جھاگ میں تحلیل ہو رہا تھا۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"ڈاکٹر ہیل، مجھے افسوس ہے۔" ایک دھیمی سی آواز آئی۔
"ہم ایسا نہیں چاہتے تھے، مگر ——"

بس وہ اتنا ہی سُن پایا۔ اس نے مُڑ کر جین کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں دھات کی ایک چھوٹی اور پتلی سی ٹیوب تھی۔ اس نے جین سے ٹیوب چھیننے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ فوراً ہی ٹک کی آواز آئی۔ ٹیوب جین کی انگلیوں میں ٹوٹ گئی اور اس میں سے کوئی چیز نکل کر ہیل کے بازو پر گری۔ یوں محسوس ہوا جیسے گرم اُسترے کی دھار رکھ دی گئی ہو۔ پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

(۶)

"جاگو۔" ایک لڑکی اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "کیا تم اب بھی نہ جاگو گے؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا سر بوجھل تھا اور بازو دَرد کر رہا تھا۔ اس نے دہن پر زور ڈالا، مگر اسے کچھ یاد نہ آیا کہ یہ لڑکی کون ہے اور وہ خود کون ہے۔

"ڈاکٹر براؤن، آپ کو سوئے بڑی دیر ہو گئی ہے۔ آپ جاگیں گے نہیں؟" لڑکی پھر کہہ رہی تھی۔ "آپ ڈاکٹر گوناڈ براؤن ہیں، ماہر تولیدیات، آپ کو ملازمت کی ضرورت تھی نا، ملازمت آپ کو مل گئی ہے۔ آپ بیمار رہے ہیں اور سخت مشکل میں ہیں، آپ کا نہ گھر ہے، نہ دوست اور ساتھی، جیب بھی خالی ہے، لیکن مسٹر روسٹ نے آپ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ کی یادداشت کا کچھ حصّہ اس بیماری سے تباہ ہو گیا ہے، تاہم علمی و فنی شعور کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ مسٹر روسٹ نے آپ کو اپنا لیبارٹری ٹیکنیشن بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

ہیل خاموش سُنتا رہا اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔

اور جب وہ بیدار ہوا، تو اس نے ایک حیرت ناک تبدیلی محسوس کی۔ اس کی یادداشت عود کر آئی تھی! ایک ایک واقعہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا، نقاہت بھی جاتی رہی تھی، وہ ایک کشادہ کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ کھڑکی سے نیلگوں آسمان اُفق کی حدوں تک نظر آ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں جین سیملٹن اندر داخل ہوئی:

"ہیلو ڈاکٹر براؤن، کیا حال ہے؟" اور ڈاکٹر ہیل اس کا منہ تکتا دیکھنے لگا جیسے اس کی یادداشت پھر غائب ہو گئی۔

"آپ اس وقت نیو آسٹریلیا میں ہیں، کادموس کی بستی میں۔ مسٹر روسٹ آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں، مگر پہلے آپ کو اپنا کھویا ہوا علم حاصل کرنا ہو گا۔ لیجیے، یہ تولیدیات پر کچھ مضامین ہیں، ان کا مطالعہ کر لیجیے۔"

جین نے کاغذات کا ایک پلندا اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور رخصت ہو گئی۔ ہیل نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور وہ اُچھل پڑا۔ الفاظ کی نشست، فاصلہ، حروف کے دائرے اور پھیلاؤ، ہو بہو ڈاکٹر چارلس ونٹر سے ملتا تھا، کچھ بھی تو فرق نہ تھا۔ وہ سوچنے لگا: ونٹر زندہ ہے اور شاید اس بدمعاش روسٹ کی قید میں ہے۔

تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد جین پھر آئی: "ڈاکٹر براؤن، آپ مضامین پڑھ چکے ہوں گے اور اُمید ہے کہ آپ کا علم تازہ ہو گیا ہو گا۔ مسٹر روسٹ آپ کو بُلا رہے ہیں۔"

ہیل چپ چاپ اُٹھ کھڑا ہوا۔ عمارت سے نکلتے ہی دروازے پر ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ چوڑا چکلا، قوی، گہری نیلگوں آنکھیں، مگر اس طرح کھوئی ہوئی سی کہ پورا چہرہ متاثر دکھائی دیتا تھا۔

"مسٹر فان چیز، یہ ہیں ایک اور کاہل، آپ کی برادری کے فرد۔" اس نے نوجوان سے ہیل کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر براؤن، ان کا نام ہے اور لیبارٹری میں ٹیکنیشن مقرر ہوئے ہیں۔"

فان چیز نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ ہیل کو یوں محسوس

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نرالا سرف

آپ کے تمام سوتی کپڑے
دنیا بھر میں سب سے اُجلے دھوتا ہے

ہزاروں پاکستانی عورتوں نے سرف کو آزمایا اور دیکھا کہ سرف دنیا بھر میں سب سے اُجلے کپڑے دھوتا ہے!
اِس کی سیدھی سادھی وجہ یہ ہے کہ یہ صابنوں سے بہت مختلف اور کہیں بہتر ہے..... اِسی لئے سرف وہ کام کرتا ہے
جو اس سے پہلے ممکن نہ تھا۔
سرف سے سوتی کپڑے دھونا بہت آسان ہے۔ نہ پٹخنا نہ زور سے رگڑنا، سرف کا طاقتور جھاگ کپڑوں سے
میل کا ذرہ ذرہ الگ کر دیتا ہے۔ اور پھر سرف کم خرچ بھی ہے۔ گھر بھر کی دُھلائی کے لئے صرف ۳ بڑے چمچ کافی ہیں۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

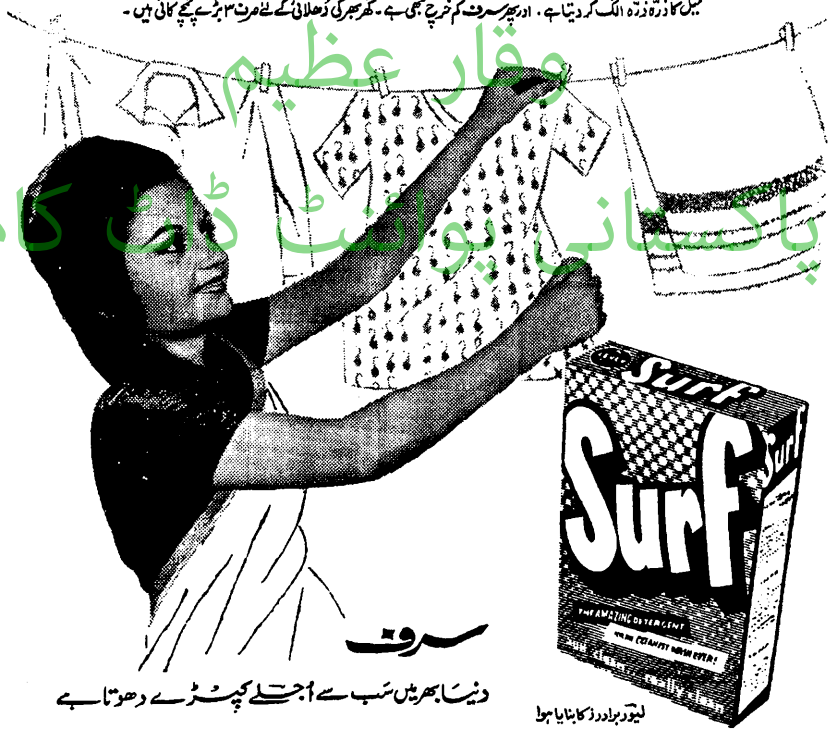

دنیا بھر میں سب سے اُجلے کپڑے دھوتا ہے

لیور برادرز کا بنایا ہوا

نئی آن
نئی شان

کیوینڈرز میگنم
سگریٹ خوبصورت پنّی
اور دیدہ زیب پیکنگ
میں دستیاب ہیں

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بڑے - اچھے - تازہ

کیوینڈرز
میگنم سگریٹ

۳۸ پیسے میں ۱۰

تیار کردہ:- پریسیر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ بہ اشتراک گوڈفرے فلپس لمیٹڈ۔ لندن

united

CAV / 7/3/66

ہوا جیسے وہ بھی اس کی طرح یادداشت گم ہو جانے کا محض بہانہ کر رہا ہو۔

روسٹ کا دفتر ایک خوشنما بنگلے میں تھا۔ ہیل کو کادموس کی بستی ایک نظر میں دیکھنے کا موقع مل گیا۔ نفیس عمارتوں کے مختلف بلاک قطار در قطار چلے گئے تھے۔ راستے میں دو ایک مقامات پر "خچّر" سڑک کی مرمّت میں مصروف تھے جو حالیہ سیلاب سے جا بجا ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

روسٹ سے دیر تک ملاقات رہی۔ اس کی گفتگو خاصی انکشاف انگیز تھی۔ کادموس کی بستی اور اس کے گردوپیش میلوں میں پھیلے ہوئے جنگلات اور کانیں سب خچّروں کی مرہونِ منّت تھیں، مگر اب خچّر مرنا شروع ہو گئے تھے اور نئی کھیپ تیار کرنے کی کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ یہ خچّر لیبارٹری میں تیار کیے جاتے تھے۔ مسٹر روسٹ کے بقول خچّروں کا "خالق" ڈاکٹر ونٹر مر چکا تھا اور اب اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ہیل، مسٹر روسٹ اور جین سیلٹن کی معیت میں لیبارٹری پہنچا۔ وہ مختلف حصّوں پر مشتمل تھی۔ ایک حصّے میں سوراخ تھا جس میں خچّر تیار کرنے کا محلول ڈالا جاتا تھا۔ دوسرے حصّے میں پیچیدہ مشینری کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ یہ محلول ان مشینوں میں پہنچتا تھا جہاں خچّروں کے اعضا و جوارح تیار ہوتے تھے۔ تیسرے حصّے میں ذرا مختلف قسم کی مشینری تھی، یہاں خچّر اپنی آخری شکل اختیار کرتے تھے۔ چوتھے حصّے میں تین فٹ گہرا وسیع تالاب تھا۔ خچّر اپنی پیدائش کے تیسرے اور آخری مرحلے سے گزر کر یہاں پہنچتے تھے اور تین ہفتے تک رکھے جاتے تھے۔ اس مدّت میں وہ پوری طرح پروان چڑھ جاتے اور پھر انہیں کادموس میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ یہ خچّر صرف ایک خلیے سے تیار ہوتے تھے اور ایک کھیپ میں بیک وقت ہزاروں وجود میں آتے تھے۔ خچّر مر رہے تھے اور نئے خچّر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ کمپنی تباہ ہو رہی تھی۔ کمپنی کے بینکرز پریشان تھے اور مزید سرمایہ فراہم کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے نیو آسٹریلیا آنے والے تھے۔ روسٹ کی خواہش تھی کہ ان کی آمد سے پہلے خچّر تیار ہونے لگیں تاکہ سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کو نئی بنیادوں پر کھڑا کیا جائے۔ روسٹ اور ہیل (ڈاکٹر براؤن) دیر تک اس موضوع پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے اور خچّر تیار کرنے کی نئی کوشش کا منصوبہ تیار ہو گیا۔

(۷)

کادموس مختلف حلقوں میں تقسیم تھا۔ ہر حلقہ دوسرے حلقے کے کارکنوں کے لیے ممنوع تھا؛ البتہ "کاہلوں" کی ایک جماعت اس سے مستثنیٰ تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں مسٹر روسٹ سے براہِ راست واسطہ پڑتا تھا اور کادموس کے مختلف شعبوں کے درمیان رابطے کا کام دیتے تھے۔ ڈاکٹر براؤن کو بھی اسی طبقے میں شامل کر لیا گیا، وہ بستی کے ہر گوشے میں جا سکتا تھا۔ اگرچہ وہ محسوس کرتا تھا کہ جب بھی وہ اپنے حلقے سے باہر جاتا ہے، کچھ آنکھیں اس کا تعاقب کرنے لگتی ہیں۔ چند ہی روز میں کادموس کے بھیانک تر پہلو اس کے سامنے آ گئے۔ کادموس خچّر ہی تیار نہیں کرتا تھا، بلکہ انسانی جوڑوں پر بھی تجربات کر رہا تھا۔ ان جوڑوں کو بطور ملازم باہر سے لایا جاتا تھا اور وہ کادموس کی "چار دیواری" میں قیدیوں کی طرح رہتے تھے۔ ان تجربات کے نتیجے میں عجیب و غریب وضع کے بچّے پیدا ہو رہے تھے۔ پیدا ہوتے ہی ان بچّوں کو نرسنگ ہاؤس میں بھیج دیا جاتا۔ بڑے ہوتے تو کادموس کے پہریدار بنا دیے جاتے۔ ایک روز اُسے ان بچّوں کو دیکھنے کا بھی موقع مل گیا اور اگرچہ وہ خود اس موضوع پر ریسرچ کر رہا تھا، مگر اس روز پہلی مرتبہ اس کے دل میں انسانی نسل کو بگاڑنے کی ان کوششوں کے خلاف نفرت کی آگ روشن ہو گئی۔ ان بچّوں میں کوئی بھی تو صحیح سالم انسان نہ تھا۔ دیووں اور عفریتوں کی ایک نئی جنس جنم دی جا رہی تھی جس کو دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے

اولمپیا

OLYMPIA

معیاری۔ خوبصورت۔ دیرپا اور ارزاں

قیمت ۸۵ روپیہ (چھوٹے سیکنڈ والی)
قیمت ۹۵ روپے (سینٹر سیکنڈ والی)
مندرجہ ذیل ڈیلروں سے طلب فرمائیں

بیسٹ واچ کمپنی۔ انارکلی، لاہور
ایس ایم شاہ اینڈ کمپنی۔ صدر روڈ، پشاور
مشتاق واچ ہاؤس۔ بازار اچھرہ سنگھ، گوجرانوالہ
نشاط واچ کمپنی۔ کوئٹہ
نظام واچ ہاؤس۔ ایڈورڈز روڈ، راولپنڈی
وائین برادرز۔ امین بازار، سرگودھا
پاکستان واچ ہاؤس۔ ریل بازار، لائلپور
کیپٹن واچ کمپنی۔ فریئر روڈ، سکھر

اولمپیا واچ کمپنی۔ الفنسٹن اسٹریٹ، صدر، کراچی

ہو جاتے تھے۔ اس روز وہ رات بھر نہ سو سکا اور ایک انسان کی حیثیت سے سوچتا رہا کہ ہم لوگ انسانیت پر کتنا ظلم کر رہے ہیں۔ میں خود ان بچوں میں شامل ہوتا، تو کیا ہوتا اور اسے جیسے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ روسٹ یقیناً ایک شیطان ہے۔ اس نے اس جال کا تار پود بکھیر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے چند روز میں مزید انکشافات ہوئے۔ روسٹ کی غیر انسانی سرگرمیوں کا کھوج لگانے کی جو لوگ کوشش کرتے رہے تھے ان میں سے اکثر کاموس میں غلاموں کی زندگی گزار رہے تھے جن کا حافظہ محو کر دیا گیا تھا اور وہ دنیا و مافیہا اور اپنے آپ سے بے خبر کام میں لگے ہوئے تھے۔ خچروں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ نری مشینی مخلوق نہ تھے، بلکہ جذبات اور احساسات کی رمق بھی ان میں موجود تھی اور یہی رمق ان کی اچانک موت کا باعث بنتی تھی۔ ونٹر نے انسانی ارتقاء کا جو خواب دیکھا، اس کی تعبیر کتنی بھیانک تھی! کاموس اس تعبیر کے بل پر بیس برس سے دنیا بھر کی دولت سمیٹ رہا تھا۔

خچروں کی "تخلیق" کی تیاری مکمل ہو گئی۔ روسٹ نے بنفسِ نفیس نگرانی کی۔ محلول ناند میں ڈال دیا گیا۔ مشینری نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مختلف مشینریوں کے میٹر اور حرارت کے تھرمامیٹر بار بار دیکھے جاتے رہے۔ ہر چیز ٹھیک کام کر رہی تھی۔ آخر خچروں کی پہلی کھیپ تالاب میں پہنچ گئی۔ جین سملٹن اور روسٹ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ تازہ کوشش کامیاب رہی تھی۔ ننھی ننھی مخلوق مچھلیوں کی طرح پانی میں تیر رہی تھی، لیکن چند گھنٹوں بعد جب دوبارہ جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ پوری کھیپ کی کھیپ ختم ہو چکی ہے۔ روسٹ کے چہرے پر حسرت اور مایوسی کے جذبات دیدنی تھے؛ تاہم جین اب بھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔

"ایک کوشش اور کرنی چاہیے، ہم یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔" اس نے کہا، مگر کمپنی کے بینکر زنیویارک سے روانہ ہو چکے تھے اور روسٹ کے پاس انہیں متاثر کرنے کا کوئی حربہ نہ تھا۔

(۸)

تین بینکرز کاموس پہنچ گئے۔ روسٹ نے بڑے تپاک سے اُن کو خوش آمدید کہا، مگر اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دل کے ناخوشگوار جذبات کی غمازی کر رہا تھا۔ بینکرز نے کمپنی کے ریسرچ دیکھے، باغات اور لیبارٹری کا معائنہ کیا۔ روسٹ سے بڑی تند و تیز باتیں ہوئیں۔ ایک بینکر جونز نے تو خچروں اور "کاہلوں" کے کھوئے کھوئے چہروں کو دیکھ کر کچھ ایسے تاثرات کا اظہار کیا جیسے اس کا انسانی شرف، وقار اور جذبات سخت مجروح ہوئے ہوں۔ ہیل بھانپ گیا۔ وہ موقع کی تلاش میں اس کے ساتھ ساتھ رہا اور آخر موقع پا کر اسے کہہ دیا کہ وہ نیویارک میں روز وُڈ ایجنسی سے رابطہ قائم کریں۔

بینکرز واپس چلے گئے۔ بظاہر ان کی اکثریت مطمئن تھی۔ اور روسٹ بھی مطمئن دکھائی دیتا تھا۔

(۹)

رات کے پچھلے پہر اچانک خطرے کا الارم خوفناک آواز میں بجنے لگا۔ ہیل اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں سویا پڑا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی، وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر دیکھا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ٹرک اور جیپیں سامان سے لدی ہوئی سڑک پر دوڑ رہی تھیں۔ وُوبلاک وُدر کمپنی کے دفتر کے قریب ایک زیر دست الاؤ جل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ عمارتوں کو لگنا شروع ہو گئی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ عمارتیں تعمیر کرتے وقت اہتمام کیا گیا تھا کہ جب بھی ضرورت پڑے انہیں نذرِ آتش کیا جا سکے۔

"اُف!" ہیل کا سر چکرا گیا۔ وہ روسٹ کے بنگلے کی طرف بھاگا۔ پوری کاموس شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھی، ایک محفوظ جگہ صرف روسٹ کی قیام گاہ تھی۔ جو بستی سے الگ تھی فرلانگ

ملّت
کپیسٹر فینز

بجلی کے اخراجات میں
کمی کے ضامن

ڈسٹری بیوٹرز برائے لاہور:

کریسنٹ الیکٹرک کمپنی بیڈن روڈ - فون: ۶۶۹۰۷
علی برادرز اینڈ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ دی مال فون ۶۵۵۲۹،
ولکن کمپنی لمیٹڈ دی مال ۲۱۱۹ - ۶۴۶۶۳ ۶۴۹۰۵

ڈسٹری بیوٹرز برائے راولپنڈی:

ولکن (پاکستان) لمیٹڈ ۳۱ دی مال فون ۶۴۲۷۵ - ۶۵۰۷۹

ڈسٹری بیوٹرز برائے پشاور:

انٹرنیشنل الیکٹرک اسٹورز پل پختہ فون ۲۹۱۷

تیارکنندگان:۔ میٹلیکس کارپوریشن لمیٹڈ کراچی۔ڈھاکہ

Crescent

MCL-3/66

کے فاصلے پر تھی۔ آگ کی روشنی میں رات، دن میں تبدیل ہو گئی تھی۔ راستے میں فان چیز ملا، نہایت مطمئن اور پُرسکون، جیسے کچھ بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔

"ہیلو فان چیز، یہ ہنگامہ کیسا ہے؟"

"کچھ بات ہے تو سہی، مگر ہمیں اس سے کیا سروکار، ہم تو اندھے اور گونگے غلام ہیں۔" اس کے لہجے میں شدید طنز تھی۔

"یقیناً فان "کاہل" نہیں ہے، بس سوانگ رچا رکھا ہے۔" ہیل نے جی ہی جی میں کہا۔ ہیل بدستور بھاگتا چلا گیا۔ بنگلے پر مسٹر روسٹ اور جین سیملٹن کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ پچھواڑے میدان میں ایک طیارہ کھڑا تھا۔ روسٹ اور جین دونوں بدحواس تھے۔

"ڈاکٹر ہیل، آپ آگئے؟" شاید ان کا خیال تھا، وہ زندہ جل مرا ہو گا۔ ہیل چونک گیا۔ نیو آسٹریلیا میں آنے کے بعد روسٹ نے پہلی مرتبہ اسے اصلی نام سے پکارا تھا۔ "کیا وہ سمجھ گیا تھا کہ مجھے "کاہل" نہیں بنایا جا سکا۔" اس کے دل میں ایک سوال اُٹھا۔

"ڈاکٹر ہیل نہیں، ڈاکٹر براؤن۔" ہیل نے کہا اور جین اور روسٹ دونوں مسکرا دیے۔

"ہیل یا براؤن ـــــ اب اس پر بحث کا وقت نہیں رہا، دشمن تعاقب میں ہے اور ہمیں بچاؤ کی فکر کرنی ہے۔" روسٹ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کے پیلے چہرے پر مُردنی چھا رہی تھی۔

"دشمن تعاقب میں ہے؟" ہیل نے سوال کیا۔ "کون دشمن؟" اور روسٹ نے ساری داستان کہہ سنائی۔ میکنرزتین مہینے کی مہلت دے کر گئے تھے، مگر ادھر انہوں نے پرواز کی، ادھر ریڈیو کے ذریعے کاموس کا مال اُونے پونے بیچ دینے، کاروبار روکنے اور کمپنی توڑ دینے کے احکام جاری کر دیے۔ ہم نے کسی کام سے نیویارک کے ساتھ رابطہ قائم کیا، تو یہ وحشت ناک خبر ملی۔ طرّہ یہ کہ انہوں نے روز وُڈ ایجنسی کو مطلع کر دیا اور اب حکومت کی فضائی فوج حرکت میں آگئی ہے۔ بس ڈیڑھ دو گھنٹے کی بات ہے۔ کاموس پر فضائی حملہ ہونے والا ہے، مگر خیر۔ یہاں خاکستر کے سوا انہیں کچھ نہ ملے گا۔ اس دوران میں ہمیں یہاں سے بچ کر نکل جانا چاہیے۔ بس پائلٹ فان چیز کا انتظار ہے۔

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

"دُور شمال میں برف پوش پہاڑوں کی ایک وادی میں۔ وہاں ایک کرسمس کا درخت اور ایک خلائی جہاز بھی ہے۔ کاموس نے پورا انتظام کر رکھا تھا۔ اگر زمین انقلاب نوعی کے تجربوں کے لیے تنگ ہو جائے، تو مریخ یا زہرہ کا رُخ کیا جائے۔"

ہیل کی نظر میں کرسمس کا وہ درخت اور خلائی جہاز گھوم گیا جو اس نے روز وُڈ ایجنسی کے دفتر میں دیکھا تھا۔ "کیا چارلس ونٹر بھی آپ کے ساتھ جائیں گے؟" ہیل نے سوال کیا۔

روسٹ ایک لمحے کے لیے سٹپٹا گیا اور پھر آہستہ سے کہا "ونٹر، وہ مدّت ہوئی مر چکا ہے۔"

"مر چکا ہے؟ جو کاغذات مجھے مطالعے کے لیے دیے گئے تھے، وہ ونٹر کے ہاتھ کے تھے۔ تازہ بہ تازہ لکھے ہوئے۔ ونٹر کا اندازِ تحریر میرے ذہن پر نقش ہے، وہ یقیناً زندہ ہے۔ اور آپ لوگوں کی قید میں ہے۔"

"میرا خیال ہے اب رازداری کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔" روسٹ نے رُک رُک کر کہا۔ "ونٹر میں ہی ہوں۔"

"آپ ہیں؟" ہیل حیرت سے چلّا اُٹھا۔

"ہاں، مَیں ہوں اور آپ میرے مرحوم عزیز دوست اور ساتھی کے بیٹے ہیں۔" اس نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسوّدے اور اس کے باپ کے خطوط بریف کیس سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے اور پھر چند سطریں اس کے سامنے تحریر کر دیں۔ ہیل دم بخود بیٹھا تھا، واضح شہادت اس کے سامنے تھی۔ "مَیں نے ہی آپ کی تعلیم و تربیت اپنی اُمنگوں کے مطابق کی ہے تاکہ آپ میرے

کام کو آگے بڑھا سکیں۔" روسٹ نے کہا۔ "ہمیں انسان کو ارتقا کی بلندیوں پر پہنچانا ہے۔"

"اگر انسانیت کے ارتقا کا عملی نمونہ وہی کچھ ہے جو میں نے یہاں "کاہلوں" "خچروں" "محافظوں" اور "زرنگ ہاؤس" کے مکینوں کی صورت میں دیکھا ہے، تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" ہیل نے جواب دیا۔ "میں جب سے یہاں آیا ہوں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں کہ کیا ہم سائنس دانوں کے پاس انسان اور انسانیت کی فلاح اور بقا کا یہی سامان رہ گیا ہے۔ مجھے آپ سے، اس ماحول سے اور اپنے کام سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے ہی ہینکیر جونز سے کہا تھا کہ وہ روز وُڈ کو ساری داستان سُنا دے۔ اگر ہمارے انسانی ارتقا کے خواب کی تعبیر یہی "کادموس" ہی تھی، تو اس کی اینٹ سے اینٹ بج جانی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنی ان کوششوں کو آپ خود بھی مجرمانہ سمجھتے تھے، ورنہ ایک مجرم کی طرح "شہادت" کو ضائع کرنے اور بچ کر نکل بھاگنے کی کبھی نہ سوچتے۔ اگر یہ سب کچھ انسان اور انسانیت کی خدمت تھا، تو پھر اسے برباد نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

ہیل مسلسل کہتا چلا گیا۔ روسٹ بے سکت ہو کر آرام کرسی میں دھنس گیا تھا اور جین شمال میں گھوم رہی تھی، شاید وہ کرسمس کے درخت تک جلد از جلد پہنچ جانا چاہتی تھی۔

"مسٹر ہیل، آپ کے خیالات نہایت وحشت ناک ہیں۔ شاید ہمارا تجربہ آپ پر بھی ناکام رہا ہے۔ انسان کی ہزاروں برس بوڑھی اور کارآزمودہ نسل کی خصوصیات آپ پر غالب رہی ہیں۔"

"ناکام تجربہ.....؟"

"ہاں، ناکام تجربہ..... جہاں تک میرا خیال ہے آپ ان افراد میں سے ہیں جنہیں روز وُڈ انجینیس نا مانس کہتی ہے۔ مگر آپ خود اپنی نوع کے دشمن ہو گئے ہیں۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا تجربہ آپ پر کامیاب نہیں رہا۔ افسوس، ہم نے ایک غلط آدمی پر اپنا وقت اور مال برباد کیا۔....."

"آپ نے ایک غلط آدمی ہی پر نہیں، ایک ہولناک خبط میں بھی اپنا وقت، مال اور علمی و ذہنی صلاحیتیں برباد کی ہیں۔ ہزار شکر، میں آپ کا تختۂ مشق نہ بن سکا، مجھے اپنے انسان ہونے پر فخر ہے، انسان کو نا انسان بنا کر اسے ارتقا کا نام دینا....."

اچانک فضا میں قیامت خیز گڑگڑاہٹ ہوئی۔ "وہ آ گئے!" جین گھبرا کر چلّائی۔ "فان چیز کہاں ہے؟ وہ ابھی تک نہیں آیا۔"

"فان چیز.....؟ وہ اندھا اور گونگا غلام؟ اسے آپ سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔" ہیل نے کہا۔ "وہ مجھے راستے میں ملا تھا۔ اس سے میں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ تو اُس نے یہی جواب دیا تھا۔ شاید اس پر بھی آپ کا تجربہ ناکام رہا تھا۔"

جنگی طیاروں کا ایک پورا سکوڈرن کادموس کی گنجتی ہوئی آگ پر فضا میں منڈلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طیارہ بنگلے کے پچھواڑے کھلے میدان میں اُترا اور تین اشخاص فوجی وردیوں میں ملبوس برآمد ہوئے۔ جین نے جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی، مُڑ کر روسٹ پر نگاہ ڈالی۔ "خبردار، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، مقابلے کی کوشش کی گئی، تو مہماری شروع کر دی جائے گی۔" طیارے کے مائیکروفون سے آواز گونجی۔

"فان چیز نے بھی دھوکا دیا۔" جین بڑبڑائی اور پھر اس نے فوراً اپنی جیب میں سے ایک ٹیوب نکالی۔ ہیل پیچھے کی طرف بھاگا۔ ایک مدھم سا کھٹکا ہوا اور ٹیوب سے فوارا اُبل پڑا——

آن کی آن میں جین اور روسٹ دونوں مُردہ پڑے تھے۔ آنے والوں میں روز وُڈ سب سے آگے تھا۔ اس نے ہیل کو پہچان لیا۔

"ہیلو ڈاکٹر ہیل، انسان کا ارتقا آپ نے دیکھ لیا؟"

کادموس کی سیاہ خاکستر بستی اس کے سوال کا خاموش جواب دے رہی تھی۔

(بنیادی خیال اور پلاٹ کے بعض حصے جیک لیمسن سے مستعار لیے گئے)

■■

★

آئیے ہم آپ کی حاضر دماغی کا امتحان لیں۔ نیچے دیے ہوئے سوالوں کے فوراً جواب دیجیے۔ ہر سوال کے پانچ نمبر ہیں۔ آخر میں دیے ہوئے جوابات کی مدد سے اپنے نمبر متعین کیجیے۔

۱۔ اِس تصویر میں کیا غلطی ہے؟

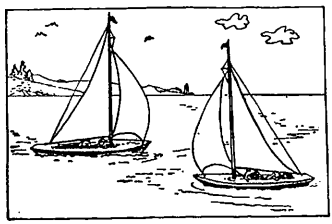

۲۔ ان خطوط میں سے کون سے دو خطوط متوازی ہیں؟

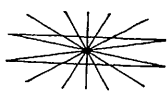

۳۔ نیچے دیے ہوئے ہندسوں کو اس طرح ترتیب دیجیے کہ دائیں سے بائیں ہر قطار میں، اُوپر سے نیچے اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک تین تین ہندسوں کو جمع کرنے سے حاصلِ جمع ۱۵ ہو۔

۶	۱	۷
۸	۵	۳
۲	۹	۴

۴۔ ذرا غور سے دیکھیے اس گھڑی کے ڈائل میں کیا نقص ہے؟

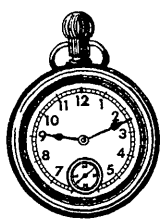

۵۔ اِس خاکے کا کتنا فیصد سیاہ ہے؟

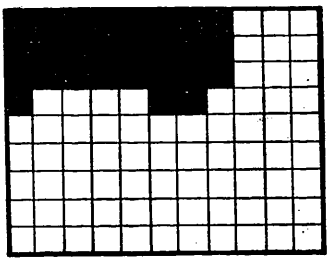

۶۔ اِس منظر میں کیا خرابی ہے؟

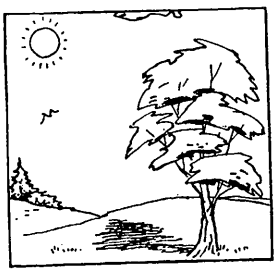

۷۔ گنے بغیر پہلی نظر میں بتائیے کہ سامنے کی شکل میں سفید خانے کتنے ہیں؟

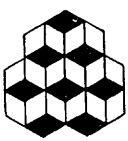

۸۔ کیا یہ سوال درست ہے:

۹۶۴٫۳۲ + ۰٫۶۰۰ = ۹۶۴٫۳۲

۹۶۴٫۳۲ × ۰٫۶۰۰ = ۹۶۴٫۳۲

(جواب صفحہ نمبر ۱۱۸ پر)

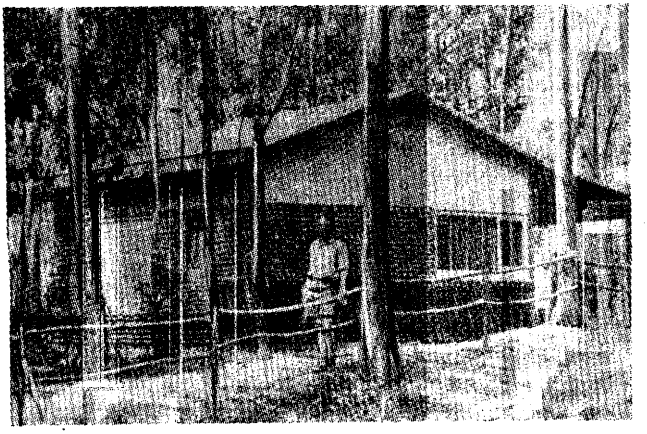

دلچسپ و عجیب

شیشے کا محل

نیوزی لینڈ میں ایک شہر کوئنز ٹاؤن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے قریب ایک جھیل ہے جس کا نام واکا پٹو ہے۔ اس کے کنارے اپنی نوعیت کا ایک بہت ہی انوکھا بنگلہ ہے۔ اس کی دیواروں کا نچلا حصّہ سیاہ شیشے کی نو ہزار آماسی بوتلوں سے تعمیر ہوا ہے۔ بوتلوں کو سیمنٹ سے اس طرح جوڑ دیا گیا ہے کہ ان کے سر باہر کی طرف نظر آتے ہیں۔ طاقچوں، دریچوں، الماریوں اور کھڑکیوں میں مختلف رنگوں کی بوتلیں استعمال کی گئی ہیں جس سے عمارت میں دلکش تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ دیواریں آٹھ فٹ اونچی ہیں جن پر ہارڈ بورڈ کی چھت ڈالی گئی ہے۔ شام کے وقت جب شیشے کے فانوس میں بجلی کے قمقمے جگمگاتے ہیں تو سحر انگیز سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ بنگلہ چند سال قبل سیاحوں کی قیامگاہ تھا۔ لیکن اب حکومت نے اسے قابلِ دید مقامات کی فہرست میں شامل کر لیا ہے اور اندر جانے کے لیے ہر شخص کو چھ پنس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ لوگ دُور دُور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور آنے والوں کی تعداد روزانہ دو ہزار سے کم نہیں ہوتی۔

۲۴ فٹ
لمبا انسان

جنوب مغربی ٹرانسوال میں دُور دُور تک عجیب وغریب چٹانیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ چٹانیں اس طرح کی ہیں کہ تین ٹکون کی شکل میں کھڑی ہوئی ہیں، چوتھی ان پر عموداً جمی ہوتی ہے اور ہر چٹان کئی ٹن وزنی ہے۔ چند سال ہوئے ان چٹانوں میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی اور ان کے درمیان ایسی جگہ اُبھر آئی جس پر بہت بڑے پاؤں کا نشان تھا۔ یہ نشان انگوٹھے سے ایڑی تک چار فٹ ڈھائی انچ لمبا ہے، جب کہ ایک اوسط قد کے پاؤں کی لمبائی بارہ انچ ہوتی ہے۔ اگر اسے کسی انسان کا پاؤں قرار دیا جائے تو وہ شخص کسی طرح چوبیس فٹ سے کم قامت کا نہ ہوگا۔

ماہرینِ ارضیات نے اس عجیب وغریب نشان کا معاینہ کرنے کے بعد خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ جگہ آج سے دو ڈھائی لاکھ سال پہلے دلدل تھی ۔ پاؤں کے بوجھ سے کچھ دلدل آگے کھسک گئی، کچھ انگلیوں کے درمیان اُبھر آئی۔ وہ یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ ان چٹانوں کا دیو قامت انسانوں سے کیا تعلق تھا۔

اس قسم کے آثار مصر، ہندوستان، آئرلینڈ، برٹنی، سکنڈے نیویا، میکسیکو اور سکاٹ لینڈ میں بھی پائے گئے ہیں۔ مصر میں انہیں اوسیرس، ہندوستان میں مہاتما بدھ اور آئرلینڈ میں سینٹ پیٹرک کے پاؤں کے نشانات قرار دیا جاتا ہے۔

۱۔ بجنے والا پتھر

۲۔ جھوٹ کی یادگار

۱۔ امریکہ کی ایک وادی، وائٹ ہاؤس میں کنگسٹن ازل کے قریب ایک پتھر ہے جسے لوگ "بجنے والا پتھر" یا "شاہ الفریڈ کا بگل" کہتے ہیں۔ اس پتھر میں اوپر کی طرف ایک کشادہ سوراخ ہے جس میں پھونک مارنے سے اتنی زوردار آواز پیدا ہوتی ہے کہ دو میل تک سنی جا سکتی ہے۔ مقامی روایات کے مطابق ۸۷۱ء میں جب ڈنمارک اور جرمنی میں جنگ ہو رہی تھی، الفریڈ نے اسی پتھر کی گونج سے اپنی منتشر فوجوں کو اکٹھا کیا تھا۔ یہ پتھر آج کل ایک دیہاتی کی ملکیت ہے جو ہر سیاح سے دس پنس وصول کرتا ہے۔

۲۔ شمالی امریکہ کے شہر ڈیوینرس میں ایک مینارہ "جھوٹ کی یادگار" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ غلہ منڈی کے عین وسط میں واقع ہے اور اس کی بلندی سو فٹ ہے۔ اس کے کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے:

"یہ ۲۵ جنوری ۱۸۵۳ء کا ذکر ہے ایک خاتون رتھ پیرس نے اپنی تین سہیلیوں سے کہا: "آؤ منڈی چلیں اور وہاں سے گندم خریدیں"۔ اس مقصد کے لیے ایک خاتون کے پاس رقم جمع کر لی گئی۔ یہ چاروں خواتین جب منڈی پہنچیں تو اس عورت نے جس کے پاس رقم جمع تھی، محسوس کیا کہ رقم کم ہے۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کچھ دیر سوچتی رہی، معاً اسے یاد آیا کہ رتھ نے اپنے حصے کی رقم ادا نہیں کی۔ رتھ نے جواب دیا کہ وہ رقم ادا کر چکی ہے اور کہا: "اگر یہ جھوٹ ہو تو خدا مجھے موت دے" وہ غصے کے عالم میں یہی الفاظ بار بار دہراتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گری اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ مطلوبہ رقم اس کی مٹھی سے برآمد ہوئی، یہ مینارہ اسی عبرتناک واقعے کی یاد تازہ کرتا ہے۔

جیتی جاگتی زندگی

محترمی!

بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہم نائی ہیں لیکن تین چار پشتوں سے ہمارے اجداد نے یہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی محنت اور دیانت سے خوب ترقی کی۔ نظرتاً وہ نیک لوگ تھے اور دوسروں کی دلآزاری گناہ تصور کرتے تھے۔ میرے والد سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھے اور اپنے حلقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، گھر میں ہر طرح کی سہولت میسّر تھی۔ والد نیک اور پرہیزگار تھیں۔ سارا محلہ ان کی عزت کرتا تھا۔ ان کی قربت سے ہم سب پانچ وقت نماز پڑھتے تھے۔ میں ہر روز بلا ناغہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ فارسی سے رغبت ورثے میں ملی تھی، اکثر سعدی کا کلام گنگنایا کرتا۔ اردو میں اقبال اور عدم پسندیدہ شاعر تھے۔ ایمانداری اور شرافت کا یہ عالم تھا کہ دسویں جماعت میں لیبارٹری کی چابیاں میرے پاس ہوتی تھیں اور میں سب لڑکوں میں سامان تقسیم کیا کرتا۔ اساتذہ سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کیا، کالج میں داخلہ لیا اور محنت، خلوص اور سچائی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ ایف۔ ایس سی کے پہلے سال میں اوّل رہا، یہیں سے دُکھ بھری داستان شروع ہوتی ہے۔ یہ دُکھ آج بھی میری زندگی میں زہر گھول رہے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ہمارا گھرانا کوئی پچاس سال سے اس شہر میں مقیم تھا، اس لیے وہاں بہت لوگوں کو ہماری ذات کے بارے میں علم تھا، مگر وہ لوگ ذات پات کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ کالج میں میرے ساتھ اسی آبائی شہر کے ایک طالب علم تھے جنہیں سیّد ہونے کی وجہ سے سب لوگ "شاہ صاحب" کہتے تھے۔ کالج میں میں اوّل رہا اور وہ دوم۔ نتیجے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو مبارکباد بھی دی۔ چند روز بعد کالج گیا، تو ہر لڑکے کے پاس سادہ کاغذ پر مختلف اوزاروں (استرہ، قینچی، کنگھا وغیرہ) کی تصاویر بنی ہوئی دیکھیں ــــ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب "اشتہارات" محترم شاہ صاحب نے تقسیم کیے تھے۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا، کچھ لڑکوں نے شاہ صاحب کی اس حرکت پر رنج کا اظہار کیا، لیکن اکثر نے اس "اچھوتے" مذاق پر انہیں داد دی۔ میں نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھی اور خاموش رہا۔ جس نے بھی دریافت کیا صاف بتلا دیا کہ شاہ صاحب سچے ہیں اور میں واقعی نائی ہوں۔ گھر واپس آیا، تو والدہ نے اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا ــــ میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ صبح نماز پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے قدرت نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے جو مجھے ایسی ذات میں پیدا کر دیا جس کا لوگ مذاق اُڑاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ نماز چھوٹ گئی۔ والدہ سے جھوٹ بول کر عشا کی نماز کے بجائے سینما دیکھنے لگا۔ دوستوں کو خوب دعوتیں دیتا تاکہ وہ مجھے عزت و احترام کی نظر سے دیکھیں اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں مالی یا مادّی طور پر کسی سے کم ہوں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ ایف۔ ایس سی۔ فائنل میں تھرڈ ڈویژن آئی۔ سکول کے سائنس ماسٹر صاحب میرے پاس آئے اور میرے چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ مار کر رخصت ہو گئے۔ بعد میں جب بھی ان سے ملا، ان کی آنکھیں بھر آئیں، مگر کبھی انہوں نے کھل کر بات نہ کی۔ ہمیشہ رسمی سی گفتگو کی اور چل دیے۔ بی۔ ایس سی میں داخلہ لینے کے بعد میں نے فلائنگ (ہوابازی) کی مشق شروع کی۔ یہاں ماحول خاصا آزاد خیال تھا، اس

لیے محنت کی وجہ سے خوب ترقی کی اور بہت جلد ہوائی جہاز چلانا سیکھ لیا۔ میرے پرانے "مہربان" شاہ صاحب یہاں بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپنا اثر و رسوخ "استعمال کیا، چنانچہ پائلٹ کے انتخاب کے وقت انسٹرکٹر نے میرے بارے میں کہا:

"وہ بہت اچھا ہوا باز ہے، لیکن شاید ایک اچھا افسر نہ بن سکے، سنا ہے کہ وہ نائی ہے۔"

اس واقعے نے مجھے ادھ موا کر دیا، طبیعت میں پژمردگی آ گئی۔ غیر شعوری طور پر خوشامد پسند بنتا چلا گیا۔ ہر وقت اچھا جناب، جی حضور جیسے الفاظ زبان پر رہنے لگے۔ انتخاب میں ناکامی پر بہت رویا۔ گھر گیا، تو والد صاحب سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے ظاہراً تو مجھے خاصی تسلیاں دیں، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ خود بھی اس واقعے سے بہت پریشان تھے۔ تعلیم جاری رکھی۔ ایک نیا میدان تلاش کیا، لیکن متعلقہ مضمون میں داخلہ نہ مل سکا۔ ڈھاکے تک کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ آخر ایک ایسا محکمہ نظر آیا جس میں ملازمت کر کے میں اپنے شہر سے دُور رہ سکتا تھا۔ کچھ عرصہ میں بڑے ٹھاٹھ سے ملازمت کرتا رہا، ہر ایک میرا مداح تھا۔ میں خوش تھا اور زندگی کے بارے میں پُر امید۔ نماز بھی باقاعدگی سے پڑھنے لگا، لیکن چند سال بعد میری تبدیلی اس ضلع میں ہو گئی جہاں میرے والدین مقیم تھے۔ ان دنوں میں بہت نیک دل تھا۔ اکثر ملزموں کو سزا دیے بغیر تنبیہ کر کے چھوڑ دیا کرتا۔ اس زمانے میں ایک ایسے صاحب میرے افسر بن کر آئے جنہیں میری شرافت، نیکی، دیانت داری اور نماز وغیرہ سب "فراڈ" دکھائی دیتے تھے۔ وہ ہر ایک سے کہتے کہ اگر اس ذات کے لوگ افسر ہے، تو یہ محکمہ بدنام ہو جائے گا۔ تنگ آ کر تبادلے کی کوشش کی۔ ان سے مل کر صرف اتنا کہا کہ جناب میں نے خدائے تعالیٰ سے کبھی عرض نہیں کی تھی کہ مجھے کسی نائی کے گھر پیدا کر اور نہ خدائے تعالیٰ نے نائیوں کے بارے میں کسی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اگر پھر بھی میں قصوروار ہوں، تو خدارا ان بچوں کا تو خیال کیجیے جو میرے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ جواب ملا: "محکمے کے وقار کو ٹھیس پہنچ رہی ہے، تبادلے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم چند ماہ میں کچھ سرمایہ جمع کرو اور ملازمت چھوڑ کر کوئی کاروبار کر لو۔"

کوشش کے باوجود تبادلہ نہ ہو سکا اور افسرِ اعلیٰ نے اعلیٰ کارکردگی اور شاندار رپورٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک غلط محکمانہ کمیں میں اُلجھا کر مجھے چھٹی دے دی۔ قانوناً اس "جبری چھٹی" پر میں حکومت سے اپیل کر سکتا تھا، لیکن یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت کہاں مجھے؛ زہر کے سے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سفید کپڑے پہن کر کسی گندے نالے میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ اس واقعے کو ایک مدت بیت چکی ہے۔ آج کل میں اپنے آبائی شہر سے سینکڑوں میل دُور رہتا ہوں، اتنا کما لیتا ہوں کہ دو وقت کی روٹی اور بچوں کا خرچ پورا ہو جاتا ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ میرا بچہ سکول میں پڑھتا ہے، اس کی والدہ گھر پر بھی اسے پڑھاتی ہے، خاصا ذہین بچہ ہے جب بھی میں اسے کسی لڑکے کے ساتھ دیکھتا ہوں، تو لاشعوری طور پر اسے ڈانٹتا ہوں، اکثر سمجھاتا ہوں کہ کسی سے دوستی نہ رکھو۔ جب کبھی اسے دیر ہو جائے، تو سائیکل پر سکول لے جانے کے بجائے چھٹی کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ پڑھ کر کچھ اچھا نہیں کر رہا اور جیسے تعلیم فضول چیز ہے۔ کوئی اس کی ذہانت کی تعریف کرتا ہے، تو خوش ہونے کے بجائے افسردہ ہو جاتا ہوں۔ نئے دفتر میں لوگ مجھے پسند کرتے ہیں، لیکن جب کوئی تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں، کوئی گھر آئے، تو صاف کہتا ہوں کہ صاحب مجھ سے باہر ہی ملا کیجیے، پھر بھی لوگ گھر ملنے چلے آتے ہیں۔ ایک بار بیمار ہوا، تو ہسپتال میں ایک قطار سی بن گئی۔ اپنے لیے اتنی ہمدردی دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہا۔ کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ میری تعریف کرتا ہے، تو اس سے ہمیشہ دُور بھاگتا ہوں۔ مشہور ہے کہ آدمی تو بہت نیک ہوں، لیکن دماغ کے کچھ پُرزے ڈھیلے ہیں۔ سوچتا ہوں کب بچے بڑے ہوں اور انہیں لے کر کہیں اور چلا جاؤں۔ بچوں کے دوست مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ بیوی، بچوں کی تعلیم سے عدم دلچسپی اور بیزاری دیکھ کر الگ

کڑھتی ہے، وہ بے چاری بھی حق پر ہے، میں الگ پریشان ہوں۔ اس وجہ سے گھر کا ماحول بھی چنداں خوشگوار نہیں۔ خدا کے لیے مجھے بتائیے کیا واقعی میرے دماغ کے چند پُرزے ڈھیلے ہیں اور کیا آپ کوئی ایسا طریقہ بتا سکتے ہیں کہ مَیں انہیں درست کرنے میں کامیاب ہو جاؤں ؟

میرے دِل شکستہ بھائی، مَیں آپ کو سلام شوق پیش کرتا ہوں۔ آپ کے خط نے دِل پر گہرا اثر کیا۔ احساس کی اتنی تُند موجیں اُٹھیں کہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہ رہا۔ ہائے! ابھی محبت اور احترامِ انسانیت کا چلن عام نہ ہو سکا۔

انسان کتنا نادان ہے! وہ نہیں جانتا کہ اس کی زبان سے بے احتیاطی میں نکلے ہوئے الفاظ کہاں کہاں برق بن کر گرتے ہیں اور کتنی خوشگوار زندگیوں کو بھسم کر دیتے ہیں۔ سوچتے سوچتے میرے اعصاب ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ انسانوں کی تمام نادانیاں، ان کی نازیبا حرکتیں، ان کی زیادتیاں اور ان کے مکروہ افعال میرے ذہن پر منوں بوجھ ڈالتے رہے۔ مَیں مایوسیوں میں دھنستا چلا گیا ــــ اور پھر دفعتہً خیال آیا کہ مجھے تو اپنے ایک دِل شکستہ بھائی کا سہارا بننا ہے۔ اگر میں خود ہی گر پڑا، تو پھر سہارا کیونکر بنوں گا۔

میرے سکوں ناآشنا بھائی، مَیں بھی کبھی آپ ہی کی طرح پریشان حال تھا، برسوں اسی کیفیت میں گزرے ہیں۔ چند تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا اور اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا، لیکن جہاں بھی جاتا وہی تلخ حقائق میرا پیچھا کرتے، میری راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی، سکون کا ایک لمحہ میسّر نہ تھا ــــ اور پھر مجھے سکون مل گیا۔ یہ کیسے ملا؟ یہ بات سب سے آخر میں بتاؤں گا، انتظار کر لو گے نا؟ مجھے سکون کیونکر ملا ــــ یہ بات سمجھنے کے لیے آپ کو ایک خاص ذہنی ماحول میں پہنچنا ہوگا۔ آیئے ہم دونوں اسی ماحول میں چلتے ہیں۔

یہ دیکھیے، آپ کے سامنے زندگی پھیلی ہوئی ہے۔ مسکراہٹیں، تلخیاں، کامرانیاں، ناکامیاں اور شادمانیاں اور محرومیاں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کچھ چہرے پہلے کرب کی حالت میں تھے لیکن اب وہ شاداب نظر آتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ ایک گروہ اپنے چہروں پر پژمردگی کی زردیاں لیے ہوئے ہے اور اس زردی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے اگر غور سے دیکھا ہے، تو یہ بھی محسوس کر لیا ہوگا کہ ہر چہرے پر ایک تازہ زخم ضرور نظر آتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں زخم مندمل ہو رہے ہیں اور کہیں اور بھی زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔

میرے حسّاس بھائی، زندگی کے دامن میں پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ ہر شخص کی زندگی میں کانٹے آتے ہیں اور کانٹوں کی شکل مختلف ہوتی ہے۔ کہیں غربت کے کانٹے ہیں اور کہیں ذات پات کے، کہیں معاشرتی ناانصافیاں کانٹے کی شکل میں آتی ہیں اور کہیں معاشی ناہمواریاں زخم کر کر کے گہرا کر دیتی ہیں۔ کیا آپ نے حسرتوں کے وہ کانٹے نہیں دیکھے جو پیدائشی نابینا کے سینے میں چُبھے رہتے ہیں، وہ پھول سا بچہ جو پیدائش کے دو مہینے بعد ماں اور باپ کے سایے سے محروم ہو گیا، اس کی بدنصیبیوں کے کانٹے کون چُنے گا؟

بھائی، آپ کے سامنے بھی دو ہی راستے کھُلے ہیں۔ آیئے، ہم ان دونوں راستوں پر چل کر دیکھیں اور پھر اس بات کا جائزہ لیں کہ ہم کہاں پہنچتے ہیں۔

ایک راستہ دَرد کی شدّت سے بلبلا اُٹھنے اور دَرد سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ دقفوں کے بعد مارفیا کے انجکشن لگوانے کا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی تمام صلاحیتیں بے کار ہو جائیں گی۔ آپ کی ازدواجی زندگی اور ناخوشگوار ہو جائے گی، آپ کے بچّے آپ کی کشمکش سے اس طرح متاثر ہوں گے کہ اُن کی باضابطہ شخصیت کبھی اُبھر نہ سکے گی۔ آپ شہر پہ شہر چھوڑتے چلے

جائیں گے اور آپ کو کوئی نہ کوئی نائی کہنے والا مل جائے گا۔ یہ معاملہ ہی کچھ ایسا ہے۔ زندگی میں آپ جتنے بھینپیں گے، اتنے ہی نکّو بنیں گے، آپ ملک بھی چھوڑ دیں گے، تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اوّل تو آپ کو دل کی خلش بے قرار رکھے گی اور دوسرے یہ کہ اگر وہاں بھی کوئی شناسا مل گیا، تو پھر کیا ہو گا؟ آج کل فاصلے اتنے سمٹ گئے ہیں کہ فرار کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔ فرار کا راستہ آپ کی شخصیت کو تباہ کر دے گا۔ آپ کے بچّوں کا مستقبل خراب ہو جائے گا اور اس طرح آپ کے والد نے خاندان کو جو شہرت عطا کی تھی، وہ بھی بالآخر برباد ہو جائے گی۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ آپ ایک معاشرتی زیادتی کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ آپ نائی کا لفظ سننے کے لیے تیار رہیے اور اپنے بچّوں کو بھی تیار کیجیے۔ آپ ایک دفعہ اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیں، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی تلخی آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی جائے گی۔ زندگی میں بہت نرم و نازک اور حسّاس بننے سے کام نہیں چلتا۔ زندگی تو پتھر پھینکتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ آپ ان پتھروں سے محفوظ رہنے کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ مجھے اس لفظ کا سامنا کرنا ہے، تو پھر یہ لفظ آپ کے لیے بے معنی ہو جائے گا اور آپ میں ہلکا سا ردِّ عمل بھی پیدا نہ ہو گا۔

اس محاذ پر فتح مندی حاصل کرنے کے بعد آپ ترقّی کی طرف مسلسل قدم بڑھا سکتے ہیں۔ دراصل آپ جس آزمائش سے دوچار ہیں، اس کے گہرے تجزیے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ قدرت آپ کو ایک غیر معمولی انسان بنانا چاہتی ہے۔ جو لوگ آپ کے راستے میں روڑے اٹکاتے رہے ہیں، وہ دراصل آپ کی غیر معمولی شخصیت سے خائف تھے۔ یاد رکھیے، مخالفت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ کی ذات کسی کے لیے چیلنج بن رہی ہے۔ جس شخص کے لیے آپ چیلنج بنتے ہیں، وہ اوچھے حربوں سے آپ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر اس حملے کو آپ پوری قوّت سے روک لیتے ہیں، تو یہ بات آپ کی کامیابی کے امکانات کو بہت روشن کر دیتی ہے، لیکن اگر آپ پہلے ہی وار میں شکست کھا گئے، تو پھر آپ کی اُبھرتی ہوئی شخصیت ہمیشہ کے لیے دب کر رہ جائے گی۔ کالج کے دنوں میں "شاہ" صاحب نے وہی حربہ استعمال کیا جو ہر کمزور آدمی استعمال کیا کرتا ہے۔ آپ نے اس وقت مدافعت تو کی، لیکن ذہنی طور پر آپ شکست کھا چکے تھے اور یہی ذہنی شکست آپ کے لیے دوسرے مقامات پر ناکامیوں کا باعث بنی، پھر آپ ہر محاذ پر پسپا ہوتے چلے گئے۔ ملازمت کے دوران میں آپ سے جو زیادتی ہوئی، آپ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے تھے، لیکن چونکہ آپ اپنے اندر احساسِ کمتری کا چور چھپائے بیٹھے تھے، اس لیے آپ پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ میرے بھائی، لوگ تو ناجائز حقوق کے لیے کس قدر ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے کام لیتے ہیں اور آپ ہیں کہ اپنے جائز حقوق کے لیے بھی سینہ تان کر آگے نہ آ سکے۔ آپ کے اس اندازِ گریز پائی نے آپ کی غیر معمولی شخصیت مخنّم کر ڈالی، اور اسی بات کا مجھے سب سے زیادہ افسوس ہے، لیکن آپ کی بے پناہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اُمید کی یہ کرن جگمگاتی رہتی ہے کہ آپ جلد ہی اپنی شخصیت کو پھر اُبھار لیں گے۔

شخصیت کو دوبارہ اُبھارنے کا موثّر طریقہ صرف ایک ہے۔ آپ اس بات پر فخر کرنے لگیں کہ کبھی آپ کے آباؤ اجداد نے نائی کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ آخر اس میں شرمانے اور بھینپنے کی کیا بات ہے۔ ہاتھ سے کام کرنے میں وقار ہے، عزّت ہے اور فخر ہے۔ ہمارے اسلاف میں ایسے بھی تھے جو اپنے ہاتھوں سے جوتیاں گانٹھتے تھے، ان میں جولاہے بھی تھے، تو کیا ان کی عظمت میں کوئی فرق آیا، بلکہ وہ تو ان چیزوں کا فخر سے اعلان کیا کرتے تھے، پھر آپ نے تاریخ میں یہ بات بھی پڑھی ہو گی کہ حجّاموں، جولاہوں اور موچیوں کے بچّوں نے جوان ہو کر تاریخ میں عظیم الشان کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اسی

شہادے میں ہم "محبت فاتحِ عالم" کے عنوان سے ایک حبشی کی ڈائری شائع کر رہے ہیں۔ اس حبشی اُستاد کو اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا جس سے آپ دوچار ہیں۔ اس نے شکست نہیں کھائی، بلکہ وہ ایک جواں عزم کے ساتھ کام کرتا رہا اور آخر ایک ذہنی انقلاب لانے میں کامیاب ہو گیا۔

آپ بھی اپنے گرد حصار کھینچنے کے بجائے زندگی کے میدان میں آگے بڑھیے اور ان قوتوں کا ہاتھ بٹائیے جو اِس معاشرے میں ذہنی انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ آپ مدافعانہ جنگ لڑنے کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کیجیے اور اس بات سے ایک لمحے کے لیے خوف نہ کھائیے کہ لوگ آپ کو کیا کہتے ہیں۔

آپ کی شخصیت تو اتنی دلکش ہے کہ اگر آپ نے معاشرتی تعلقات کو منظم کرنا شروع کر دیا، تو چند ہی برسوں میں آپ ہزاروں ذہنوں کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ محفلوں اور معاشرتی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیجیے اور جو شخص آپ کے راستے میں آتا ہے، اس سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی جاندار شخصیت کے آگے کوئی نہ ٹھہر سکے گا۔ زندگی کی مسرتیں حاصل کرنا آپ کا حق ہے اور کسی کو یہ حق چھیننے کی اجازت نہ دیجیے۔

آپ قرآنِ حکیم، سیرتِ نبویؐ اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ

کرتے رہیے، آپ یہاں سے نشاطِ روح اور دل کا سکون حاصل کرتے رہیں گے۔ آپ پر یہ جلد ہی واضح ہو جائے گا کہ ایک فرد میں معاشرے کو جھنجھوڑ دینے کی کتنی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔

سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے بچوں کو اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ابھی سے تیار کیجیے۔ آپ کے والد صاحب نے آپ کو ذہنی طور پر پوری طرح تیار نہیں کیا تھا۔ اگر وہ آپ کو اس ناخوشگوار صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیتے، تو یقیناً آپ کا ردِ عمل کچھ اور ہوتا اور آپ شاہ صاحب سے پٹ نہ جاتے۔ آپ ابھی سے اپنے بچوں کو ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے دیجیے جن میں کہانیوں کی صورت میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ انسان کی اصل قدر و قیمت اس کے بلند کردار میں ہے اور ہاتھ سے کسی قسم کا کام کرنے میں کوئی عار نہیں۔ آپ کے بچے غیر شعوری طور پر ناخوشگوار حالات سے دوڈو ہاتھ کرنے کے لیے خود بخود تیار ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ ہے وہ دوسرا راستہ جو آپ کو نئی زندگی، نیا عزم اور ایک انقلاب آفریں شخصیت عطا کر سکتا ہے۔

مَیں نے بھی تلخ حقائق کا اسی طرح مقابلہ کیا تھا اور مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ تلخ حقائق (جو آپ کے تلخ حقائق سے قدرے مختلف ہیں) میری زندگی میں نہ آتے، تو شاید میری حیثیت ایک کلرک سے زیادہ کی نہ ہوتی۔

اسلامی معاشرے کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے وہ سب برابر ہیں۔ نسل، رنگ، قومیت اور وطنیت کی بنا پر کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ اسلام نسلی، قومی اور وطنی حد بندیوں کو توڑ کر ایک عالم گیر معاشرے کا داعی ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے معاشرے میں فکری اور مقصدی وحدت قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کی نظر میں اگر ایک فرد کو دوسرے پر کوئی فوقیت ہے، تو محض تقوے کی بنا پر۔ نیکی کے کاموں میں تعاون اور بدی اور انسانوں کے درمیان عدم مساوات کے خلاف جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا اوّلین فرض ہے۔

جو لوگ اپنے خوں سے جلا کر دیے گئے
پس ماندگاں کے راہ نما کر دیے گئے

بجھتی ہیں ورنہ کس سے یہاں وضعداریاں
مشہور ہم بھی اہلِ وفا کر دیے گئے

دِل کی تعلّیوں سے بھی لازم ہے احتیاط
بندے خوشامدوں سے خدا کر دیے گئے

اَب دیکھیے، ہو عہدہ برآئی تو کس طرح
سو حشر ایک دِل میں بپا کر دیے گئے

لے دے کے چند نالے تھے اپنی بساط میں
وہ بھی سپردِ موجِ ہوا کر دیے گئے

اَب گورِ رفتگاں پہ جلائیں دیے تو کیا
دو ہاتھ تھے سو رہنِ دُعا کر دیے گئے

انجم غریبِ شہر تھے، اَب تک اسیر ہیں
سارے ضمانتوں پہ رہا کر دیے گئے

انجم رُومانی

چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اُس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

کشاں کشاں لیے جاتی ہے جانبِ مقتل
نفس کی ڈور بھی زنجیرِ بے صدا کی طرح

فراز کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خُدا کی طرح

احمد فراز

پیٹر فارب

سب سے چھوٹا ریڈار

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے جسم کے دو اعضا ایسے ہیں جو ریڈار کی طرح کام کرتے ہیں

یہ ریڈار چار لاکھ آوازوں کو نہ صرف سُن سکتے ہیں بلکہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ کون سی آواز کہاں سے آئی ہے اور کس کی ہے ؟

انسانی جسم میں کام کرنے والے عجیب و غریب "ریڈار" جو فطرت نے ہر فرد کو عطا کیے ہیں، کان ہیں جو غالباً ہمارے جسم کے سب سے زیادہ زُود حس، ہوشیار اور قابلِ اعتماد اعضا میں شمار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کانوں کے بارے میں جس قدر محاورے اور مثالیں دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں ملتی ہیں، اتنے محاورے اور مثالیں کسی اور انسانی عضو کے بارے میں نہیں ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ اگر ہمارے پاس کان نہ ہوتے، تو یہ دنیا ہمیں کتنی سنسان اور پُر وحشت معلوم ہوتی۔ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، طوفانوں کا زور، بارش کا شور، ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ اور ساز و نغمے کی آوازیں ہمارے لیے یکسر بے معنی ہوتیں۔ گردن کے دائیں بائیں لگے ہوئے قدرت کے یہ ریڈار کتنے اُن گنت خطروں اور حادثوں سے بچاتے ہیں، شاید ہم ان کا تصور بھی نہ کر سکیں گے۔

ہمارے کانوں کی اندرونی اور بیرونی "مشینری" اور آواز وصول کر لینے کی قوت عجیب اور حیران کن ہے۔ ماہرین نے اس سلسلے میں سینکڑوں تجربات کے بعد جو باتیں دریافت کی ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ ہمارے کان قدرت کا ایک عجوبہ ہیں۔ ایک خاموش اور پُرسکون دوپہر میں گھریلو مکھی کے بھنبھنانے کی آواز چھ فٹ کے فاصلے سے آپ بخوبی سُن سکتے ہیں۔ بھنبھنانے کی یہ آواز مکھی کے پروں سے نکلتی ہے اور لہروں کی طرح فضا میں چاروں طرف پھیلتی ہے۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ چھ فٹ کے فاصلے سے اس آواز کا ۱/۳۰ لاکھ حصّہ ہی آپ سُن پاتے ہیں۔ کانوں کی زُود حسی اور بے مثال قوت کا یہ معمولی سا کرشمہ ہے۔

بیرونی آوازوں کے علاوہ ہمارے کان وہ اندرونی آوازیں بھی سُن سکتے ہیں جنہیں سائنس لیبارٹریوں میں طاقتور آلات کے ذریعے سُننا پڑتا ہے۔ مَیں نے نیوجرسی میں بیل ٹیلی فون لیبارٹریز کے ایک کمرے میں ایسا ہی تجربہ کیا تھا۔ لیبارٹریز کے انجینیروں نے اس کمرے کو "مُردہ" بنا رکھا تھا۔ مُردہ کمرے کی چھت، فرش اور دیواریں اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ باہر کی کوئی آواز کمرے میں داخل نہیں ہونے پاتی۔ مَیں اس کمرے کے بالکل درمیان چپ چاپ بیٹھ گیا اور یقین کیجیے چند منٹ بعد ہی میرے کانوں میں ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کمرے میں کوئی شخص کھڑا ہلکے ہلکے سیٹی بجا رہا ہے۔ میرے بجائے کوئی اور ناواقف آدمی ہوتا، تو یقیناً ڈر جاتا، لیکن مَیں سمجھ گیا کہ یہ میرے جسم کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی آواز ہے۔ مَیں نے اپنی نبض کان سے لگائی، تو معلوم ہو گیا کہ آواز اسی کے اندر سے آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد

میرے اعصاب بھی بولنے لگے اور پھر ہڈیوں کی "گفتگو" بھی صاف سنائی دینے لگی۔

یہ حقیقت ہے کہ سائنس دان ابھی تک ایسا کوئی الیکٹرونک آلہ ایجاد نہیں کر پائے جو انسانی کانوں کے برابر زود حس ہو۔ ایسا آلہ بنانے میں ان کی ساری کوششیں ناکام رہی ہیں اور غالباً وہ اسے بنا بھی نہیں سکیں گے، کیونکہ ہمارے کانوں کے اندر آواز وصول کرنے کی جو نازک جھلّی قدرت نے لگائی ہے وہ ایک انچ کا ۲۵۰۰ بلین حصّہ ہے (ایک بلین دس کھرب کے برابر ہے) یہی وجہ ہے کہ الیکٹرونک آلے ہلکی سے ہلکی آوازیں سُننے کے باوجود درخت کے پتّوں کا اندرونی ارتعاش نہیں سُن پاتے۔ جنہیں ہمارے کانوں کی یہ جھلّی آسانی سے سُن لیتی ہے — یہی نازک ترین جھلّی چند فٹ کے فاصلے سے جیٹ انجنوں کے دھماکے کا شور بھی سُنتی ہے اور اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، جبکہ سائنس دانوں کے بنائے ہوئے "مصنوعی کان" یہ آوازیں برداشت نہیں کر پاتے اور فوراً بے کار ہو جاتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ قوّتِ سماعت کے طاقتور ترین مصنوعی آلے کے مقابلے میں انسانی کان دس ہزار گنا زیادہ قوی ہیں اور تقریباً چار لاکھ مختلف آوازوں کو بخوبی سُن کر انہیں شناخت بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کسی ایسے کلب یا میوزک روم میں چلے جائیے جہاں آرکسٹرا کی تعداد سو یا اس سے اُوپر ہو۔ آپ فوراً ہر ساز کی آواز سُن کر شناخت کر لیں گے کہ یہ فلاں ساز میں سے نکل رہی ہے۔ اسی طرح کسی ایسی تقریب میں جہاں مہمانوں کا ہجوم ہو اور سبھی لوگ باتیں کر رہے ہوں، آپ کے کان اپنی زُود حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر لمحہ یہ بتاتے رہیں گے کہ فلاں آواز کس کی ہے اور کدھر سے آ رہی ہے۔

ہمارے کانوں کے اندر قدرتی ریڈار کا نظام نہایت پیچیدہ ہے اور اس کا تعلق ہمارے دماغ اور متعلقہ اعصاب سے ہے۔ ہم کوئی بھی آواز لگاتار نہیں سُنتے۔ اس دوران میں معمولی معمولی وقفے پڑتے رہتے ہیں، لیکن یہ وقفے اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ آواز پہلے ہمارے کانوں کے بیرونی پردوں سے ٹکراتی ہے اور ایک سیکنڈ سے بھی بہت کم وقفے میں یہ کانوں کے اندر گونجتی رہتی ہے۔ کان کے بیرونی پردے کا کام صرف یہ ہے کہ آواز کی منتشر لہروں کو ایک جگہ جمع کر کے کان کے اندرونی نالی میں بھیج دیتا ہے جس کے اختتام پر وہی نازک جھلّی واقع ہے۔ جو آواز کو پہلے کنٹرول کرتی ہے اور پھر مکینیکل قوّت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس جھلّی کا سلسلہ تین حساس ہڈیوں سے ملا ہوا ہے، کان کی یہ تینوں ہڈیاں پورے انسانی جسم میں سب سے زیادہ نازک اور چھوٹی ہیں اور ایک پسٹن کی مانند مل جُل کر کام کرتی ہیں۔ یہاں سے آواز کان کے تیسرے اور آخری حصّے میں بالکل واضح اور صاف ہو کر جاتی ہے۔ کان کا یہ حصّہ گھونگھے کی شکل سے ملتا جُلتا ہے اور اس میں رطوبت بھی موجود ہوتی ہے۔ آواز کی لہریں جب کان کے دوسرے حصّے میں پہنچتی ہیں، تو یہاں کام کرنے والے تقریباً ساڑھے تیس ہزار روئیں اسے آگے دھکیلتے ہیں اور پھر یہ آواز تیسرے درجے کی جھلّی سے ٹکرا کر دماغ تک چلی جاتی ہے۔ اس تمام کارروائی میں سیکنڈ کے ہزارویں حصّے سے بھی کم وقفہ صرف ہوتا ہے۔ دماغ آواز کو وصول کر لینے کے بعد اسے یادداشت کے مختلف خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے، اسی لیے آواز سُنتے ہی ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہماری کار کا ہارن بج رہا ہے یا ریل کے انجن کی آواز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کانوں میں نہیں سُنتے، بلکہ کانوں کے ذریعے سُنتے ہیں۔ سُننے کا اصل کام ہمارا دماغ کرتا ہے۔

آواز کی لہریں پانی کی سطح چیر کر اندر نہیں جا سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ دریا کے اندر تیرنے والا شخص ساحل پر ہونے والا دھماکا نہیں سن سکتا۔ ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے وقت بلند آواز میں باتیں کرتے ہیں اور گانے گاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کی آواز پانی کے نیچے مچھلیوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ قدرت نے آواز کی لہریں

وصول کرنے کے لیے کان کے اندر جو دریچے بنا دیے ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو ہم آواز بمشکل ہی سُن پاتے اور بالفرض سُن بھی لیتے، تو پتا نہ چلتا کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔

آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ کوئی شخص پوری قوت سے چیختا ہے، تو قریب کھڑے ہوئے دوسرے افراد کے کان اس کی آواز سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور اکثر لوگ تو کانوں میں انگلیاں بھی دے لیتے ہیں، لیکن خود چیخنے والا اپنی آواز کی شدّت محسوس نہیں کرتا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ جب ہم چیختے ہیں، تو ہماری آواز سے دو قسم کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی لہریں ہمارے منہ سے باہر نکلتے ہی پہلے فضا میں پھیلتی ہیں اور پھر ہمارے کانوں کے بیرونی پردوں سے ٹکرا کر کان کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ دوسری قسم کی لہریں چیختے وقت ہمارے منہ کے اندر ہی پیدا ہوتی ہیں اور یہیں سے سیدھی کان کے اس حصّے میں جاتی ہیں جسے (Eustachian Tube) کہتے ہیں اور پھر درمیانے دریچے میں پہنچ جاتی ہیں۔ اتنی دیر میں بیرونی لہریں بھی کان کی اندرونی جھلی Ear Drum تک آجاتی ہیں — یہ دونوں لہریں جب آپس میں ملتی ہیں، تو آواز کی شدّت کم ہوجاتی ہے اور چیخنے والے کو خود اپنی آواز کی تیزی اور تندی کا احساس نہیں ہوتا، لیکن قریب کھڑے ہوئے افراد اس سے یوں متاثر ہوتے ہیں کہ بیرونی لہریں تو ان کے کانوں کے اندر پہنچ جاتی ہیں، لیکن مزاحمت کے لیے اندرونی لہریں ان کے پاس نہیں ہوتیں۔

ہمارے کانوں کے بیرونی پردے نہ ہوتے، تو آواز سننے اور شناخت کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان پردوں میں صرف نو پٹھے ہیں، جبکہ بعض جانوروں کے کانوں میں ان پٹھوں کی تعداد اس سے دُگنی ہے۔ مثال کے طور پر گھوڑے کو لیجیے۔ اس کے کانوں کے بیرونی پردوں میں پٹھوں کی تعداد سترہ ہے جن کی مدد سے وہ دُور دراز کی آوازیں بھی آسانی سے سُن لیتا ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں سُننے کی قوت انسان میں کم ہوتی جارہی

ہے، کیونکہ وہ ان سے پوری طرح کام نہیں لیتا۔ آج سے ہزاروں برس پہلے کے انسانوں کی قوتِ سماعت کے بارے میں ناقابلِ یقین واقعات کتابوں میں درج ہیں۔ دُنیا کے بڑے آدمیوں کی قوتِ سماعت بھی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ سکندرِ اعظم کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رات کے وقت اکثر گائے کی آواز سنتا اور جب اپنے مصاحبین کی توجہ اس طرف مبذول کراتا، تو وہ حیرت سے اسے دیکھتے اور کہتے کہ انہیں تو کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک روز سکندر نے کچھ سپاہیوں کو ایک خاص رُخ بتا کر حکم دیا کہ وہ گانے والے کو تلاش کر کے لائیں۔ دو گھنٹے بعد گانے والا سکندر کے پاس پہنچا، تو پتا چلا کہ وہ سکندر کے محل سے پانچ میل دُور ایک ویرانے میں رہتا تھا اور رات کو کبھی کبھی بلند آواز سے گایا کرتا تھا۔

فرانس کے بادشاہ نپولین بوناپارٹ کا حافظہ، قوتِ سماعت اور آواز کی شناخت حیران کن تھی۔ اسے اپنی فوج کے ہر سپاہی کا نام یاد تھا اور وہ کسی بھی سپاہی کی آواز سُن کر بتا دیتا تھا کہ فلاں بول رہا ہے۔ آج کل پوری دنیا میں اچھا سننے والے افراد تقریباً ایک فی صد ہیں۔ بچپن میں قوتِ سماعت بہت عمدہ اور تیز ہوتی ہے، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس میں کمی واقع ہوجاتی ہے، حتیٰ کہ ستر بہتر سال کی عمر میں نوّے فیصد افراد بہرے ہوجاتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ اندھوں کی قوتِ سماعت بہت تیز ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی آنکھوں کے ذریعے پہلے جو قوت خارج ہوتی تھی، اس کا کچھ حصّہ کانوں کو مل جاتا ہے اور وہ معمولی سی آہٹ بھی آسانی سے سُن لیتے ہیں۔

امریکہ کی منی سوٹا یونیورسٹی میں ایک سائنسدان اس امر پر تحقیق کر رہے ہیں کہ قوتِ سماعت کو کیونکر تیز کیا جاسکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا ایک بہترین طریقہ ہے کہ ہم مشکل اور ادق ترین موضوعات پر لیکچر دیں۔ اس طرح ہمارا دماغ بیدار ہوسکتا ہے اور جب دماغ بیدار ہوجائے، تو قوتِ سماعت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو افراد اونچی آواز سے ایک دوسرے کو کتاب پڑھ پڑھ کر سناتے رہیں۔ اس کے نتائج بھی بہتر نکل سکتے ہیں۔

■■

۱۔ تصویر میں دو کشتیاں دکھائی گئی ہیں جن کے بادبان مختلف سمتوں میں اُٹھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ہوا ایک وقت دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں نہیں چل سکتی۔

۲۔ یہ افقی خطوط متوازی ہیں:

۳

۸	۱	۶
۳	۵	۷
۴	۹	۲

۴۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ڈائل پر بارہ کے بجائے گھنٹوں کے نیرہ نشان ہیں — سیکنڈوں کے چکر سے نیچے دیکھیے۔ اصولاً یہاں صرف ۶ کا نشان ہونا چاہیے لیکن یہاں دو نشان ہیں۔

۵۔ شکل میں خانوں کی کل تعداد ۹۹ ہے۔ سیاہ خانے ۲۷ ہیں۔ سیاہ حصّہ کل شکل کا $\frac{۲۷}{۹۹}$ یعنی ۲۷ء۲۷ فی صد ہے۔

۶۔ درخت کا سایہ اس طرف پڑ رہا ہے جس طرف سورج ہے، حالانکہ اس کے برعکس ہونا چاہیے۔

۷۔ ۱۶ خانے۔

۸۔ یہ سوال غلط ہے۔ نچلی سطر میں
۳۲ء۹۶۴ × ۰۰ء۰ = ۰ ہونا چاہیے کیسی ہندسے کو صفر سے ضرب دی جائے، تو جواب صفر آتا ہے۔

بالوں کی آرائش
اور تابداری کیلئے

بالوں کی سفیدی دور کرنے انہیں قدرتی سیاہ، گہرا براؤن اور فیشن کے مطابق کسی بھی رنگ میں رنگنے اور ان کی آب و تاب بڑھانے کے لئے پولی کلر (جرمنی) استعمال کیجئے جس کا کوئی ثانی نہیں ہے اور اثر دیرپا۔

این جے حنیف اینڈ کو ایس محمد حنیف اینڈ سنز
پوسٹ بکس ۴۰۵، کراچی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

NJH-3/66 Crescent

اُدھر شیر

اُدھر شیرنی

میں نے جس زمانے میں اہبل میرو کے چیتے کو ہلاک کیا، انہی دنوں ریاست میسور کے جنگلوں میں ایک آدم خور شیر نے اُودھم مچا رکھا تھا۔ بنگلور میں میرا ایک عزیز دوست میکنٹوش رہتا تھا۔ میں حسبِ معمول اُس کے پاس جا کر ٹھہرا۔ میکنٹوش کی بیوی بڑی بہادر اور نڈر عورت تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس انگریز خاتون نے دو شیر مارے ہیں۔ یہاں آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اس خاتون کے کارنامے سُننا چاہتا تھا۔

اگلے روز ہم تینوں میکنٹوش کی کار میں بنگلور سے چیتل درگ کی طرف روانہ ہوئے جو ضلع بھی ہے اور ضلع کا صدر مقام بھی۔

ہمارے آنے سے دو روز پہلے آدم خور نے چیتل درگ میں دو افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ یہاں سے ہم ہولکر کی طرف چلے، تو چند آدمیوں نے بتایا کہ آدم خور یوگی مت کے پُرانے قلعے میں پھرتا دیکھا گیا ہے۔ ہوس درگا جانے والی سڑک کے پانچویں میل پر ایک لمبی چوڑی جھیل واقع ہے جس میں بڑی بڑی مچھلیوں کے علاوہ مگرمچھ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس ندی کے دونوں کناروں پر اس قدر گھنا جنگل ہے کہ دن کے وقت بھی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ جنوب کی طرف یوگی مت پہاڑی ہے جس کے اُوپر صدیوں پُرانے وسیع قلعے کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی یہ قلعہ دیکھ چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ جنگل درندوں، خصوصاً ریچھوں اور چیتوں کی بہترین پناہ گاہ ہے اور کبھی کبھی شیر بھی اِدھر آنکلتا ہے۔

ہم اسی روز شام سات بجے کے لگ بھگ موٹر میں سوار ہو کر ہلی کی فضا سے ہوس درگا روانہ ہو گئے۔ جنگل میں خلافِ معمول سناٹا طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدم خور کی ہیبت انسانوں ہی پر نہیں، حیوانوں پر بھی طاری ہے۔ ایک میل کے فاصلے پر کھجوروں کے اُونچے اُونچے درخت نظر آنے لگے اور چند منٹ بعد ہم وسیع جھنڈ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ کار کی بڑی بتیوں کی روشنی میں دُور کا منظر صاف نظر آ رہا تھا، اس کے باوجود ہم نے طاقتور برقی ٹارچوں سے چاروں

طرف کا اچھی طرح جائزہ لیا، وہاں کوئی ذی روح نہ تھا۔

"خدا کی پناہ! کتنی خوفناک جگہ ہے۔" میکٹوش نے کہا۔

"ذرا اِس جُھنڈ کو دیکھو، میرا خیال ہے اس میں کئی سو آدم خور بیک وقت چُھپ سکتے ہیں۔ چلو گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

گاڑی چیونٹی کی رفتار سے رینگنے لگی۔ جُوں جُوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، کھجوروں کا جُھنڈ گنجان ترین ہوتا جاتا تھا۔ ہم ٹارچوں کی روشنیاں مسلسل ارد گرد پھینک رہے تھے۔ دفعتہً مسز میکٹوش نے بریک لگا کر گاڑی روک لی اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا:

"دیکھیے، اس درخت پر کون ہے؟"

ہم نے اس کی انگلی کے اشارے کا تعاقب کیا، تو حیرت سے ہماری آنکھیں پھیل گئیں۔ ہماری دائیں جانب کوئی پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر کھجور کا ایک درخت تھا جس پر کوئی سیاہ فام جسیم آدمی تیزی سے چڑھ رہا تھا، پھر وہ کھجور کے پکّے ہُوئے خوشے توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ کبھی کبھی گردن گھما کر کار کی طرف دیکھتا اور پھر کھجوریں کھانے لگتا۔ چند لمحے بعد وہ نیچے اُترنے لگا،

میرے کہنے پر مسز میکٹوش نے کار آگے بڑھائی اور درخت کے نزدیک لے جا کر روک دی۔ اب ہم نے دیکھا کہ جس کو ہم سیاہ فام آدمی سمجھ رہے ہیں، وہ ایک تنومند ریچھ ہے۔ ہمیں قریب پا کر وہ دوبارہ درخت پر چڑھنے لگا۔ اتنے میں مسز میکٹوش نے کار کا دروازہ کھولا اور 3006 سپرنگ فیلڈ رائفل سے نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ریچھ آٹے کی بوری کی مانند دھم سے نیچے گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

"کیا کہنے ہیں!" بیوی کے نشانے کی شوہر نے داد دی،

"لیکن میکی یہ تو بتاؤ کہ بیچارے ریچھ کو مارنے سے فائدہ کیا ہوا؟"

"میں اپنی اس نئی رائفل کو آزمانا چاہتی تھی۔" مسز میکٹوش نے ہنس کر جواب دیا۔

"اب اس کی چار من وزنی لاش بھی تم ہی اُٹھا کر لاؤ۔"

"تم فکر نہ کرو، مسٹر اینڈرسن اکیلے ہی اسے اُٹھا لائیں گے، لیکن ابھی اسے یہیں پڑا رہنے دو، ہوس دُرگا کا چکّر کاٹ کر آئیں گے تو اسے لادلیں گے۔"

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد ہم نے ریچھ کی کھال اُتاری اور پھر ہوس دُرگا روانہ ہو گئے۔ ہم وہاں کے لوگوں سے آدم خور کی حالیہ سرگرمیوں کے بارے میں "انٹرویو" لینا چاہتے تھے۔ راستے میں کھجوروں کے جُھنڈ کا تفصیلی معاینہ کیا، تو کئی جگہ شیر کے پنجوں کے مدھم نشان نظر آئے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اس گنجان ترین علاقے میں شیر کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔

ہوس دُرگا والوں نے اُن دو وارداتوں کا ذکر کیا جو کئی ہفتے قبل بستی کے نواح میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ گیارہ سال کی ایک لڑکی اپنے مکان سے باہر نکلی اور رفعِ حاجت کے لیے گھر سے کچھ فاصلے پر جنگل میں گئی۔ اُسے زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے بعد گھر واپس پہنچ جانا چاہیے تھا، لیکن ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لڑکی کے ماں باپ سخت پریشان تھے کہ وہ اب تک کیوں نہیں آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا اضطراب اور خوف بڑھتا گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اگر کوئی درندہ لڑکی پر حملہ آور ہوتا، تو اُس کے چیخنے کی آواز ہی سنائی دیتی۔ آخر لڑکی کا باپ اور بھائی لالٹین لے کر گھر سے نکلے اور ایک دو فرلانگ تک اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد ناکام واپس چلے آئے۔ اتنے میں گاؤں والوں کو لڑکی کے گم ہو جانے کا علم ہو گیا۔ فوراً ہی پچاس ساٹھ آدمی ہاتھوں میں لالٹینیں، لٹھ، کلہاڑیاں اور دو مزل لوڈنگ بندوقیں لے کر جنگل میں پہنچے اور بستی سے کوئی آدھ میل دُور لڑکی کے پھٹے پُرانے کپڑے جھاڑیوں میں پڑے پائے۔ خون کا کوئی دھبہ دکھائی نہ دیا۔ اگلے روز صبح سویرے بھی لڑکی کو دیر تک تلاش کیا گیا، مگر کوئی سراغ نہ ملا۔

ہوس دُرگا سے مشرق کی جانب پانچ میل دُور ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس پر گاؤں کے دو دھوبیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ سگے بھائی تھے۔ دن بھر تالاب پر کپڑے دھوتے اور سُورج چھپنے سے پہلے پہلے اپنے تین گدھوں پر دُھلے ہوئے کپڑے لاد کر گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ایک روز شام کو حسبِ معمول وہ گدھوں پر کپڑے لاد کر واپس آ رہے تھے۔ بڑا بھائی گدھوں کے آگے آگے چل رہا تھا اور چھوٹا بھائی انہیں پیچھے سے ہانک رہا تھا۔ ابھی وہ گاؤں سے ایک میل دُور تھے کہ یکایک ایک شیر جھاڑیوں سے نکلا اور اس سے پہلے کہ بڑا بھائی آواز نکالے یا بھاگنے کی کوشش کرے، شیر نے اُسے مُنہ میں دبایا اور آناً فاناً غائب ہو گیا۔ چھوٹے بھائی نے یہ ماجرا دیکھا، تو اُلٹے پاؤں بھاگ نکلا اور تالاب پر پہنچ کر دم لیا۔

رات کے آٹھ بج گئے۔ دھوبی گھر نہ پہنچے، تو اُن کی بیویاں اُونچی آواز سے رونے لگیں۔ گاؤں والے جمع ہوئے اور رات کے دس بجے بیل کانٹے سے لیس ہو کر دھوبیوں کی تلاش میں نکلے۔ تالاب کو جانے والے راستے پر انہوں نے ایک گدھے کو اطمینان سے اونگھتے پایا۔ کپڑوں کی گٹھڑی اس وقت بھی گدھے کی پیٹھ سے بندھی ہوئی تھی۔ تالاب سے دو فرلانگ کے فاصلے پر دوسرا دھوبی بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے دانت بھنچے ہوئے اور آنکھوں کی پُتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک گھنٹے بعد اسے ہوش آیا اور وہ یہ دردناک قصّہ سنانے کے قابل ہو سکا۔ پھر وہ گاؤں والوں کو لے کر اس مقام تک آیا جہاں شیر نے اس کے بڑے بھائی کو مُنہ میں دبایا تھا۔ گاؤں والے اگرچہ کلہاڑیوں، چاقوؤں، نیزوں اور بندوقوں سے مسلح تھے، لیکن آدم خور کی ہیبت ان کے دلوں پر اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ بار بار خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے اور کوئی شخص جھاڑیوں کے نزدیک جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

اگلے روز دن کی روشنی میں پھر یہ لوگ جنگل میں آئے اور ایک گھنٹے بعد دھوبی کی ادھ کھائی لاش اور اس کے خون آلود کپڑے تلاش کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ شیر نے رات بھر میں لاش کا تین چوتھائی حصّہ ہڑپ کر لیا تھا۔ بدنصیب دھوبی کا سر، دونوں بازو، ایک ٹانگ اور دوسرے پیر کی انگلیاں شیر نے شاید کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دی تھیں۔ لاش کے یہ اجزا جمع کر کے گاؤں لائے گئے اور کریا کرم کیا گیا۔ اس دوران میں باقی دو گدھے بھی گھاس چرتے ہوئے مل گئے، انہیں خراش تک نہ آئی تھی۔

تیسری واردات ہمارے آنے سے صرف چار روز پیشتر ہوئی۔ دن کے تین بجے ایک بیل گاڑی ہوس دُرگا سے ہولکر کی طرف جا رہی تھی۔ بیل اپنی راہ پہچانتے تھے وہ مزے مزے میں چلے جا رہے تھے اور گاڑی بان اُونگھ رہا تھا۔ گاڑی ابھی چوتھے میل پر تھی کہ شیر کے غرّانے کی آواز سُن کر بیل بھڑک گئے۔ گاڑی بان کی زندگی کے چند دن ابھی باقی تھے۔ اس نے بروقت شیر کو جھاڑیوں سے نکل کر گاڑی کی طرف لپکتے دیکھ لیا اور گاڑی سے کُود کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ شیر جھلّا کر درخت کے گرد گھومتا اور بار بار مُنہ اُٹھا کر غرّاتا رہا۔ کئی مرتبہ اس نے جست کی، لیکن گاڑی بان اس کی پہنچ سے باہر درخت کی اُونچی شاخوں میں دبکا بیٹھا رہا۔ شیر نے مایوس ہو کر بیلوں پر حملہ کیا اور آناً فاناً ایک بیل کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا، لیکن گوشت کھائے بغیر غرّاتا ہُوا ایک طرف چلا گیا۔ دوسرے بیل کو اُس نے کچھ نہ کہا۔

دو گھنٹے بعد جب گاڑی بان نے محسوس کیا کہ شیر دُور چلا گیا ہو گا، تو وہ چپکے سے اُترا اور دوسرا بیل گاڑی میں جوت کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا اور لوگوں کو سارا قصّہ سُنایا۔

ان خبروں کے بعد لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس روز دو انگریز شکاری یہاں آئے اور سرکاری بنگلے میں ٹھہرے۔ ان کے پاس بھی موٹر ہے اور وہ شیر کو مارنے کے ارادے سے آئے ہیں، لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے۔

پاکستان کے
سب سے عمدہ بلیڈ سے
سب سے اچھا شیو

ملک بھر میں سروے کے نتائج ثابت
کرتے ہیں کہ پاکستان میں بننے والے بلیڈوں
میں ٹریٹ سب سے اعلیٰ، کوالٹی میں یکساں اور
زیادہ چلنے والا بلیڈ ہے۔

پر لطف شیو کیلئے

ٹریٹ بلیڈ

کم خرچ، دیرپا

دس بلیڈ کی قیمت ۸۰ پیسے
سے زیادہ ہرگز ادا نہ کیجئے

PRESTIGE T.B.402/V81

شام کو وہ دونوں شکاری ہم سے ملنے آئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ تجربہ کار آدمی ہوں گے لیکن وہ نوجوان تھے اور انہوں نے جس انداز میں رائفلیں پکڑ رکھی تھیں، اس سے فوراً اندازہ ہو گیا کہ اناڑی ہیں۔ ایک کا نام انسی اور دوسرے کو ٹاڈ کہتے تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے آدم خور کا شکار کبھی نہیں کیا تھا اور اس خطرناک مہم پر وہ پہلی بار نکلے تھے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ نقصان نہ اٹھائیں، انہیں بتایا کہ آدم خور کو تلاش کرنا اور پھر اُسے مارنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھ رہے ہیں۔ اس کے لیے بڑی دُور اندیشی، استقلال اور جرأت کی ضرورت ہے۔ میری باتیں سُن کر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ غالباً وہ مجھے احمق سمجھ رہے تھے۔ پھر انسی نے کہا:

"جناب، ہم پہلے بھی کئی شیر اور چیتے مار چکے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آتا؟ میں آپ کو اپنی البم دکھاتا ہوں۔"

"البم بعد میں دیکھ لی جائے گی، یہ بتائیے کہ آپ کا واسطہ کبھی آدم خور سے پڑا ہے؟"

"جی نہیں..... مگر۔"

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں،" ٹاڈ نے کہا "اور آپ کی شہرت سے بھی آگاہ ہیں۔ اگرچہ آدم خور سے مقابلے کا یہ پہلا موقع ہے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہم اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ صرف ہماری رہنمائی کرتے رہیے۔"

"میں ہر طرح حاضر ہوں، اچھا یہ تو بتائیے کہ اس سلسلے میں آپ کہاں تک پہنچے ہیں؟"

"جس مقام پر شیر نے دھوبی کو کھایا تھا، وہاں ہم نے گزشتہ رات ایک بھینس باندھ دی تھی اور اب ہم نے اپنے قلیوں کو اس کی خبر لینے بھیجا ہے۔ اگر آدم خور ابھی تک اس علاقے میں موجود ہے تو یقیناً اس نے بھینس کا تیا پانچا کر دیا ہوگا۔"

"آپ نے آدم خور کو خود تو نہیں دیکھا؟"

"جی نہیں، البتہ اس کے قدموں کے تازہ نشانات آج صبح ہم نے ضرور دیکھے ہیں۔ وہ تالاب پر پانی پینے گیا تھا اور وہاں اس نے کچھ دیر آرام بھی کیا۔"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ قُلی آن پہنچے اور انہوں نے خبر سُنائی کہ شیر نے بھینس کو ہلاک کر کے لاش کا آدھا حصّہ ہڑپ کر لیا ہے۔ اگرچہ شام کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا لیکن انسی اور ٹاڈ اسی وقت جنگل میں جانے کے لیے تیار ہو گئے اور انہوں نے ہمیں بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ہم اُن ہی کی جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں شیر نے بھینس کو ہلاک کیا تھا، تو مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ نوجوانوں نے بھینس کو اس جگہ باندھ کر سخت حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ شیر اگر اُسے نہ مارتا، تو مجھے حیرت ہوتی۔ یہ ایک کھلی جگہ تھی، چاروں طرف بیس بیس اور چالیس چالیس من وزنی چٹانی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ گھاس پھونس کا نام و نشان بھی نہ تھا اور درخت بھی اِکّا دُکّا ہی نظر آ رہے تھے۔ انسی اور ٹاڈ کا خیال تھا کہ انہی درختوں میں سے کسی ایک پر مچان باندھ کر شیر کا شکار کریں گے، لیکن بھینس کو انہوں نے جس درخت سے باندھا تھا، وہ اُونچے اُونچے چٹانی پتھروں میں گھرا ہوا تھا۔ میں نے اس رسّے کو دیکھا جس سے بھینس باندھی گئی تھی۔ شیر نے ڈیڑھ انچ خطر کے اس مضبوط رسّے کو کچے دھاگے کی مانند توڑ کر رکھ دیا تھا اور بھینس کو گھسیٹتا ہوا درخت سے کوئی دو فرلانگ دُور ایک بڑے ٹیلے کے پیچھے لے گیا تھا۔ اس سے مجھے اس کی بے پناہ قوت کا اندازہ ہُوا۔ پیٹ بھرنے کے بعد شیر بھینس کی لاش کے کچھ حصّے ایسی جگہ چھوڑ گیا جہاں وہ کسی وقت بھی دوبارہ نمودار ہو سکتا تھا۔ ان حصّوں کو دیکھ کر مجھے کچھ ایسا احساس ہوا کہ یہ شیر آدم خور نہیں، بلکہ آدم خور کوئی اور ہے۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی تو اُدھر جاتی تھی جہاں شیر نے دھوبی کو ہلاک کیا تھا اور دوسری پگڈنڈی جنوب مشرق کی طرف ایک بلند پہاڑی کے عقب میں سے گزرتی تھی۔ شیر کو دیکھنے کے لیے ان بڑے بڑے چٹانی پتھروں کے پیچھے چھپنا پڑتا تھا جو اِن دونوں پگڈنڈیوں کے کناروں پر دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو پتھر

بہت بڑے تھے اور ان کے پیچھے ایک ایک شکاری آسانی سے چھپ سکتا تھا۔ چونکہ مقابلہ آدم خور سے تھا اور اس کی مکاری سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ آکر بے خبری میں شکاری کو دبوچ لیتا، اس لیے انسی اور ٹاڈ نے آپس میں فیصلہ کیا کہ وہ مچان پر بیٹھنے کے بجائے ان بڑے پتھروں کے پیچھے چھپ کر آدم خور کا انتظار کریں گے۔ پتھروں کا درمیانی فاصلہ پچاس فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ میں نے دبی زبان سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ خطرہ مول نہ لیں اور زمین پر بیٹھنے کے بجائے ان بلند پتھروں کے اوپر ہی بیٹھ جائیں تو آدم خور کے حملے سے کسی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں، مگر انہوں نے میرا مشورہ نہ مانا اور قلیوں کی مدد سے جلدی جلدی خاردار جھاڑیاں اکھاڑیں اور پتھروں کے چاروں طرف جمع کر کے ان کے اندر بیٹھنے کا انتظام کر لیا۔

ہم لوگ بنگلے پر واپس چلے تو آئے، لیکن ان بے وقوف شکاریوں کے لیے میں بڑا فکر مند تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان کو بتائے بغیر کسی ایسی جگہ ٹھہر جاؤں جہاں سے فوری طور پر ان کی مدد کو پہنچنے میں آسانی رہے، لیکن یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ شیر کو میری موجودگی کا احساس ہو گیا، تو وہ ادھر کا رخ نہ کرے گا اور بعد میں یہ نوجوان مجھے الزام دیں گے کہ میں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے۔ رات کا کھانا کھا کر میکبوش اور اس کی بیوی گاؤں والوں سے باتیں کرتے رہے۔ میں باہر برآمدے میں بیٹھا تصور ہی تصور میں ان شکاریوں کو پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھ رہا تھا اور دعا کر رہا تھا کہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ ہوا جنوب مغرب کے رخ چل رہی تھی، اس لیے ایک میل دور سے فائرنگ کی آواز میرے کانوں تک پہنچنا ناممکن بات تھی۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب رات کے گیارہ بج گئے۔ میکبوش اور اس کی بیوی اندر کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے اور میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا، لیکن میرے کان جنگل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اس غنودگی کے عالم میں مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز کبھی مسلسل آتی اور کبھی تھم جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص لکڑی درخت کے تنے پر مار رہا ہے۔ ٹھک..... ٹھک ٹھک..... ٹھک ٹھک۔ یہ آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ میں اٹھا اور برآمدے سے باہر نکل آیا۔ اب مجھے پتا چلا کہ یہ کسی آدمی کے جوتوں کی آواز ہے جو تیز دوڑنے سے پیدا ہو رہی ہے۔ آہ! میرے خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ دوڑنے والا نوجوان شکاریوں میں سے ایک ہے۔

میں نے قریب رکھی ہوئی رائفل اٹھائی، ٹارچ سنبھالی اور اسی طرف دوڑنے لگا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ پھر میں نے اُسے سامنے سے آتا ہوا دیکھ لیا۔ وہ انسی تھا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور پسینے میں ڈوبا ہوا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑا کر دو تین مرتبہ گرا اور اٹھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ گرنے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اُسے سنبھال لیا۔

"ٹاڈ کہاں ہے؟" میں نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا، لیکن دہشت کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن منہ سے الفاظ ہی نہ نکلے۔ اتفاق سے میری جیب میں برانڈی کی آدھی بوتل موجود تھی۔ دو گھونٹ پینے کے بعد وہ کچھ سنبھلا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے:

"شیر..... لے گیا اُسے....."

اور اس کے ساتھ ہی وہ معصوم بچے کی طرح میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ میں اُسے سنبھالتا اور دلاسے دیتا ہوا بنگلے میں لے گیا۔ میکبوش اور اس کی بیوی کو بیدار کیا۔ انسی کو بستر پر لٹا کر اسے کمبل اوڑھائے گئے کیوں کہ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مسز میکبوش اس کے تلوے سہلانے لگیں اور میکبوش نے جلدی سے برانڈی کی نئی بوتل کھول کر گلاس پُر کیا اور انسی کے منہ سے لگا دیا۔ اب ہم

نہایت بے صبری سے اس کہانی کے منتظر تھے جو انسی ہمیں سُنانے والا تھا۔ پندرہ منٹ بعد اس کی حالت کچھ ٹھیک ہوئی لیکن اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں کا بیمار ہے۔ چہرے کا رنگ اب بھی ہلدی کی طرح زرد تھا اور آنکھوں میں آنسو، پھر بھرّائی ہوئی آواز میں معافی مانگنے لگا:

"کاش ہم آپ کی بات مان لیتے اور میرے عزیز دوست کی جان بچ جاتی۔"

ہم تینوں دم بخود بیٹھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے چند لمحے سسکیاں بھرنے کے بعد اس نے بیان دوبارہ شروع کیا:

"آپ کو یاد ہوگا مسٹر اینڈرسن، میں اُس پتھر کے پیچھے بیٹھا تھا جو جنگل کی طرف سے آنے والی پگڈنڈی کے کنارے پڑا تھا اور ٹاڈ نے اپنے لیے وہ پتھر منتخب کیا تھا جو پہاڑی کے سامنے تھا تاکہ آدم خور ادھر سے آئے تو وہ اسے دیکھ سکے۔ پوزیشن ایسی تھی کہ میں تو ٹاڈ کو دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

آپ لوگوں کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی میں نے یوں محسوس کیا جیسے اس طرف جھاڑیوں میں کوئی جانور آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔ میں نے اس کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھی لیکن وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا، البتہ سیٹی بجا کر ٹاڈ کو خبردار رہنے کا اشارہ ضرور کر دیا تھا۔ رات کے دس بج گئے، مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں اونگھ رہا تھا کہ دفعتہً ایسی آواز کانوں میں آئی جیسے کوئی درندہ ہڈیاں چبا رہا ہو، بے شک آواز وہی تھی۔ شیر بھینس کی بقیہ لاش ہڑپ کر رہا تھا۔ یہ آواز یقیناً ٹاڈ نے سُن لی ہوگی کیونکہ وہ بھینس کی لاش کے زیادہ قریب بیٹھا تھا لیکن جب اس نے کوئی فائر نہ کیا تو مجھے الجھن ہونے لگی ایسا نہ ہو کہ درندہ پیٹ بھرنے کے بعد نکل جائے۔ مجھے ٹاڈ پر غصہ آنے لگا۔ وہ فائر کیوں نہیں کرتا۔ کہیں سو تو نہیں گیا۔ ہر لمحے میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" مسز میکنٹوش نے پوچھا۔

"میں پھر یہی سمجھا کہ ٹاڈ یقیناً سو گیا ہے، اس لیے اب مجھے

ہی شیر پر گولی چلانی چاہیے، چنانچہ میں نے اپنی ٹارچ روشن کی اور دیکھا کہ ایک بہت بڑا شیر بھینس کی لاش پر بڑا اطمینان سے جبڑا چلا رہا ہے روشنی ہوتے ہی میں نے ٹاڈ کے چیخنے کی آواز سنی۔ شیر کو دیکھ کر دہشت سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ شیر پوری قوت سے گرجا اس نے مڑ کر اس پتھر کی طرف دیکھا جس کے پیچھے ٹاڈ چھپا ہوا تھا اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا، شیر ایک ہی جست میں وہاں پہنچ گیا۔ اتنا یاد ہے کہ میں نے اپنے دوست کی ایک اور چیخ سنی تھی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔"

تھوڑی دیر رونے کے بعد انسی نے پھر کہا۔

"میں نے ٹاڈ کو آوازیں دیں، کوئی جواب نہ ملا۔ میں اُسے پکارتا ہوا اس پتھر تک گیا لیکن ٹاڈ نظر نہ آیا۔ اس کی رائفل، پانی کی بوتل اور سینڈوچز کا آدھا پیکٹ وہیں پڑا تھا۔ یہ خیال کر آدم خور ٹاڈ کو لے گیا، مجھے بدحواس کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کوئی غیبی قوت تھی جو مجھے ہوس دُور گا جانے والی سڑک پر کھینچ کر لے گئی ورنہ اس گھنے جنگل میں بھٹک کر میں بھی آدم خور کا شکار ہو جاتا۔"

انسی کی کہانی اور پچھلے تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اندازہ کیا کہ ہمارا واسطہ دراصل دو شیروں سے ہے۔ ان میں سے ایک آدم خور اور دوسرا مویشیوں کا دشمن ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شیر اور شیرنی ہوں۔ میں نے شیر کا حلیہ پوچھنے کی کوشش کی تو انسی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ وہ شیر ہی تھا، شیرنی ہرگز نہیں تھی۔ بہرحال پندرہ منٹ کے اندر اندر ہم نے گاؤں میں سے بیس آدمی جمع کیے اور جنگل کی طرف چلے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ مسز میکنٹوش اور انسی بھی ساتھ جانے پر بضد تھے۔ انہیں بھی ساتھ لیا اور تھوڑی دیر بعد ہم اس منحوس پتھر کے قریب کھڑے تھے جس کے پیچھے ٹاڈ نے بیٹھنے کی جگہ بنائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹاڈ نے شیر سے بچنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی اور چپ چاپ اس کا لقمہ بننا منظور کر لیا۔ پہاڑی کی طرف جانے والے راستے پر اس کے بائیں پیر کا جوتا ملا۔ ہم کچھ اور آگے گئے تو

ایسے نشان دکھائی دیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ شیر نے یہاں آکر دم لیا اور اپنے شکار کو بھی منہ سے نکال کر زمین پر ڈالا ممکن ہے وہ اسی جگہ ٹاڈ کو کھانا شروع کر دیتا، لیکن انسی کی چیخ پکار سے گھبرا کر اس نے ٹاڈ کو دوبارہ منہ میں دبایا اور پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ خون کے دھبے جا بجا اس راستے پر پھیلے ہوئے تھے۔ صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے کہ ہم پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے تھا اور شاید آدم خور انہی میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ ہم نہایت احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ آخر ایک جگہ ہم نے بے چارے ٹاڈ کو اس حالت میں پایا کہ آدم خور اس کے جسم کا آدھا حصہ ہڑپ کر چکا تھا۔ ٹاڈ کی لاش کا یہ حال دیکھ کر کون تھا جو متاثر نہ ہوتا، مگر انسی کی حالت یکدم بگڑ گئی۔ پہلے اس کے منہ سے چیخ نکلی، پھر وہ دھڑام سے زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

ہمیں ڈر تھا کہ اس صدمے سے انسی پاگل نہ ہو جائے۔ وہ جب بھی ہوش میں آتا، اپنے مرنے والے دوست کو پکارتا اور دیر تک اس سے باتیں کرتا۔ میں نے اسے موٹر میں بٹھایا اور سیدھا ہتیل ڈوگ ہسپتال میں لے جا کر داخل کرا دیا۔ پولیس کو اس حادثے کی اطلاع دی اور تمام دن ان کے ساتھ مارا مارا پھرا اور شام کو جب میں ہوس درگا واپس پہنچا، تو تھکن، صدمے اور بھوک کے مارے جان لبوں پر آچکی تھی۔ میکنٹوش اور اس کی بیوی بھی نوجوان ٹاڈ کی اس حسرت ناک موت کے باعث از حد افسردہ خاطر تھے اور خود مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا کوئی عزیز ترین ساتھی بچھڑ گیا ہے، حالانکہ ٹاڈ سے میری ملاقات بہت مختصر ہوئی تھی۔

"انتقام کی آگ میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔" میکنٹوش نے کہا۔ "ہمیں اب اس آدم خور سے دو دو ہاتھ کرنے ہی ہوں گے۔"

"بے شک،" میں نے تائید کی۔

اس رات ہم میں سے نیند کسی کو نہ آئی۔ آدم خور سے مقابلہ کی نت نئی تدبیریں سوچتے اور ان پر بحث کرتے رہے۔ صبح ناشتے کے بعد نئے عزم اور نئے حوصلے سے جنگل کی طرف چلے اور پھر اس

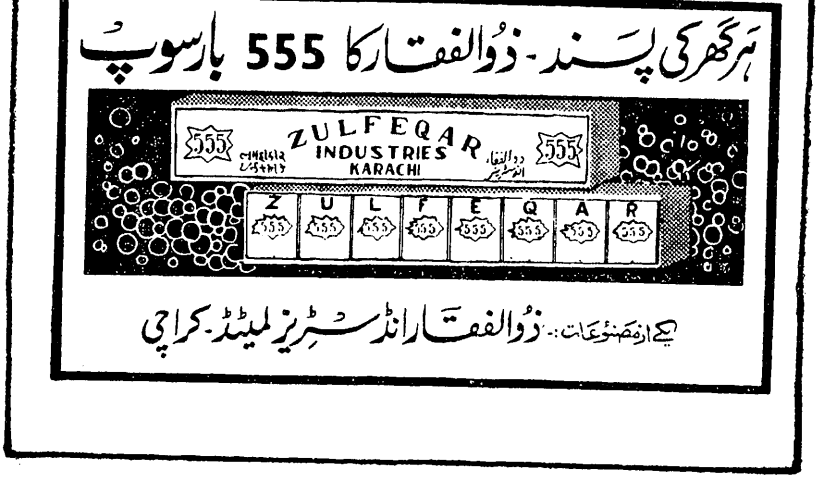

مقام پر پہنچے جہاں یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ ہم نے آدم خور کے پیروں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ بارش نہ ہونے کے باعث زمین خشک ہو کر انتہائی سخت ہو چکی تھی۔ اگر نیچے کا ہلکا سا نشان بھی کہیں مل جاتا تو مجھے یہ معلوم کرنے میں دقت نہ ہوتی کہ آدم خور نر ہے یا مادہ اور اس کا قد و قامت اور وزن کتنا ہوگا۔ انسی نے آدم خور کا جو شکوک حلیہ بیان کیا تھا، اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ نر شیر ہے۔ جس مقام پر ٹاڈ کی لاش کے بچے کھچے اجزا ملے تھے، وہاں ہم نے دیر تک تفتیش کی کہ شاید آدم خور کے پنجوں کا مدھم سا نشان ہی مل جائے، مگر بے سود۔ ٹاڈ اور انسی نے جس جگہ بھینس باندھی تھی اور اسے شیر نے ہلاک کر دیا تھا، ہم وہاں بھی گئے۔ بھینس کے سڑے ہوئے گوشت پر بہت سے گدھ دعوت اڑا رہے تھے۔ ہمیں قریب آتے دیکھ کر وہ اڑے اور ادھر ادھر پتھروں پر بیٹھ گئے۔

"شیر اب ادھر نہیں آئے گا۔" میکنوش نے کہا۔ "گدھوں نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔"

"فکر نہ کرو، میں دوسری بھینس کا انتظام کرتا ہوں، ہمیں اب نئے سرے سے اس مہم کا آغاز کرنا پڑے گا۔ ہم اس بھینس کو وہیں باندھیں گے جہاں شیر نے دھوبی کو ہلاک کیا تھا۔"

"اس کا فائدہ؟" مسز میکنوش نے پوچھا۔

"میرا پروگرام یہ ہے کہ مسٹر میکنوش اس مقام پر گھات بن بیٹھیں گے جہاں بھینس باندھی جائے گی اور میں اسی پتھر کے اوپر لیٹوں گا جہاں سے آدم خور ٹاڈ کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ ہمیں بہرحال یہ خطرہ مول لینا ہی ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا مقابلہ دو شیروں سے ہے ان میں سے ایک بھینس پر حملہ کرے گا اور دوسرا آدمی کی تلاش میں آئے گا، لیکن آدمی نہ ملنے کے باعث وہ مجبوراً بھینس کے گوشت پر آئے گا جسے اس کا ساتھی شیر یا شیرنی پہلے ہی ہلاک کر چکی ہوگی۔ وہ ادھر آئے تو تم اسے رائفل کا نشانہ بنا دینا اور میری طرف آئے گا تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ میں پتھر پر اس لیے لیٹنا چاہتا ہوں کہ آدم خور پہاڑی کی طرف سے آئے تو میں اس کی آہٹ سن سکوں۔"

"گویا آپ خود اسی حماقت کو دہرانا چاہتے ہیں جو ٹاڈ نے کی تھی۔" مسز میکنوش نے حیرت سے کہا۔

"محترمہ، ممکن ہے یہ حماقت ہی ہو، لیکن براہِ کرم مجھ میں اور ٹاڈ میں فرق ملحوظ رکھیے۔ وہ نوجوان ناتجربہ کاری اور ضد کے باعث اپنے دردناک انجام کو پہنچا لیکن میری تو عمر ہی ان دھندوں میں کٹی ہے۔ اگر آدم خور مجھے وہاں سے لے بھی جائے تو کسی کو قطعاً کوئی رنج نہ کرنا چاہیے۔"

میکنوش کو جہاں بیٹھنا تھا وہاں کوئی درخت ایسا نہ تھا جس پر مچان باندھی جا سکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کی تدبیر صرف یہ تھی کہ زمین میں گڑھا کھودا جائے اور میکنوش کے بیٹھنے کے بعد گڑھے کا منہ خشک شاخوں اور جھاڑیوں سے بند کیا جائے اور چاروں طرف چھوٹے بڑے پتھر رکھ دیے جائیں۔ گاؤں سے چھ آدمیوں کو بلوا کر گڑھا کھدوایا گیا اور جب یہ مکمل ہو گیا اور میکنوش اس میں بیٹھنے کی تیاریاں کرنے لگا تو اس کی بیوی ضد کرنے لگی کہ وہ اپنے شوہر کو ہرگز تنہا نہ چھوڑے گی اور اسے بھی گڑھے میں بیٹھنے دیا جائے۔ ہمیں اس کی ضد کے آگے سر جھکانا ہی پڑا۔ جب وہ دونوں اس میں اتر گئے تو منصوبے کے مطابق گڑھے کا منہ بند کر دیا گیا۔ کہیں کہیں ہوا آنے اور نشانہ لینے کے لیے جگہ پہلے سے چھوڑ دی گئی تھی۔ اس تنگ گڑھے میں دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھ گئے اور اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔ طے پایا کہ خطرے کے وقت تین سیٹیاں بجا کر ایک دوسرے کو خبردار کر دیا جائے گا۔

میں نے بھینس کو گڑھے سے کچھ فاصلے پر باندھ دیا اور گاؤں والوں کو رخصت کر کے ٹھیک پانچ بجے اس چٹان پر پہنچ گیا جہاں مجھے لیٹ کر اس آدم خور کا انتظار کرنا تھا۔ دن بھر دھوپ میں تپنے کے بعد چٹان بے حد گرم تھی اور جب میں وہاں لیٹا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے دہکتے کوئلے میرے نیچے بچھے ہیں۔ وقت گزرتا گیا، جنگل میں پُرہول سناٹا طاری تھا حتیٰ کہ ابابیلیں بھی خاموش تھیں۔ تاروں بھری رات میں جنگل کی یہ خاموشی رفتہ رفتہ گہری ہوتی جا رہی تھی اور میں چٹان پر لیٹا بدنصیب ٹاڈ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے والدین اور

ہم

خود ستائی سے پرہیز کرتے ہیں کیونکہ مُشک وہ جس کی خوشبو سے در و دیوار مہک جائیں
نہ وہ جس کی تعریف خود عطار کرے۔
یوں بھی آپ ہمیں جانتے پہچانتے ہیں تبھی تو آپ نے اور اسّی ہزار دیگر
پالیسی ہولڈروں نے ہمیں اپنے اعتماد کے لائق سمجھا ہے۔

ہماری حسبِ ذیل پالیسیاں آپ کی خاص توجہ کی مستحق ہیں۔
۱۔ اوائلی پالیسی۔ ۲۔ تدریجی پریمیم پالیسی۔ ۳۔ شرطیہ بونس پالیسی
تحفظِ اطفال پالیسی اور تحفظِ خاندان پالیسی۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

رشتے داروں کو جب اس حادثے کی خبر ملے گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔ مجھے نہ جانے یہ احساس بار بار کیوں پریشان کر رہا تھا کہ اس کی موت کا ذمّے دار میں خود ہوں۔ میں اسی فکر میں گم تھا کہ سیٹی بجنے کی آواز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا معمولی وقفوں کے بعد سیٹی تین مرتبہ بجی۔ میں نے رائفل سنبھالی، ٹارچ روشن کی، پتھر سے نیچے اترا اور نہایت احتیاط سے دبے پاؤں قدم رکھتا ہوا گڑھے کی طرف چلا۔ چند منٹ بعد میں نے مسٹر اور مسز میکنوش کو بھینس کے قریب کھڑے پایا۔ وہ صحیح سلامت تھی۔

"خیر تو ہے؟" میں نے پوچھا

"جی ہاں۔" میکنوش نے جواب دیا، "آیئے اب گاؤں کو چلیں، ٹھہرنا بے کار ہے۔ شیر نے ہمیں یہاں چھپتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور وہ ادھر کا رُخ نہ کرے گا۔"

"پورا واقعہ تو سناؤ۔"

مسز میکنوش نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ انہوں نے اپنے رُخ پر کسی جانور کے ہانپنے کی آواز سنی اور کُہنی مار کر اپنے خاوند کو ادھر متوجہ کیا۔ مسٹر میکنوش چونکہ بھینس کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے اور گڑھے میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ آسانی سے رُخ پلٹ سکتے، اس لیے دوسری جانب منہ کرنے میں خاصی جدّوجہد کرنی پڑی۔ پہلے تو انہیں کچھ نظر نہ آیا، لیکن جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف چھ فٹ کے فاصلے پر ایک لمبا اور بڑا سا پتھر پڑا ہوا ہے۔

"مجھے خوب یاد تھا کہ جب ہم گڑھا کھود رہے تھے تو یہ پتھر یہاں نہ تھا۔" مسز میکنوش نے کہا۔ "لیکن میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ شیر ہے جو اطمینان سے لیٹا اونگھ رہا ہے۔ یکایک اس نے حرکت کی اور سر اٹھایا اس کی آنکھیں اندھیرے میں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں دفعتہً وہ غرّایا اور آناً فاناً غائب ہو گیا۔"

"بہرحال آپ لوگوں کو اس طرح گڑھے سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے شیر قریب ہی چھپا ہوا آپ کی نقل و حرکت دیکھ رہا ہو۔"

بھینس کو وہیں بندھا چھوڑ کر ہم ہوس درگا پہنچ گئے۔ اگلے روز صبح میں نے چند آدمیوں کو بھینس کی خبر لینے جنگل بھیجا۔ انہوں نے واپس آکر یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ شیر نے بھینس کو چیر پھاڑ کر برابر کیا اور ادھ چری سر اور ٹھُوں کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ ہم اسی وقت موقع پر پہنچے۔ جو کچھ ہمارے آدمیوں نے بتایا وہ سچ نکلا۔ ارد گرد کی زمین کا معاینہ کرنے کے بعد ثابت ہو گیا کہ بھینس کو ہڑپ کرنے کا کارنامہ ایک شیر اور شیرنی نے انجام دیا ہے، لیکن اب تیسرے شیر کی موجودگی کا امکان بھی پیدا ہو رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ شیر اور شیرنی کا یہ جوڑا مویشیوں پر حملہ کرتا ہو اور تیسرا شیر صرف آدمیوں کا دشمن ہو۔ ہم نے اسی روز ایک اور بھینس کا انتظام کیا اور اسی راستے پر جہاں بھینس ہلاک ہوئی تھی، کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر دوسری بھینس کو درخت سے باندھ دیا۔ یہاں پھر زمین میں پہلے جیسا ایک گڑھا کھدوا گیا۔ اس مرتبہ ہم نے مسز میکنوش کو منّت سماجت کر کے بنگلے میں رہنے پر رضامند کر لیا اور ہم دونوں ضروری ساز و سامان سے لیس ہو کر مقررہ وقت پر گڑھے میں اتر گئے۔ ہمارے آدمیوں نے گھاس پھونس اور سوکھی شاخوں سے اس کا منہ بند کر دیا اور اُوپر سے ترپال ڈال دی۔ ہم نے باہر جھانکنے کے لیے سُوراخوں کا پہلے سے انتظام کر لیا تھا۔

یقین کیجیے کہ ہم تین راتیں مسلسل اس زمین دوز قبر میں بیٹھے انتظار کرتے رہے کہ کون سا شیر بھینس پر حملہ کرتا ہے، لیکن بے سُود۔ شیر آس پاس پھرتے تھے، ان کی آوازیں بھی ہم سنتے تھے، لیکن بھینس کے قریب کوئی نہ پھٹکتا تھا، شاید انہیں ہماری موجودگی کا کسی طرح پتا چل جاتا تھا۔ اس عجیب صورت حال نے ہمارا ذہن ہلا کر رکھ دیا۔

چوتھے روز صبح دس بجے ہم اپنے بنگلے کے برآمدے میں لیٹے رات کی نیند پوری کر رہے تھے کہ ہمیں جگایا گیا اور یہ خبر سنائی گئی کہ ہو للکر سے ایک میل دور کھجور کے درختوں کے اسی تاریک جھنڈ میں جہاں مسز میکنوش نے ایک ریچھ کو مارا تھا، آدم خور نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ ہم جتنی جلدی وہاں پہنچ سکتے تھے، پہنچے، لیکن یہ دیکھ کر ہمارے صدمے اور غصّے کی انتہا نہ رہی کہ مرنے والے کے رشتے دار اس کی لاش کے حصّے اٹھا کر لے جا چکے تھے۔ گویا آدم خور کے دوبارہ نمودار

جب حُسن نکھرتا ہے
زندگی مُسکراتی ہے

جب آپ کا حسن نکھرتا ہے تو قدم قدم پر خوشیاں بکھر جاتی ہیں، زندگی اپنے خزانے آپ پر کھول دیتی ہے۔ رنگ رُوپ نکھارنے کے لئے رکسونا صابن کا جواب نہیں۔ اِس میں قیمتی جڑی بوٹیوں سے تیار کئے ہوئے حسن بخش تیلوں کا ایک مرکب کیڈل شامل ہے جو آپ کے اپنے قدرتی رنگ روپ کو نکھارتا ہے۔
کیڈل آئیز سیز رکسونا صابن کے استعمال سے آپ کی جلد ملائم، شگفتہ اور بے داغ ہو جاتی ہے۔ اور آپ کا قدرتی حُسن نکھر آتا ہے۔

اپنا حسن نکھارنے کے لئے ان تین باتوں پر عمل کیجئے
۱۔ رکسونا صابن کا بہت سارا جھاگ اپنے ہاتھوں میں بنائیے۔
۲۔ پچاس سیکنڈ تک یہ جھاگ اپنے چہرے پر ملئے۔
۳۔ جھاگ دھو ڈالیے اور نرم تولیے سے تھپک تھپک کر چہرہ خشک کر لیجئے۔
دن میں تین بار یہ عمل دہرائیے

رکسونا صابن آپ کے رنگ رُوپ کو نکھارتا ہے

رکسونا
لیور برادرز کا بنایا ہوا

R.P. 33 - 193- 65- UD

ہونے کا امکان ہی ختم ہو چکا تھا۔ ایک اور بھینس خرید کر اس مقام سے پچاس گز کے فاصلے پر باندھی گئی جہاں آدم خور نے اس شخص کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک اونچے اور مضبوط درخت پر مچان باندھی گئی، لیکن میکٹوش نے اس روز میرا ساتھ دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ گزشتہ چار راتوں سے نہیں سو سکا ہے اور اب آرام کرنا چاہتا ہے۔ میں تمام رات الیلا اُلّوؤں کی طرح مچان پر بیٹھ کر آدم خور کا انتظار کرتا رہا اور جب سورج نکلنے کے آثار ظاہر ہوئے تو مچان سے اُتر کر تھکن، مایوسی اور صدمے کی مجسم علامت بنا ہوا للکر پہنچا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ بھینس کو کھول کر لے آئیں۔ آدھ گھنٹے بعد وہ لوگ انتہائی بدحواس اور خوف زدہ حالت میں آئے اور بتایا کہ جب وہ بھینس کھول رہے تھے تو چند گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں سے شیر کے غرّانے کی آواز سنائی دی۔ ان بے وقوفوں نے بھینس کو وہیں چھوڑا اور خود بھاگ آئے۔ اگرچہ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا لیکن یہ قیمہ شاید پھر نہ ملتا۔ میں نے میکٹوش کو موٹر نکالنے کی ہدایت کی اور پندرہ منٹ بعد جب ہم اسی جگہ پہنچے تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بھینس ابھی تک زندہ سلامت ہے، حالاں کہ مجھے یقین تھا کہ آدمیوں کے بھاگتے ہی شیر نی یا شیر جھاڑیوں سے نکل کر بھینس کا قصہ پاک کر چکا ہوگا۔ ایک بجے دوپہر تک ہم مچان پر بیٹھے رہے لیکن شیر کی آواز سنائی نہ دی۔ تنگ آکر ہم نے بھینس کھولی اور اسے لے کر ہو للکر پہنچ گئے۔ اس رات یہ طے ہوا کہ میکٹوش اور اس کی بیوی موٹر میں ہوس دُرگا جائیں اور اسی گڑھے میں چھپ کر بیٹھ جائیں جہاں ایک بھینس پہلے بندھی ہوئی ہے اور میں پھر اس مچان پر پہرہ دوں گا، لیکن یہ رات بھی بے کار گئی۔ صبح ساڑھے چھ بجے دونوں اپنی کار میں ہوس درگا سے آئے اور مجھے مچان سے اتار کر ہو للکرے گئے اور بتایا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہاں بندھی ہوئی بھینس بھی صحیح سلامت ہے۔

شام کو چار بجے جب کہ ہم خرّاٹے لے رہے تھے، بنگلے کے باہر آدمیوں کا بے پناہ غل غپاڑا سن کر آنکھ کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ گاؤں کے کچھ لوگ اپنے مویشیوں کو بیچنے کے لیے چتپل ڈروگ لے جا رہے تھے کہ موللکر سے تین میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا ہوا ایک شیر چھپکے سے نکلا، ایک آدمی پر جھپٹا، اسے گرایا اور پھر گردن منہ میں دبا کر نہایت فاتحانہ انداز سے چلتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ بیس پچیس آدمیوں کا یہ گروہ دہشت سے یہ خونیں کارروائی دیکھتا رہا اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ آدم خور کو للکارتا یا اپنے ساتھی کی جان بچانے کی کوشش کرتا۔ جب آدم خور اسے لے گیا تو ان لوگوں کی جان میں جان آئی، یہ چیختے چلّاتے گاؤں کی طرف واپس آ گئے اور اب ہمارے بنگلے کے سامنے کھڑے مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں آدم خور سے نجات دلائی جائے۔

میں نے اُن لوگوں سے کہا کہ اگر وہ لاش دریافت ہونے کے بعد اسے وہیں پڑا رہنے دیں تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ انہوں نے وعدہ کیا تو ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں، موٹر میں بیٹھے اور چند منٹ کے اندر اندر جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ شیر نے جس جگہ اس بدنصیب شخص کو گرایا تھا وہاں خون کے تازہ دھبّے دکھائی دیے اور جس طرف شیر اسے لے گیا، اس طرف بھی کہیں کہیں خون کے دھبّے موجود تھے، شام کے پانچ بج رہے تھے اور ابھی سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ جب ہم ان دھبّوں کا سُراغ لگاتے ہوئے گھنے جنگل میں داخل ہوئے تو وہیں ایک جگہ اس کے پھٹے ہوئے اور خون میں لت پت کپڑے دکھائی دیے۔ آدم خور نے جس جگہ اسے منہ سے نکال کر ڈالا تھا، وہاں خون بڑی مقدار میں گرا تھا۔ ہم نے چھ فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن یہ سوچ کر بار بار مجھے تعجب ہوتا کہ آدم خور نے اتنی دُور نکل آنے کے باوجود اپنے شکار کو ہڑپ نہیں کیا، بلکہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس راہ میں ایک مقام ایسا تاریک اور گنجان بھی تھا جہاں آدم خور اطمینان سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا لیکن وہ یہاں بھی نہیں رُکا۔ جنگل کا یہ حصہ انتہائی خطرناک، گنجان ترین اور تاریک تھا۔ ہم اب ٹارچوں کی روشنی میں پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہے تھے۔ ایک اونچے ٹیلے کے گرد، جہاں آٹھ آٹھ فٹ اُونچی گھنی، خاردار جھاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں، ہم نے اس آدمی کی لاش اس حال میں پائی کہ شیر اس کا تیسرا حصہ کھا چکا تھا۔

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا اور میں اس فکر میں تھا کہ اس موقع سے

کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے۔ دُور و نزدیک کوئی درخت ایسا نہ تھا کہ جس پر چڑھ کر آدم خور کا انتظار کیا جاتا۔ بار بار میری نظریں اس چٹان کی طرف جاتیں جس کی اونچائی بارہ فٹ تھی۔ اس چٹان کی دیواریں تین طرف سے بالکل سیدھی تھیں اور شیر ان پر کسی طرح نہیں چڑھ سکتا تھا، البتہ چوتھی دیوار اس زاویے سے مُڑی ہوئی تھی کہ شیر ادھر سے بآسانی اوپر تک آسکتا تھا۔ بہرحال یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو پتا چلا کہ لاش یہاں سے نظر بھی نہیں آتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں چٹان پر لیٹ جاؤں اور شیر چپکے سے آکر لاش کو ہڑپ کرنا شروع کردے تو جب تک اس کی آواز میرے کانوں میں نہ آئے گی، میں اس کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ چوتھی طرف سے دبے پاؤں آکر مجھے دبوچ بھی سکتا ہے۔ مجھے خوب احساس تھا کہ آدم خور کتنا قوی اور پھرتیلا ہوگا اور بارہ فٹ اُونچی چھلانگ لگا کر مجھے گھسیٹ لے جانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

میں نے میکنٹوش کو یہ نازک پوزیشن سمجھائی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ اس ٹیلے پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اگر اپنی موٹر میں جاکر اور ہوس دُرگاہ کے درمیانی راستے پر آدھی رات تک معمولی وقفوں کے بعد چکر لگاتا رہے تو ممکن ہے آدم خور کا اس سے آمنا سامنا ہوجائے یا وہ ڈر کر اس ٹیلے کی طرف آنکلے۔ دونوں صورتوں میں ہم اسے رائفل کا نشانہ بنا سکیں گے۔ میکنٹوش کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور مجھے وہ خدا کے سپرد کرکے رخصت ہوا۔ تنہائی کا احساس ہوتے ہی میرے قلب کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اس قسم کی مہمّوں میں پہلے کر چکا تھا، لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ اُس رات رہ رہ کر دل دھڑکتا اور رونگٹے آپ ہی آپ کھڑے ہوجاتے تھے۔ دراصل میری چھٹی حس بیدار ہو رہی تھی اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ خطرہ میرے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ میں چٹان پر بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ کبھی کبھی آنکھیں گھما کر دائیں جانب تاریکی میں گھورتا تو جنگلی جھاڑیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آتیں جیسے مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے ٹھیک دس بجے تھے۔ یکایک جنگل میں غالباً ایک میل دُور کوئی سانبھر چھیڑوں کی پوری قوت سے چلّایا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ڈرامے کا آغاز ہوچکا تھا، کیوں کہ ایک منٹ بعد ہی شیر کے بولنے کی آواز سنائی دی جس کے جواب میں ٹرک کی طرف سے دوسرا شیر غرّایا۔ یہ آوازیں سن کر میرے دل میں دو شیروں کے بارے میں جو ہلکا سا شبہہ تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ ان میں سے ایک یقیناً آدم خور تھا اور دوسرا مویشیوں کو اٹھا لے جانے والا۔ اس کے باوجود اس علاقے میں تیسرے شیر کے وجود کا امکان بھی بعید از قیاس نہ تھا۔ شیروں کے لڑنے سے جنگل کی خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ جنگلی گیدڑ اور چرخ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے ہوئے سینکڑوں پرندے فضا میں پرواز کرنے لگے۔ اُلو مسلسل ہُو ہُو کر رہے تھے اور ان تمام آوازوں کے ساتھ پورب کی طرف سے چلنے والی تیز ہوا جب جھاڑیوں کے اندر سے سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے بدرُوحیں بین کر رہی ہیں، لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ شیروں کے چُپ ہوتے ہی یہ سارا ہنگامہ یک لخت یوں رُک گیا جیسے برپا ہی نہ ہوا تھا۔

آدم خور کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ اعصاب جواب دینے لگے اور میں آنکھیں بند کرکے دوبارہ لیٹا ہی تھا کہ میری پشت پر عجیب سی آواز بلند ہوئی۔ یقین کیجیے اگر میں قلابازی کھانے میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کرتا تو وہ مجھے منہ میں دبا کر کبھی کا رفوچکر ہوجاتا۔ وہ میری بے خبری سے فائدہ اٹھا کر چپکے چپکے ٹیلے کی طرف آیا، چاروں طرف گھوما اور پھر اس نے معلوم کرلیا کہ "شکار" دبوچنے کا کون سا راستہ آسان رہے گا۔ نظروں ہی نظروں میں بارہ فٹ کا فاصلہ بھانپ کر اس نے پوری قوت سے جست کی، اس کا دایاں پنجہ میرے مضبوط جوتے کو چیرتا ہوا نکل گیا، ایک پُرشور آواز کے ساتھ وہ نیچے گرا اور دہاڑتا ہوا جنگل میں غائب ہوگیا۔

دہشت سے خون میری رگوں میں جم گیا اور رُوح سمٹ کر گویا میرے کلیجے میں آگئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میری کون سی نیکی اس وقت کام آگئی تھی کہ آدم خور کا تر لقمہ بننے سے بال بال بچ گیا۔ بہرحال میں دل ہی دل میں اس مُوذی کی عیاری اور پھرتی کی داد دیتا رہا لیکن صبح تک یہ کیفیت رہی کہ معمولی سی آہٹ یا آواز پر چونک اٹھتا اور ہر طرف مجھے شیر ہی شیر گھڑے نظر آتے۔ جب سورج خاصا بلند ہوگیا تو میں ٹیلے سے اُترا

آدم خور کو لاش کا بقیہ حصّہ ہڑپ کرنے کی شاید جرأت نہ ہوئی۔ وہ ویسے ہی پڑی تھی۔ میں نے اسے گِدھوں سے بچانے کے لیے گھاس پھونس سے ڈھانپ دیا، کیوں کہ رات کو پھر یہاں آنے کا تہیّہ کر چکا تھا۔

نتلے پر پہنچ کر میکٹوش کو اپنی ناکامی اور آدم خور کے حملے کی خبر سنا ہی رہا تھا کہ ہوس درگا سے آدمیوں کی ایک جماعت آن پہنچی اور بتایا کہ ہم نے جو بھینس گڑھے کے قریب باندھی تھی اس کا تیا پانچا ہو چکا ہے۔ یہ خبر سُن کر جی چاہا کہ کپڑے پھاڑ ڈالوں اور دیواروں سے سر ٹکرا کر جان دے دوں ذہن کام ہی نہیں کر رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم مشرق کی طرف دوڑتے تھے تو واردات مغرب میں ہوتی تھی اور مغرب کی طرف جاتے تھے تو حریف شمال میں کھڑا ہماری بے بسی پر قہقہے لگاتا۔

شام ہوتے ہی ہم پھر بے حیا شکاریوں کی طرح اسی گڑھے پر کھڑے بھینس کی لاش کا معاینہ کر رہے تھے۔ شیر نے اس کی اوجھڑی نکال کر باہر پھینک دی تھی اور گوشت کسی اور وقت کھانے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس اُمید پر کہ شیر اب ضرور آئے گا، ہم آدھی رات تک گڑھے میں دُبکے رہے۔ کوئی ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ شیر کی آواز سنائی دی، ہم نے سانس روک لیے اور شیر کی آمد کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے، لیکن آدھ گھنٹے تک بولنے اور ادھر اُدھر بھاڑیوں میں حرکت کرنے کے باوجود وہ لاش پر آنے سے کترا تا رہا۔ ہماری طرف سے بے چینی اور اضطراب دم بدم بڑھتا جاتا تھا۔ دفعتہً میکٹوش نے اپنے اوپر سے گھاس پھونس ہٹائی اور باہر نکلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے سختی سے اس کی ٹانگ پکڑی اور ڈانٹا:

"یہ کیا حماقت سُوجھی ہے؟"

"یار میں اس روز روز کی بھک بھک سے تنگ آگیا ہوں"۔ اس نے جھلا کر کہا۔ "آؤ تم بھی باہر نکلو، ہم دونوں آپس میں اونچی آواز سے باتیں کرتے ہوئے ایک طرف چلیں گے اور پھر چپکے سے اسی گڑھے میں آکر دبک جائیں گے۔ شیر یہ سمجھے گا کہ ہم چلے گئے ہیں، پھر وہ لاش پر آئے گا"

میں نے ایک لمحے کے لیے اس تدبیر پر غور کیا۔ کچھ تنگ نہیں کہ یہ عام حالات میں کارگر ثابت ہوتی، مگر ہمارا واسطہ آدم خور سے تھا،

چنانچہ میں نے میکٹوش کے ایک دو تھپڑ رسید کیا۔

"آئندہ تمہیں ساتھ لانے والے پر ہزار لعنت ۔۔ کیا کہنے ہیں اس دلیری کے۔ ادھر تم نے گڑھے سے باہر قدم رکھا اور اُدھر آدم خور نے تمہاری گردن ناپی۔ میرے بھائی، فرض کرو آس پاس دو شیر پھر رہے ہوں اور ان میں سے ایک آدم خور ہو تو ہم کیا کر سکیں گے؟ اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کے بجائے چپ چاپ یہیں بیٹھے رہو۔"

صبح تک شیر مسلسل غرّاتا رہا، لیکن لاش کے نزدیک نہ آیا۔ اُسے نہ جانے کیسے پتا چل جاتا تھا کہ ہم لوگ گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں صبح ہوتے ہی شیر اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔ اور ہم مُنہ لٹکائے اپنے نتلے پر پہنچ گئے۔ اگلے دو دن تک کسی واردات کی خبر سننے میں نہ آئی۔ البتہ ہم موڑے کر رات رات بھر ہوس دُرگا، ہوللکرہ اور جیتی دُرگ کی درمیانی سڑکیں ناپتے رہے، اور ٹارچ روشن کر کر کے آدم خور کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ سچ پوچھیے تو کھانا، پینا اور سونا سب جھٹ گیا تھا اور دُھن تھی تو یہی کہ مُوذی سے ایک بار آمنا سامنا ہو، لیکن وہ ہر بار طرح دے جاتا تھا۔

تیسرے روز صبح ہی صبح چند لکڑہاروں نے گاؤں میں آکر بتایا کہ گزشتہ رات ایک شیر نے اُن کے "کیمپ" پر حملہ کیا اور ایک بیل کو زخمی کر کے بھاگ گیا۔ یہ لکڑہارے ہوس دُرگا سے چار میل دور جنگل کے اندرونی حصّے میں لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ ان کے پاس پانچ بیل گاڑیاں تھیں۔ رات کو انہوں نے پانچوں گاڑیاں ایک دائرے کی شکل میں کھڑی کیں اور ان کے باہر آگ کے الاؤ روشن کر دیے اور خود اطمینان سے سو گئے۔ پچھلے پہر یکایک بیلوں کی اُچھل پھاند اور شیر کی گرجدار آواز سے بیدار ہوئے، دیکھا کہ بجھتی ہوئی آگ، اور مدھم روشنی میں ایک بڑا شیر بیلوں سے گتھم گتھا ہے۔ لکڑہاروں نے فوراً کوئلے اور جلتی ہوئی لکڑیاں اس کی طرف پھینکیں تو شیر بھاگ نکلا، لیکن جاتے جاتے ایک بیل کو ادھ موا کر گیا۔

ان لکڑہاروں میں سے ایک آدمی ایسا تھا جس کو اس جنگل کے چپّے چپّے کا اچھی طرح علم تھا۔ اس نے مجھے بتایا:-

"صاحب، جس مقام پر شیر نے ہم پر حملہ کیا، وہاں سے چوتھل دُور

جنگل کے عین بیچوں بیچ ایک برساتی ندی ہے جو ارد گرد کی پہاڑیوں کے گرد چکر کاٹتی ہوئی ایک تالاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گرمیوں میں یہ مقام انتہائی سرد اور آرام دہ بن جاتا ہے اور جنگل کے اکثر درندے دن بھر یہیں آرام کرتے اور پانی پیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج کل بھی شیر وہیں رہتے ہیں، کیوں کہ کئی مرتبہ صبح سویرے یا شام کو گھومتے وقت میں نے اُدھر اُن کے پنجوں کے نشان دیکھے ہیں۔ یہ جگہ بہت گنجان اور تاریک بھی ہے اور بہت کم لوگوں نے دیکھی ہوگی۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو لیے چلتا ہوں۔"

اس شخص کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ واقعی اس جنگل کے بارے میں اس کی معلومات وسیع ہیں، چنانچہ ہم نے اس سے طے کر لیا کہ دوپہر کو کھانے کے بعد اس کے ساتھ وہاں چلیں گے۔ سہ پہر کے تین بجے تھے کہ ہم اس تالاب پر پہنچ گئے یہ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے چاروں طرف اونچے بہاڑی ٹیلے کثرت سے تھے۔ ہم نے اس ندی کا بھی معائنہ کیا جو اس تالاب پر آن کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے کناروں پر شیر اور شیرنی کے پنجوں کے تازہ نشانات فوراً نظر آئے اور اطمینان ہو گیا کہ ہم غلط جگہ پر نہیں آئے۔ تالاب کے بالکل قریب جہاں ندی کا پانی اس میں گرتا تھا، آم کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت کھڑا تھا اور مچان باندھنے کے لیے بے حد موزوں۔

ہم نے پندرہ فٹ کی بلندی پر مچان باندھی۔ یہ مچان دراصل ایک چارپائی تھی جو اسی مقصد کے لیے لکڑہارا اپنے سر پر اٹھا کر گاؤں سے لایا تھا۔ مچان بندھ چکی تو لکڑہارے نے واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن میں نے اُسے روک لیا۔ شام کے وقت اسے تن تنہا بھیجنا حماقت تھی، کیوں کہ آدم خور جنگل میں موجود تھا جو یقیناً اس بے چارے کا گلا دبا دیتا۔ ہم نے اپنے ساتھ اسے بھی مچان پر بٹھا لیا۔ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد جنگل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ سناٹا تو پہلے ہی طاری تھا۔ جنگل کے بادشاہ کے خوف سے کسی اور جانور کو ادھر آنے کی جرأت نہ ہوتی۔ وقت گزرتا گیا، کوئی آواز، کوئی آہٹ سنائی نہ دی۔ صبح کاذب کے وقت سانبھر کے بولنے کی آواز آئی اور ہم اشارہ پا کر چوکنے ہو گئے۔

چار بجے کے لگ بھگ ہم نے دائیں جانب ایسی آواز سُنی جیسے کوئی بھاری بانس کے گرے ہوئے خشک پتوں پر آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ پھر شیر کے ہانپنے کی مانوس آواز کانوں میں آئی۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، مگر کچھ نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کچھ یوں احساس ہوا جیسے شیر تالاب کے کنارے کھڑا پانی پی رہا ہے۔

آخر وہ نازک گھڑی آن پہنچی جس کا ہمیں ہفتوں سے شدید انتظار تھا۔ میں نے میکبوش کو اشارہ کیا کہ پہل کرے۔ اس نے فوراً ٹارچ روشن کی اور ارد گرد کا منظر عیاں ہو گیا۔ ہم نے دیکھا کہ روشنی ہوتے ہی درندے نے ہماری طرف نگاہ کی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی آنکھوں کے سُرخ و سفید حلقے بڑے بھیانک نظر آ رہے تھے۔ اسی لمحے میکبوش کی رائفل سے گولی نکلی اور درندہ دل دوز چیخ مار کر پیچھے اُلٹ گیا۔ زمین پر اس کا لوٹنا اُچھلنا، اور پوری قوت سے گرجنا آج تک یاد ہے۔ اس کی دُم تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ یکایک اس نے چھلانگ لگائی اور درخت کی طرف آیا، مگر فوراً ہی میکبوش نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور درندہ پھر قلابازی کھا کر پیچھے ہٹ گیا اور تالاب کے عین کنارے چند منٹ تڑپنے کے بعد بے حس و حرکت ہو گیا۔

ہمیں اس وقت مچان سے اتر کر اس کے قریب جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب سورج نکل آیا تو اس کے قریب گئے۔ اس کا آدھا دھڑ پانی سے باہر تھا۔ نہایت خوبصورت اور شاندار شیر تھا۔ میکبوش کی پہلی گولی اس کی ناک پر لگی جس نے اس کا جبڑا بے کار کر دیا اور گلے میں پیوست ہو کر رہ گئی۔ دوسری گولی اس کے بائیں کندھے میں لگی تھی اور تیسرا نشانہ خالی گیا۔ جب ہم نے اس کے پنجوں اور دانتوں کا معائنہ کیا تو کچھ شک سا گزرا کہ یہ شیر آدم خور نہیں ہو سکتا۔ بہرحال میکبوش سے ذکر کیے بغیر جب ہم اس کی لاش لے کر گاؤں پہنچے تو گاؤں والوں کے جوش و خروش اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ فوراً ہی "آدم خور" کے مارے جانے کی خبر ہر جگہ پھیل گئی اور اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔

عجیب بات یہ تھی کہ ان چار دنوں میں کوئی نئی واردات بھی نہ ہوئی اور میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گیا کہ آدم خور یہی ہو گا۔

گاؤں کے لوگ اب اطمینان سے جنگل میں آنے جانے لگے اور وہ رونق جو آدم خور کی وحشیانہ سرگرمیوں کے باعث جاتی رہی تھی، دوبارہ لوٹ آئی، لیکن ان کا یہ اطمینان اور خوشی عارضی ثابت ہوئی کیوں کہ چھٹے روز ہی جیتل دُروگ سے یہ خبر ملی کہ وہاں ایک چودہ سالہ لڑکے کو آدم خور اٹھا کر لے گیا۔ یہ حادثہ یوگی مت کی پہاڑی ڈھلوانوں کے قریب پیش آیا جو جیتل دُروگ کے جنوب میں واقع ہیں اور یہاں صدیوں پرانے قلعے کے کھنڈر بھی موجود ہیں۔

ہم اسی وقت اپنی موٹریں میں بیٹھے اور جیتل دُروگ روانہ ہو گئے۔ ہمیں وہ جھونپڑی دکھائی گئی جس کے اندر گھس کر آدم خور نے سوتے ہوئے لڑکے کو منہ میں دبایا اور پہاڑی کی طرف بھاگ گیا تھا۔ لوگوں کے بیانات سے اندازہ ہوا کہ آدم خور لاش کو قلعے کے کھنڈروں میں لے گیا ہے اور ممکن ہے اب بھی وہیں موجود ہو۔ اس دوران میں کسی شخص نے بھی اُدھر جانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ جیتل دُروگ کے جنوب کا تمام علاقہ پہاڑی اور بے آب و گیاہ ہے۔ ہر طرف خشک اور سنگلاخ چٹانیں پھیلی ہوئی ہیں، ہم نے بیس پچیس آدمیوں کو ساتھ لیا اور لاش کی تلاش میں کھنڈروں کی طرف بڑھنے لگے، لیکن بہت جلد پتا چل گیا کہ آدم خور اپنے شکار کو لے کر اس طرف نہیں گیا۔ ایک جگہ رُک کر میں نے ان آدمیوں کو پانچ پانچ کے گروپ میں تقسیم کر کے ہدایت کی کہ وہ چاروں طرف پھیل کر ایسے نشانات تلاش کریں جن سے معلوم ہو کہ آدم خور کس طرف گیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد خبر ملی کہ بائیں جانب سے چوتھائی میل دُور ایک ٹنڈ منڈ درخت پر بہت سے گدھ بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہاں لاش ضرور پڑی ہے۔ پتھروں کو پھلانگتے اور خاردار جھاڑیاں عبور کرتے ہوئے جب ہم وہاں پہنچے، تو لڑکے کی ہڈیوں اور کھوپڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ آدم خور کے پیٹ بھرنے کے بعد رہی سہی کسر گدھوں اور چیلوں نے پوری کر دی تھی۔ امید تو نہ تھی کہ آدم خور ان بچی کھچی ہڈیوں پر دوبارہ آئے گا، لیکن اس کی فطرت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم نے اسی درخت پر مچان بندھوانے کا فیصلہ کیا جو تھوڑی دیر پہلے گدھوں کے اڈے کا کام دے رہا تھا۔

چھ آدمی ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے دو کو میکوٹش کے ساتھ چٹان پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور چار آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر قلعے کے کھنڈروں کی طرف چلا۔ سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا، اس لیے ان کھنڈروں کو دیکھنے بھالنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا تھا۔ یہ راستہ انتہائی دشوار گزار اور خطرناک تھا اور جب میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھی آگے بڑھنے سے کترا رہے ہیں اور بار بار واپس چلنے کا مشورہ دے رہے ہیں، تو میں نے ایک جگہ رُک کر انہیں انتظار کرنے کی ہدایت کی اور خود پتھروں کو پھلانگتا ہوا اور جھاڑیوں میں اُلجھتا پھلانگتا قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں وحشت انگیز سناٹا طاری تھا اور فضا میں عجیب طرح کی ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

میں برسوں پہلے بھی ایک مرتبہ یہ کھنڈر دیکھنے آیا تھا، لیکن یہ اب بھی ویسی ہی حالت میں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لیل و نہار کی گردش سیاہ پتھریلی دیواروں، جھکے ہوئے ستونوں اور ٹوٹی ہوئی چھتوں پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی۔ مغرب کی طرف لمحہ بہ لمحہ جھکتے ہوئے سورج کی زرد کرنوں میں یہ کھنڈر عجب ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ کر سانس درست کرنے اور پسینہ پونچھنے لگا۔ معاً میری چھٹی حس بیدار ہوئی اور اس نے خطرے کا اعلان کیا۔ میں نے بھری ہوئی رائفل کے ٹریگر پر اُنگلی رکھ دی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اپنی قوتِ سماعت پر بڑا اعتماد تھا اور اسی کی بدولت کئی مرتبہ میری جان بچی تھی۔ میں نے اپنے دائیں جانب گھنی جھاڑیوں میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن لی تھی اور اب میں بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا آنکھیں گھما کر اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں جھاڑیوں کا فاصلہ ماپ لیا۔ وہ مجھ سے تیس گز دور تھیں اور ان میں چھپا ہوا آدم خور نہایت مکاری سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق مجھے بے خبری میں دبوچ لینا چاہتا تھا۔

اب وہ مجھ سے بیس گز دُور تھا..... پندرہ گز..... بارہ گز..... دس گز..... یکایک اس نے اپنا سر اٹھایا اور میں نے دیکھا کہ وہ شیرنی ہے۔ پھر جبڑا کھول کر وہ آہستہ سے غرّائی۔ میں نے اس کے

چمکتے ہوئے لمبے دانت دیکھے اور اس سے مشتبہ کہ وہ مجھ پر چھلانگ لگائے، میری گولی اس کا جبڑا توڑتی ہوئی گردن میں سے نکل گئی لیکن کس بلا کی قوت اس کے اندر کام کر رہی تھی۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود اندھا دُھند میری طرف جھپٹی، لیکن مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر آن کر گری اور پھر دہاڑتی گرجتی اُلٹے قدموں بھاگی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ اس کی گردن سے اُبلتا ہوا خون صاف غمازی کر رہا تھا کہ وہ کدھر گئی ہے۔

مجھے اتنا یاد ہے میرے نشانے خالی نہیں گئے اور شیرنی آگے جا کر یقیناً گر گئی ہوگی، لیکن میری کیفیت یہ تھی کہ بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں بے ہوش ہونے ہی والا ہوں۔ میں گرتا پڑتا اور جھاڑیوں میں سے لہولہان ہو کر اس درخت تک پہنچ گیا جہاں میرے ساتھی موجود تھے۔ انہوں نے شیرنی کے گرجنے اور فائروں کی آوازیں سن لی تھیں اور اب یہ سوچ رہے تھے کہ آیا انہیں میری تلاش میں جانا چاہیے یا نہیں۔ دراصل وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ میں زندہ واپس نہیں آسکوں گا۔ انہوں نے مجھے سنبھالا اور ابھی ہم ایک فرلانگ گئے ہوں گے کہ میکوش اور دوسرے دو آدمی بھاگتے ہوئے ہماری طرف آتے نظر آئے۔ انہوں نے بھی فائروں کی آوازیں سن لی تھیں۔ میکوش نے مجھے زخمی دیکھا تو وہ یہی سمجھا کہ آدم خور نے مجھے چیر پھاڑ ڈالا ہے اور میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ میں نے اُسے تسلی دی اور سارا قصہ سنایا۔ چند لمحے آرام کرنے کے بعد ہم سب پھر قلعے کی طرف چلے۔ اس مرتبہ میکوش آگے آگے تھا اور پیچھے گاؤں والے لالٹینیں لیے چل رہے تھے۔ شیرنی کے جسم سے جا بجا گرا ہوا خون ہماری رہنمائی کر رہا تھا جس مقام پر اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہاں سے صرف ساٹھ گز دُور جھاڑیوں میں خون بہت زیادہ مقدار میں دیکھا گیا۔ اس سے پتا چلا کہ زخمی شیرنی یہاں رُکی تھی۔ میکوش اندھا دھند آگے بڑھ رہا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی، مگر بے سُود۔ جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے ہوئے اس کے کپڑے بھی پھٹی ہو رہے تھے اور چہرے بازوؤں اور ٹانگوں پر بے شمار خراشیں آچکی تھیں۔

ایک جگہ وہ اچانک رُکا اور پھر پیچھے ہٹ کر چند پتھر اُٹھائے اور جھاڑی کے اندر پھینکنے لگا۔ غالباً آدم خور شیرنی اس کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ رائفل تان کر آگے بڑھا اور میں نے ٹارچ روشن کی۔ اُسی لمحے زخمی شیرنی نے کروٹ لی اور میکوش کے اُوپر چھلانگ لگائی لیکن چند فٹ کے فاصلے پر ہی آکر گر پڑی اور جبڑا کھول کر غرّانے لگی۔ ہمارے ساتھی لالٹینیں پھینک کر بھاگ نکلے، لیکن اب ہمیں اس زخمی اور معذور شیرنی سے کوئی خطرہ نہ تھا، کیوں کہ وہ مرنے ہی والی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ تین گولیاں کھانے کے باوجود وہ اتنی دیر تک زندہ کیسے رہی۔ میکوش نے چند لمحے تک شیرنی کو غور سے دیکھا اور پھر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اور اس طرح چیتل دروگ، ہوس دُرگا اور ہولکر میں تباہی مچانے والی آدم خور شیرنی اپنے انجام کو پہنچ گئی جس نے نہ جانے کتنے انسانوں کو ہڑپ کیا تھا اور جن میں نوجوان اور بھولا بھالا شکاری ٹاڈ بھی شامل تھا، لیکن میں اس بات پر حیران ہوں کہ وہ دونوں الگ الگ فطرت رکھنے کے باوجود اکٹھے ہی شکار کو کیوں نکلتے تھے۔ نیگلور روانہ ہوتے وقت میں نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ شاید ایک اور آدم خور بھی جنگل میں موجود ہے اور اب کوئی واردات ہو تو فوراً مجھے اطلاع کی جائے لیکن کئی مہینے گزر گئے اور وہاں سے کوئی خبر نہ آئی تو مجھے اطمینان ہوا۔

■■

خریداران اُردو ڈائجسٹ

سے التماس

۱۔ جن اصحاب کے سالانہ چندے ختم ہو گئے ہیں وہ ہر ماہ کی بیس تاریخ سے پہلے بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ رقم ارسال کر دیا کریں۔ اس کے بعد معمول ہونے والی رقوم کا اندراج بروقت نہیں ہو سکتا اور ادارہ وی پی پی جاری کر دیتا ہے وی پی پی واپس آنے پر ادارے کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت براہ کرم خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔ اس کے بغیر بروقت عمل درآمد مشکل ہے۔

منیجر: اُردو ڈائجسٹ

کو بڑی مشکل سے ٹھکانہ ملتا ہے

بادشاہوں کا غریب خانہ

جان شرلاک

بروک اینڈ ڈیوئیر سٹریٹ لندن کا ایک نسبتاً خاموش اور غیر معروف حصہ ہے۔ سیاحوں اور غیر ملکی لوگوں کی نظر میں یہ جگہ کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں۔ بروک سٹریٹ کے موڑ پر قدیم طرز کی ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جس کے صدر دروازے پر سادہ سے حروف میں کلیرج ریسٹورنٹ لکھا ہے۔ یہ عمارت بہت سادہ ہے۔ جگمگاتی روشنیاں ہیں نہ بڑے بڑے شیشوں والے دروازے۔ صدر دروازے پر گہری نیلی وردی میں ملبوس ایک دربان بت بنا کھڑا رہتا ہے۔ کوئی بھولا بھٹکا راہگیر اندر جانے کی کوشش کرے تو استقبال کرنے کے بجائے دربان کی بھنویں تن جاتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ راہگیر کو کچا ہی چبا لے گا۔ ہوٹل کا بار روم بھی خاموش خاموش سا ہے۔ بلیڈ والے کہیں نہیں دکھائی دیتے بڑی بڑی آبنوسی میزیں اکثر خالی پڑی رہتی ہیں کبھی کبھی کسی تقریب پر دھیمی دھیمی موسیقی سنائی دیتی ہے۔ اس ہوٹل کا کھانا بہت عمدہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایسا اچھا کھانا لندن کے کسی اور ہوٹل میں نہیں ملتا۔ عمارت کے اندر چکا چوند پیدا کرنے والی روشنیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ راہداریاں نیم روشن ہیں۔ فرش پر قدیم طرز کے موٹے قالین بچھے ہیں جن پر چلنے سے ہلکی سی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کمروں کے اندر کا فرنیچر وکٹوریہ کے عہد کا ہے۔ اونچی اونچی زرنگار کرسیاں ہیں۔ بڑے پلنگ، کھڑکیوں پر بھاری پردے، قیمتی مگر پرانا ساز و سامان، اس ہوٹل کی نمایاں خصوصیتیں ہیں جدید طرز کے شاندار ہوٹلوں کے مقابلے میں یہ جگہ نہایت بے قاعدہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ہوٹل دنیا کے گراں ترین ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے باوجود دنیا بھر کے کھرپتی اور امیر کبیر لوگ اس ہوٹل میں ٹھہرنے کے لیے ترستے ہیں۔ مستقل گاہکوں میں یونان کے شہنشاہ اور ملکہ، نیدرلینڈ کا شہزادہ اور شہزادی، ڈیوک اور ڈچز آف ونڈسر جیسی بڑی بڑی شخصیتیں شامل ہیں۔ اپنی زندگی میں سر ونسٹن چرچل نے بھی کئی بار یہاں قیام کیا تھا ملکہ الزبتھ کی تاجپوشی پر گیارہ شاہی خاندان کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرے تھے۔ یہ اعزاز دنیا کے صرف اسی ہوٹل کو نصیب ہوا ہے کہ اس کے دروازے پر گیارہ مملکتوں کے پرچم آویزاں تھے۔

کلیرج ریسٹورنٹ میں صرف ان لوگوں کو کمرہ ملتا ہے جو کسی خاص وجہ سے مشہور و معروف ہوں۔ عام لوگ خواہ وہ کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں، یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ہوٹل میں کمرہ لینے کے لیے پہلے سے درخواست دینا پڑتی ہے۔ ہر درخواست پر انتظامیہ باقاعدہ غور و فکر کرتی ہے اور درخواست دہندہ کے خاندان، نام اور معاشرتی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ دیتی ہے۔ ریسٹورنٹ میں ایک

رجسٹر ہے جس میں دُنیا بھر کے شاہی خاندانوں کے نام اور پتے درج ہیں۔ جونہی کسی شہنشاہ یا سربراہ مملکت کے ہاں بچّہ پیدا ہوتا ہے، اس کا نام بھی رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے۔ دس پندرہ یا بیس سال بعد جب وہ بچّہ بڑا ہو کر کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کرے گا، انتظامیہ فوراً رجسٹر سے اس کے نام اور پتے کی تحقیق کرے گی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شخص وہی ہے جس کا بیس سال قبل نام درج کیا گیا تھا تو انتظامیہ کی طرف سے خوش آمدید کا ایک خط لکھ دیا جائے گا۔ دُوسری صورت میں ہوٹل میں ٹھہرنے کے خواہش مند کو مناسب اور موزوں الفاظ میں لکھا ہوا ایک معذرت نامہ بھیج دیا جائے گا۔ دُنیا کے مختلف حصّوں سے شاہی خاندان کے افراد، شہنشاہ، سلطان، نظام، سردار وغیرہ یہاں آتے ہیں اور اس الف لیلائی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعے کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ ایک ستائیس سالہ برطانوی فوجی افسر نے دس روز تک مسلسل کوشش کی کہ اُسے نئے سال کی آمد پر ہوٹل کی طرف سے دی جانے والی دعوت میں شمولیت کی اجازت مل جائے لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اسے ایک تدبیر سُوجھی، ایک خط میں اس نے کمرہ لینے کی خواہش ظاہر کی اور اپنے آپ کو پشاور کا مہاراجا ظاہر کیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پشاور پاکستان میں ہے اور وہاں کوئی مہاراجا نہیں لیکن یہ محض شرارت تھی اور وہ ہوٹل کی انتظامیہ کو آزمانا چاہتا تھا۔ اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اگلے ہی روز اسے کلیرج ریسٹورنٹ کی طرف سے "خوش آمدید" کا خط مل گیا۔ اس نے اپنی ماں کو سفید ساٹک کی ساڑھی پہنا کر مہارانی بنا دیا، خود سُوٹ پہن کر ریشمی پگڑی سر پر باندھی۔ دونوں نے اپنے چہرے سیاہ کیے۔ "آنریبل پرنس آف پشاور" اور "مہارانی آف پشاور" نے کلیرج میں دو دن شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے گزارے۔ نئے سال کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں شرکت کی اور گھر لوٹ آئے۔ بعد میں جب ہوٹل کی انتظامیہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو منیجر پر بڑی لے دے ہوئی۔

کلیرج ریسٹورنٹ کی عمارت میں لفٹ، جوتے پالش کرنے والی مشینیں اور دوسری جدید سہولتیں نہیں ہیں۔ سارا کام ملازم اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ٹھہرنے والے اپنے آپ کو چودھویں یا پندرھویں صدی کے شہنشاہ محسوس کرتے ہیں جن کے ایک اشارے پر کئی کئی ملازم خدمت کے لیے حاضر ہو جاتے تھے۔ ہوٹل میں زیادہ سے زیادہ ۲۸۰ مہمان ٹھہر سکتے ہیں، گو اکثر کمرے خالی رہتے ہیں۔ پھر بھی یہاں مہمانوں کی خدمت کے لیے پانچ سو سے زائد ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ہوٹل کا ماحول ایک عام ریسٹورنٹ کے بجائے پرائیویٹ کلب سے زیادہ مشابہ ہے۔ غیر متعلقہ لوگوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ مضمون لکھنے کے لیے میں نے ہوٹل کی انتظامیہ سے کئی مرتبہ درخواست کی تب کہیں جا کر مجھے اجازت ملی اور وہ بھی اس طرح کہ مجلس منتظمہ کا ایک اجلاس بلایا گیا۔ تین دن بحث جاری رہی اور آخر چوتھے روز فیصلہ ہوا کہ اجازت دے دی جائے۔

کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرنے کے لیے ہر شخص کو ۱۵۰ ڈالر روزانہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ صرف کمرے کا کرایہ ہے۔ اس میں کھانے کا خرچ، بیروں کی ٹپ اور دوسرے متفرق اخراجات شامل نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنا کرایہ صرف شاہی خاندان کے افراد، عمائدینِ مملکت یا لکھ پتی اشخاص ہی ادا کر سکتے ہیں۔ تاہم کرایے کی یہ شرح قطعی نہیں ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ اگر ایک بار ہوٹل کے رجسٹر میں آپ کا نام لکھا گیا تو جب بھی آپ ٹھہرنا چاہیں آپ بخوشی ٹھہر سکتے ہیں خواہ آپ مقررہ کرایہ ادا کرنے کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ ہالی وڈ کا مصنّف اور فلمساز ایڈون ناپ بچپن میں اپنی والدہ کے ساتھ اس ہوٹل میں ٹھہرا کرتا تھا۔ پھلے دنوں وہ لندن آیا اور ایک دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا۔ اتفاق سے اسے کلیرج ریسٹورنٹ کا منیجر مل گیا۔

"مسٹر ناپ! آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آخر آپ دوسرے ہوٹل میں کیوں ٹھہرے؟"

"سچّی بات یہ ہے کہ میں ۱۵۰ ڈالر یومیہ ادا نہیں کر سکتا۔"

اور وہ بھی کھانے کے علاوہ ہیں جس کمرے میں ٹھہرا ہوں اس کا یومیہ کرایہ صرف دو ڈالر ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ کلیرج کے مہمان اگر دوسرے ہوٹلوں میں ٹھہرنے لگیں تو یہ کلیرج کی ہتک ہے اور اس کے مہمانوں کی بھی — آپ کا نام ہمارے ہاں مہمانوں کی فہرست میں درج ہے۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ابھی فون کر کے مجلس انتظامیہ کے صدر سے اس مسئلے کا حل دریافت کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر منیجر اٹھا اور فون کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا اور ایڈون ناپ سے مخاطب ہو کر بولا:

"آپ کلیرج تشریف لے چلیے۔ میں آپ کا سامان منگواتا ہوں۔ کرایے کی فکر مت کیجیے۔ جتنا کرایہ آپ یہاں ادا کر رہے ہیں، وہی ہمیں دے دیجیے گا۔"

دوسرے ملکوں سے آنے والے مہمانوں کی پذیرائی کے لیے کلیرج ریسٹورنٹ خاص انتظامات کرتا ہے۔ بندرگاہ پر "خوش آمدید" کہنے کے لیے دو اشخاص موجود رہتے ہیں جو مہمان کو بڑی عزت و تکریم سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جہاز سے ساحل تک پہنچنے کے لیے اعلیٰ درجے کی ایک مخصوص موٹر بوٹ کا بندوبست کیا جاتا ہے گاڑی میں بھی مہمان کے لیے پہلے سے نشستیں محفوظ ہوتی ہیں۔ جونہی معزز مہمان ہوٹل کے دروازے پر پہنچتا ہے دربان ایک بٹن دباتا ہے۔ جس سے منیجر کے کمرے میں لگا ہوا ایک سبز بلب جل اٹھتا ہے۔ منیجر فوراً اپنے سٹاف کے ساتھ باہر آتا ہے تاکہ مہمان کو پورے شاہی مراسم کے ساتھ کمرے تک پہنچائے۔ تشریف آوری کی طرح ہر مہمان کی رخصتی بھی بڑا دلچسپ منظر پیش کرتی ہے متعلقہ کلرک ایک بٹن دبا کر منیجر کو کسی مہمان کے رخصت ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ منیجر اپنے ملازموں کی معیت میں نکلتا ہے اور مہمان کو دروازے تک چھوڑنے جاتا ہے۔

یہاں کے اکثر ملازم عمر رسیدہ ہیں اور دس دس، پندرہ پندرہ سال سے مہمانوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ سب ملازم

وقت کی بساط

کالاکولا

سے مات

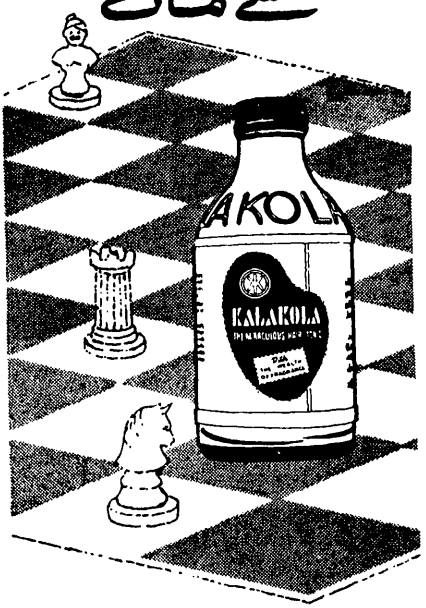

بالوں کو حسین قدرتی رنگ بخشنے والا۔ دماغ کی خشکی اور بے خوابی سے نجات دینے والا

کالاکولا

UTS-1'66 Crescent

بہت سنجیدہ اور باوقار ہیں۔ قدیم وضع کی ٹوپیاں پہنتے ہیں جن پر سُنہری بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔ دبے پاؤں چلتے ہیں اور سر جھکا کے بڑے ادب سے بات کرتے ہیں۔ آپس میں بھی مذاق، کھیل کود یا زور سے بات کرنا منع ہے۔ مزے کی بات یہ کہ یہاں کام کرنے والوں کو بہت معمولی تنخواہیں ملتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہفتہ وار تنخواہ ۴۴ ڈالر ہے۔ حالانکہ دوسرے اچھے ہوٹلوں میں ڈیسک کلرک بھی ۲۵ ڈالر سے ۳۵ ڈالر تک تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ پھر بھی کلیرج ریسٹورنٹ میں کام کرنا لوگ فخر سمجھتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہاں دُنیا کے مشہور و معروف لوگ آکر ٹھہرتے ہیں اور یہاں کا ماحول عجب پراسرار سا ہے۔ ہر ملازم کو ہفتے کے آخری دن جو رقم ملتی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ ٹپ کے طور پر وصول کرتا ہے جو سب ملازم ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ ٹپ کے طور پر دی جانے والی تمام رقوم جمع کر لی جاتی ہیں۔ ہر ہفتے سب ملازم اسے مساوی طور پر آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

کلیرج ریسٹورنٹ اپنے مہمانوں کی خواہش پر ہر چیز مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک بار یمن کے شہزادے نے نصف رات کے وقت تقاضا کیا کہ اُسے فوراً ہی بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت چاہیے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بھیڑ کو اس کا ذاتی ملازم ذبح کرے گا اور وہی اُسے پکائے گا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت ایک بھیڑ منگوائی گئی۔ شہزادے کے باورچی نے اُسے ذبح کر کے پکایا اور صرف آدھ گھنٹے میں بھنا ہوا گوشت شہزادے کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

رُوس کے سابق سربراہ مسٹر خروشیف بھی کلیرج ریسٹورنٹ کے مہمان رہے ہیں۔ صبح کے تین بجے تھے کہ اس نے دیگی کی فرمائش کی۔ اتفاق سے ہوٹل کے باورچی خانے میں اس وقت کوئی ایسی دیگی نہ تھی جو خروشیف کے بتائے ہوئے معیار پر پوری اُتر سکے۔ چنانچہ بازار سے دیگی منگوائی گئی۔ اس دوران میں خروشیف سخت بے چینی کے عالم میں راہداری کے چکر کاٹتا رہا۔ جب دیگی اس کے حضور میں پیش کی گئی تو اس نے اپنے سیکورٹی افسر کو طلب کیا۔ اچھی طرح یہ اطمینان کر

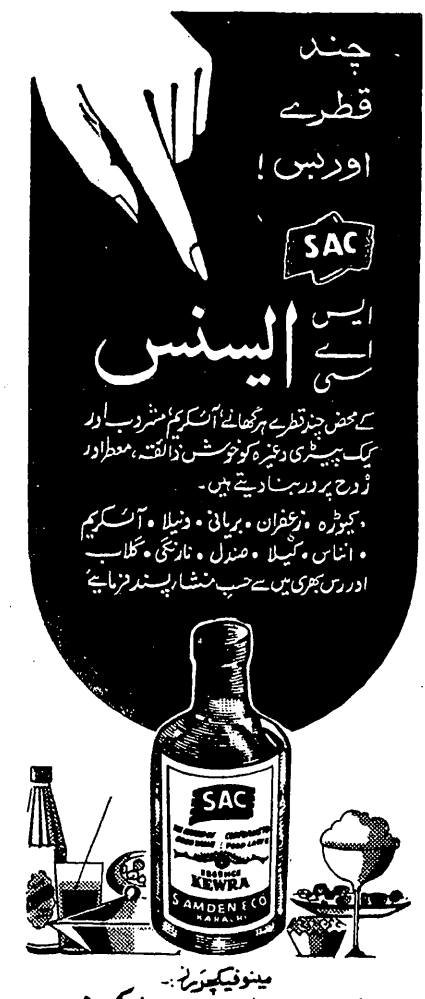

مینوفیکچررز:-

ایس ایمڈن اینڈ کمپنی

پی او بکس ۲۶۸، کراچی۔ فون نمبر:- ۲۳۴۰۳۸

SAC -1/66 Crescent

لینے کے بعد کہ دیگچی صاف حالت میں ہے اور اس میں کوئی چھوٹا مائیکروفون نہیں چھپایا گیا، خروشچیف نے دیگچی لے لی اور کمرے میں چلا گیا۔ میرے بار بار پوچھنے پر بھی ہوٹل کے منیجر نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ خروشچیف نے دیگچی کیوں مانگی تھی۔

"یہ اُن کا ذاتی مسئلہ تھا اور ہم اپنے مہمانوں کے ذاتی افعال کسی کے سامنے بیان نہیں کرتے۔"

جو لوگ پہلے پہل کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرتے ہیں، وہ یہاں کے ماحول سے بہت مرعوب ہوتے ہیں۔ اکثر تو طعام گاہ یا بار روم میں نظریں جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ احساس کہ دُنیا کے بڑے بڑے لوگ دیکھ رہے ہیں، انہیں پریشان کر دیتا ہے۔ بعض مہمانوں کو نا پسندیدہ حرکات کی بنا پر تنبیہہ بھی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر ٹنگ کرابی کو ریسٹورنٹ کی بالائی چھت پر گولف کھیلتے ہوئے دیکھا گیا۔ انتظامیہ نے فوراً اس کے نام نوٹس جاری کر دیا۔ دوسری مرتبہ جب مسٹر ٹنگ نے ہوٹل میں کمرہ لینے کی خواہش ظاہر کی تو اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آرسن ویلز نے ریسٹورنٹ پر ایک دستاویزی فلم تیار کرنے کی اجازت چاہی لیکن انتظامیہ نے سختی سے منع کر دیا۔

کلیرج میں دی جانے والی دعوتیں بہت پُرتکلف ہوتی ہیں حاضرین کی تعداد تین چار سو سے کبھی زائد نہیں ہوتی۔ گزشتہ بیس سالوں میں سب سے بڑی دعوت ۱۹۵۶ء میں دی گئی میزبان خروشچیف اور مارشل بلگانن تھے۔ اس دعوت میں ۱۵۰۰ مہمان شریک ہوئے۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ بار روم، طعام گاہ اور ہال کمرہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا دکھائی دیا۔

کلیرج ریسٹورنٹ کے ملازم بہت وفادار اور محنتی ثابت ہوتے ہیں۔ سالہا سال کام کرنے کی وجہ سے انہیں ریسٹورنٹ سے ایک خاص عقیدت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مسز ایلس برنز کلیرج میں فرش صاف کرتی تھی۔ یہ خاتون لندن کے علاقہ ہر مونڈسی کی میئر منتخب ہو گئی۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد بھی وہ ہر شام بڑی باقاعدگی سے اپنی شان دار رولز رائس گاڑی میں وقتِ مقررہ پر کلیرج ریسٹورنٹ پہنچ جاتی اور دو گھنٹے تک راہداری کے فرش کو جھاڑن سے اچھی طرح صاف کرتی

ہوٹل میں کام کرنے والوں کی خدمت کے لیے بھی چند ملازم رکھے گئے ہیں جو سٹاف کی ذاتی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں، ان کے لیے کھانا پکاتے ہیں، کپڑے استری کرتے ہیں اور جوتے چمکاتے ہیں۔

اس ریسٹورنٹ میں ٹھہرنے والے بیشتر لوگ چونکہ کسی نہ کسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ اخباری نمائندوں اور شوقیہ ملنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے مہمانوں کے آرام کی خاطر ملاقاتیوں کی آمد پر پابندی عائد کر دی ہے۔ صرف وہ لوگ یہاں آ سکتے ہیں جن کے بارے میں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے اشخاص خود سفارش کریں۔ گفتگو کے دوران میں میں نے منیجر سے پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ہاں آنے والوں میں سے کون لوگ زیادہ دلچسپ ثابت ہوتے ہیں؟"

"میں کسی فرد کا نام نہیں لوں گا کیونکہ یہ ہمارے اصُول کے خلاف ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر میرا تاثر یہ ہے کہ امریکی نو دولتیے یہاں آ کر اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے چاروں کے منہ سے بات نہیں نکلتی۔ وہ چیختے چلّاتے ہوٹلوں میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں کے باوقار ماحول اور پُراسرار گمبھیرتا میں وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ ایک امریکی سرمایہ دار نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں محض اس لیے ٹھہرتا ہے کہ اسے خوفزدہ ہونے میں بڑا لطف آتا ہے۔"

ملازموں کو انتظامیہ کی طرف سے خاص ہدایات ہیں کہ وہ ہر حالت میں مہمانوں سے عزت و احترام سے پیش آئیں۔ ایک بار چند معزز مہمان کھانا کھا رہے تھے۔ دسترخوان پر چُنی ہوئی سالم مچھلی بھی تھی۔ ایک صاحب نے مچھلی کا گوشت کھا کر سالم پنجر ایک طرف رکھ دیا۔ عین اسی وقت بیرا پانی لے کر آیا۔ ان صاحب کو دل لگی سُوجھی انہوں نے بیرے کو بلایا اور مچھلی کا پنجر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا، "یہ لو تمہارا انعام۔"

بیرے نے شور بے سے لتھڑا ہوا پنجر اپنی صاف سُتھری قمیص کی جیب میں رکھا اور جُھک کر نہایت احترام سے بولا:

"جناب میں اس عنایت کے لیے آپ کا مشکور ہوں۔"

نئی نئی ایجادیں

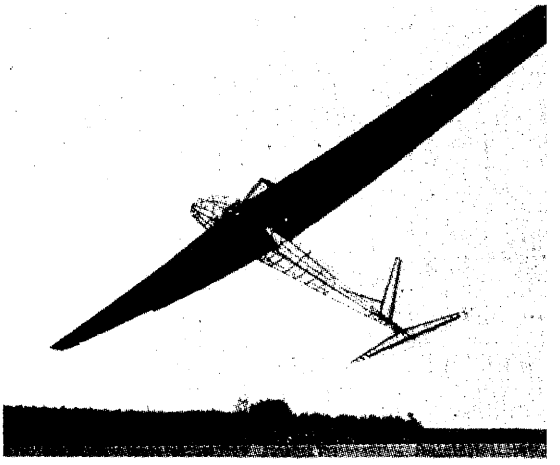

۱۔ ساؤتھمپٹن یونیورسٹی کا ایک سائنس دان ایلن لیزری گزشتہ پانچ سال سے ایسا ہوائی جہاز بنانے کی دُھن میں لگا ہوا تھا جسے انسانی قوّت سے چلایا جا سکے۔ اب خبر آئی ہے کہ وہ اس مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔ دراصل یونیورسٹی نے اس مقصد کے لیے پانچ ہزار پاؤنڈ انعام کا اعلان بھی کر رکھا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ایسا ہوائی جہاز کم از کم ایک میل کی پرواز ضرور کرے گا۔ ایلن لیزری نے جو ہوائی جہاز بنایا ہے، اس کی تصویر دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ جہاز کا ڈھانچہ ہے اور اسے پلاسٹک اور ہلکی لکڑی سے بنایا گیا ہے۔ کینٹ کے آر اے ایف سٹیشن پر جب اس کی پرواز کا اعلان کیا گیا تو بہت کم لوگوں کو اُمید تھی کہ یہ جہاز پرواز کر سکے گا، لیکن جان پرٹ پائلٹ نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے جہاز کو پہلے رَن وے پر سائیکل کی طرح پوری قوّت سے دوڑایا۔ جہاز آہستہ آہستہ زمین سے اوپر اٹھا اور تیس فٹ کی بلندی تک پہنچ گیا۔ ابھی اس نے پچاس گز ہی کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پروں کا توازن بگڑ گیا اور طیارہ ڈگمگاتا ہوا زمین پر آن گرا اور چُور چُور ہو گیا، لیکن پائلٹ اور اس کے مددگاروں کو خراش تک نہ آئی۔ ایلن لیزری انعام تو حاصل نہ کر سکا کیوں کہ ایک میل پرواز کی شرط پوری نہ کی گئی، تاہم اس کا کہنا ہے کہ وہ بہت جلد ایسے ہلکے اور چھوٹے طیارے بنانے میں کامیاب ہو جائے گا جنہیں لوگ سائیکلوں کی طرح آسانی سے خرید کر کسی ایندھن کے بغیر پرواز کا شوق پورا کر لیا کریں گے۔

۲۔ اُردو ڈائجسٹ کے سالنامے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ سمندر کی تہہ میں اُترنا کس قدر جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کے لیے بہت مضبوط فولادی خول بنائے جاتے ہیں، لیکن وہ بھی پانی کا زبردست دباؤ برداشت نہیں کر سکتے اور اکثر و بیشتر پچک جاتے

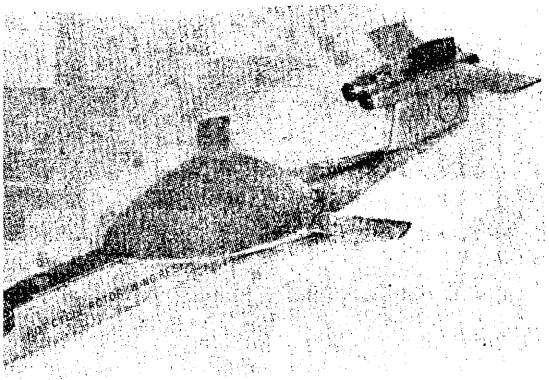

ہیں۔ کیلے فورنیا میں بحریہ کے لیے سائنسی آلات بنانے والی فیکٹری کے ماہرین نے شیشے کا ایک شفاف کرہ تیار کیا ہے جس میں کم از کم دو آدمی بیٹھ کر سمندر کی تہہ میں اُتر سکتے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ یہ شیشہ فولاد سے زیادہ مضبوط ہے اور چھتیس ہزار فٹ کی سمندری گہرائی میں بھی پانی کا دباؤ آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔ اس کرے کی دیواریں صرف ۱۶۵ انچ موٹی ہیں اور وزن ایک ہزار ایک سو پونڈ ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ فولادی خول کی تیاری پر جس قدر لاگت آتی ہے، اسی لاگت میں شیشے کے پانچ ایسے کرے تیار ہو سکتے ہیں۔

۳۔ امریکہ کی ہیوز جنرل کمپنی ایک ایسا طیارہ بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے جو بیک وقت جیٹ طیارہ بھی ہے اور ہیلی کاپٹر بھی۔ اس کا نام ہاٹ سائیکل ہیلی کاپٹر رکھا گیا ہے۔ اس کی پشت پر کچھوے کی شکل و صورت کا پنکھا بھی لگا ہوا ہے اور دُم کے اوپر دو طاقت ور جیٹ انجن بھی کام کرتے ہیں۔ ہیلی کاپٹر کی حیثیت میں یہ طیارہ عموداً اٹھتا ہے اور ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار تک پرواز کر سکتا ہے لیکن کم وقت میں زیادہ فاصلہ طے کرنا ہو تو پنکھا بند کر کے جیٹ انجن سٹارٹ کر دیے جاتے ہیں پھر اس طیارے کی رفتار چار سو میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے یہ فضا میں معلق ہو سکتا ہے۔ زمین پر اُترنے اور پرواز کرنے کے لیے کسی رن وے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ طیارہ امریکی ہوائی فوج کے لیے بنایا گیا ہے۔

۴۔ لندن کی رینک آرگنائزیشن کے ماہرین نے ایسی خردبین بنائی ہے جس کی جسامت صرف ڈھائی انچ اور وزن اٹھارہ اونس ہے۔ یہ خردبین آنکھ سے نظر نہ آنے والی اشیا کو دو ہزار گنا بڑی کر کے دکھا سکتی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ ہر قسم کے درجۂ حرارت میں بخوبی کام کرتی ہے اور اتنی مضبوط ہے کہ اسے پانچ سو فٹ کی بلندی سے زمین پر پھینک دیا جائے تو اس کا فوکس نہیں بگڑے گا اس کے اندر دو ننھی ننھی لیکن انتہائی طاقتور بیٹریاں لگائی گئی ہیں اس خردبین کو کسی بھی ٹیلی وژن کیمرے میں لینس کی جگہ فٹ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ ۳۵ ملی میٹر کے کیمرے میں بھی استعمال ہو سکتی ہے اور نظر نہ آنے والی اشیا کی تصویریں اس کے ذریعے اتاری جا سکتی ہیں۔ اس خردبین کے ذریعے خلا میں جانے والوں کے خون کا بھی معاینہ کیا گیا ہے۔ خردبین میں کیمرہ فٹ کر دیا جاتا ہے اور خلا کے اندر خون کی گردش اور آثار چڑھاؤ کی مسلسل تصویریں اتارتا رہتا ہے۔

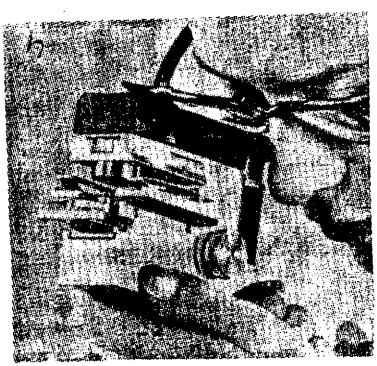

کیا آپ ایک ایسے شخص کے تجربات و مشاہدات پڑھنا چاہتے ہیں جو چالیس سال کی عمر میں ستر سال کا بوڑھا لگتا تھا، لیکن اب وہ ستر سال کی عمر میں چالیس سال کا جوان نظر آتا ہے۔

بُڑھاپا اور اُس کا سدِّباب

دوسرا ایڈیشن

از: حکیم اقبال حسین ایم۔اے

- اِس کتاب میں ایسی ہلکی پھلکی ورزشیں دی گئی ہیں جن پر عمل کرنے والا دورۂ قلب کے حملے سے بڑی حد تک محفوظ ہو جاتا ہے۔
- دوسرے ایڈیشن میں ۱۶ صفحات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس میں صحت کے متعلق بہت سی نئی معلومات ہیں۔
- یہ بچّوں، جوانوں اور بوڑھوں کے لیے یکساں مفید ہے۔
- صرف دو روپے میں صحت پر نہایت ہی مستند اور مفید کتاب حاصل کریں۔

منیجر مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور

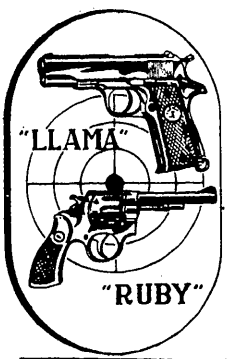

- رائفلیں
- بندوقیں
- کارتوس

(مرمّت کا انتظام)

علی برادرز اینڈ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ

۶۲-ڈی مال — نزد ریگل سینما — لاہور ۳

فون نمبر لاہور ۱۵۵۲۹، راولپنڈی ۶۳۲۷۵، کراچی ۲۳۰۸۸

(۶۸)

ضیا شاہد

تھکن

اور اُس کا علاج

آج کل کندھوں میں دَرد کی شکایت بہت عام ہے تھکن کی شکایت کرنے والے ہر سَو اشخاص میں سے اسّی کندھوں کے درد میں مُبتلا ہوتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو اس دَرد سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بتائیں۔

کُرسی یا پلنگ پر بیٹھ کر دونوں کندھے اُوپر اُٹھائیے۔ اَب کندھوں کو آگے لے جایئے، لیکن گردن اور سر اپنی جگہ پر رہیں۔ کندھے نیچے کر لیجیے۔ انہیں پیچھے لے جایئے۔ آخر میں دونوں کندھے دوبارہ اوپر لے آیئے۔ سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کندھوں کو گول دائرے میں حرکت دیجیے۔ نیچے دی ہوئی شکل سے آپ کو بآسانی اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔

کندھوں کی سائیکل آہستہ آہستہ چلایئے۔ کمر اور بغلوں کے نیچے گدگدی سی محسوس ہوگی، اس گدگدی کا لُطف اُٹھایئے۔

کندھوں اور گردن کے درمیان گوشت کو چھُو کر دیکھیے، نرم نرم گوشت میں آپ کو دَرد سا محسوس ہوگا۔ اس جگہ کو انگلیوں کی پوروں سے آہستہ آہستہ دبایئے، ممکن ہو تو گیلے تولیے سے مساج کیجیے۔

اس دَرد کی ایک بڑی وجہ غلط طریقے سے کام کرنا بھی ہے۔ ایک مثال دیکھیے: نیویارک کے ہوٹل میں کام کرنے والی ایک ویٹرس کے سر، کندھوں اور کمر میں مسلسل دَرد رہنے لگا۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کی نصیحت کی اور اسپرین وغیرہ استعمال کرنے کو کہا۔ وقتی طور پر وہ صحت مند ہو گئی، لیکن دس روز بعد جب وہ پھر کام پر جانے لگی، تو تکلیف دوبارہ شروع ہو گئی۔ دو تین بار ایسا ہوا۔ ڈاکٹر تنگ آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مریضہ کا علاج کیسے کرے۔ آخر اسے ایک تدبیر سُوجھی۔ ایک روز وہ ہوٹل میں گیا جہاں مریضہ

اس مضمون کی پہلی قسط سالنامہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ دُوسری قسط پیش خدمت ہے

کام کرتی تھی اور ہال کمرے میں ایک علیحدہ میز پر بیٹھ گیا۔ دوسرے بہت سے ملازموں کے ساتھ اسے وہ لڑکی بھی دکھائی دی۔ ہوٹل میں بہت بھیڑ تھی اور کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی مالکہ کے خوف سے وہ بھاگ بھاگ کر کام کر رہی تھی۔ جب وہ کچن سے ٹرے لے کر نکلتی، تو اس تیزی کے ساتھ کہ اس کا سر اور گردن آگے کو جھکے ہوئے دکھائی دیتے۔ ڈاکٹر فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ دن بھر اس لڑکی کا جسم غیر ارادی طور پر آگے کو جھکا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شام اسے کندھوں میں درد کا احساس ہوتا۔ اگلے روز جب وہ ہسپتال پہنچی، تو ڈاکٹر نے اسے تکلیف کی اصل وجہ بتائی۔ لڑکی نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ سر جھکا کر چلنے سے پرہیز کرے گی۔ پہلے چند ہفتوں میں اُسے خاصی دشواری پیش آئی، لیکن بالآخر وہ اپنی عادت چھوڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد اسے کبھی کندھوں یا گردن میں درد کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

آپ بھی اپنے روزمرہ کام کاج پر نظر ڈالیے۔ کیا کام کے دوران میں آپ کا جسم صحیح حالت میں ہوتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی گردن یا کندھے آگے کو جھکے رہتے ہوں؟ دفتر میں لوگ اکثر میز پر جھک کر کام کرتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ اس سے گردن کے پٹھے اکڑ جاتے ہیں اور کندھوں میں درد ہونے لگتا ہے۔

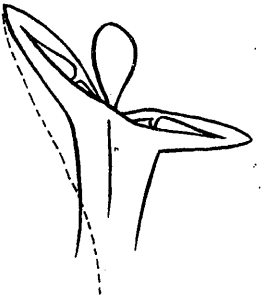

سامنے دی ہوئی شکل دیکھیے اور اس کی مدد سے یہ ورزش کیجیے۔ بایاں ہاتھ اُٹھا کر انگلیاں کندھے پر رکھیے اور بازو زیادہ سے زیادہ اوپر اُٹھائیے۔

اَب دائیں بازو کو لیجیے۔ ہاتھ کندھے پر رکھ کر بازو کو زیادہ سے زیادہ اُوپر اُٹھائیے۔ دن کے وقت کام کے دوران میں بھی یہ عمل کئی مرتبہ دہرائیے۔

کندھوں کے درد کی ایک وجہ تنگ بُنیان بھی ہوتا ہے۔ زیر جامے کے طور پر جتنی چیزیں بھی استعمال کی جائیں، سب کی سب کھُلی ہونی چاہییں تاکہ جسم کے کسی بھی حصے میں اینٹھن پیدا نہ ہو۔

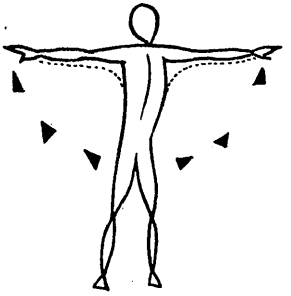

بازوؤں کے دَرد سے بچنے کے لیے

فرش پر اس طرح کھڑے ہو جائیے کہ دونوں پیروں کے درمیان چھ انچ کا فاصلہ ہو۔ دونوں بازو اطراف میں پھیلائیے۔ اَب آہستہ آہستہ انہیں نیچے لائیے۔ یوں محسوس کیجیے جیسے وہ ہوا میں تیر رہے ہیں۔

۲: بازو پھیلا کر دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے قریب لائیے۔ ہتھیلیاں فرش کی طرف ہوں اور ہاتھ کی پُشت اُوپر۔ انگوٹھے نیچے کر لیجیے۔ دونوں بازو اوپر اُٹھائیے، پھر آہستہ آہستہ انہیں نیچے لائیے۔ کندھے کے نچلے حصے میں دَرد سا محسوس ہوگا۔ یہ عمل بار بار دُہرانے سے دَرد غائب ہو جائے گا۔

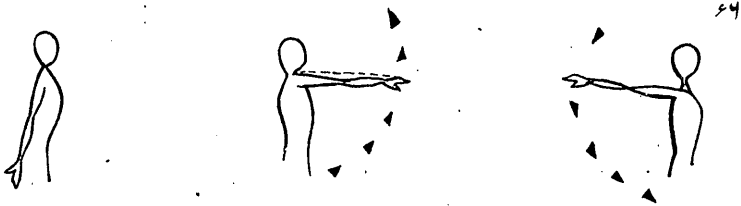

۳ : دونوں بازو کھول کر پُشت سے پیچھے لے جائیے جیسا کہ نیچے دی ہوئی شکل سے ظاہر ہے۔ اَب بازوؤں کو اطراف میں گھما کر سر سے اُوپر لائیے، دوبارہ کمر کے پیچھے اور پھر اُوپر۔

اوپر بتائی ہوئی ورزشیں آپ دن کے وقت کام کے دوران میں بھی کر سکتے ہیں۔

ہاتھوں میں دَرد

ہاتھوں میں نرمی اور لچک جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی آپ آسانی سے کام کاج کر سکیں گے۔ سختی، کھُردراپن اور اینٹھن ہاتھوں کو بے جان اور ناکارہ کر دیتی ہے۔ ان لوگوں کو جو دن بھر اپنے ہاتھوں سے کام کرتے ہیں، اکثر دَرد کی شکایت رہتی ہے۔ اُنگلیاں اکڑ جاتی ہیں اور ہتھیلی میں ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ نیچے دی ہوئی شکل دیکھیے۔ ا اور ب دو ایسے مقام ہیں جہاں عام طور پر دَرد کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ تھکن کی حالت میں ذرا ان جگہوں پر ہاتھ لگا کر دیکھیے۔ آپ کو گوشت میں دَرد محسوس ہوگا۔ ان مقامات کو آہستہ آہستہ دبائیے۔ ہلکا سا مساج بھی فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

۲ : اَنگوٹھے کو دائرے کی شکل میں حرکت دیجیے دفتروں میں اور کام کاج کے دوران میں بھی آپ آسانی سے یہ ورزش کر سکتے ہیں۔ فارغ اوقات میں، بس سٹاپ پر یا راہ چلتے بھی ان افعال کو انجام دیا جا سکتا ہے۔

۳ : باری باری ہر اُنگلی کو بند کیجیے اور کھولیے۔ یہ فعل بار بار دُہرائیے۔

۴ : دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ پر رکھ لیجیے جیسا کہ نیچے کی تصویر سے ظاہر ہے۔ بائیں ہاتھ سے دِھیرے دِھیرے دائیں ہاتھ کو دبائیے۔ اَب بائیں ہاتھ کو دائیں پر رکھ لیجیے اور یہی عمل دُہرائیے۔

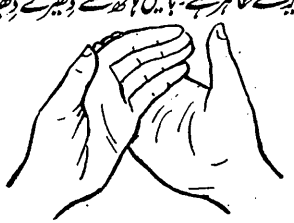

۵ : بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلائیے۔ اَب اس پر دائیں ہتھیلی کو رکھ دیجیے۔ دائیں ہاتھ کے اَنگوٹھے کی مدد سے بائیں ہاتھ

کے انگوٹھے سے لے کر کلائی کے جوڑ تک اُبھرے ہوئے گوشت کو آہستہ آہستہ دبائیے۔ اب یہی عمل دائیں ہاتھ کے ساتھ دہرائیے۔

یہ چھوٹی چھوٹی ورزشیں ہاتھ کے ان عضلات کو متحرک کر دیں گی جو بے جان اور مُردہ ہو چکے تھے۔ ہاتھوں میں لچک اور نرمی پیدا ہو گی اور آپ ہر کام باسانی کر سکیں گے۔

۶: ہاتھ کی پشت میں ہونے والے دَرد کو دُور کرنے کے لیے یہ عمل بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ نیچے دی ہوئی تصویر کے مطابق کھڑے ہو جائیے۔ ایک بازو پھیلائیے اور ہتھیلی اُوپر اُٹھا لیجیے۔ تصویر میں نقطہ دار لکیر ظاہر کر رہی ہے کہ ان مقامات پر آپ کو دَرد محسوس ہو گا۔ بار بار ایسا کرنے سے نہ صرف یہ دَرد دُور ہو جائے گا، بلکہ ہاتھ کی پشت اور بازو کے عضلات میں مضبوطی پیدا ہو گی اور آپ جلد نہیں تھکیں گے۔ ممکن ہے شروع میں آپ اس ورزش سے گھبرا جائیں، لیکن اسے ہرگز نہ چھوڑیئے۔ ہفتے عشرے میں آپ اس کے عادی ہو جائیں گے۔

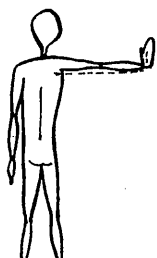

۷: بار بار مٹھی بند کیجیے اور کھولیے۔ یہ بہت سادہ ورزش ہے اور آپ دن رات، اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت کر سکتے ہیں۔ اس سے ہاتھ مضبوط ہوں گے اور زیادہ مقدار میں خون ہاتھوں میں آئے گا۔

بے چارے پاؤں

چند سال ہوئے نیویارک ٹائمز میں ایک مضمون شائع ہوا، عنوان تھا: "پاؤں میں دَرد اور طلاقیں"۔ مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ پاؤں میں دَرد کا روز افزوں طلاقوں سے گہرا تعلق ہے۔ وہ لوگ جن کے پاؤں دَرد کرتے رہتے ہیں، بہت جلد غصّے میں آ جاتے ہیں اور جھنجھلاہٹ، تکلیف اور اعصابی تشنّج کی حالت میں جھٹ طلاق دے ڈالتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ مضمون نگار کی اس تحقیق کو مذاق سمجھیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پاؤں کی تکلیف اور دانت میں دَرد، دو ایسے عارضے ہیں جن میں انسان چڑچڑا اور بدمزاج ہو جاتا ہے۔ پاؤں کی تکلیف سے گھٹنے، گردن اور سر میں بھی دَرد ہونے لگتا ہے۔ اپنے پاؤں کو چھو کر دیکھیے۔ ایڑی سے ذرا اُوپر آپ کو چند رگیں محسوس ہوں گی، یہ رگیں اعصابی نظام میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ پاؤں کی ذرا سی تکلیف ہمارے ذہن پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

کینیڈا میں بچّوں کے ہسپتال کی ایک نرس کو گھٹنے میں شدید دَرد کی شکایت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے کیا، لیکن کوئی خرابی دکھائی نہ دی۔ مالش سے بھی افاقہ نہ ہوا۔ دَرد دُور کرنے کے لیے بے تحاشا گولیاں کھلائی گئیں، لیکن مستقل آرام نہ آیا۔ آخر ڈاکٹروں نے اس کے پیروں کا معائنہ کیا۔ تکلیف کا اصل سبب یہ تھا کہ اس کے ایک پاؤں کی چھت سُوجی ہوئی تھی۔ جسم کے اندر سے گوشت اُوپر اُبھرنے لگا تھا۔ مختلف ورزشوں اور مساج سے بڑھتے ہوئے گوشت کو روک دیا گیا۔ گھٹنے کا دَرد خود بخود

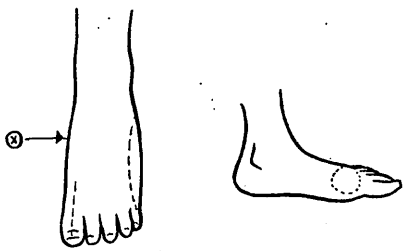

ختم ہوگیا۔ سامنے دی ہوئی تصویر دیکھیے۔ نشان زدہ حصّے ان جگہوں کو ظاہر کرتے ہیں جہاں بالعموم تکلیف پیدا ہوتی ہے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہاتھوں کی طرح پاؤں بھی جسم کا ایک حسّاس جزو ہیں؛ چنانچہ کئی ایسے اشخاص جو قدرتی طور پر ہاتھوں سے محروم ہوتے ہیں، اپنے پیروں سے سارا کام لیتے ہیں۔ ایسے لوگ پاؤں سے لکھتے ہیں، پاؤں سے کھانا پکاتے ہیں، یہاں تک کہ پیرس کی ایک خاتون مصوّر پاؤں سے تصویریں بناتی ہے۔ اگر ہم اپنے پاؤں کی حفاظت کریں، تو بہت سے ذہنی اور جسمانی امراض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

دَرد کرتے ہوئے پیروں کا سب سے بہتر علاج غسل ہے۔ پیروں کے غسل کا طریقہ بہت سادہ اور آسان ہے۔ سردیوں میں نیم گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں دونوں پاؤں ڈال دیجیے۔ پانی آپ کے گھٹنوں تک آنا چاہیے۔ اگر ممکن ہو، تو ہر دو منٹ بعد پانی بدلتے رہیے۔ ایک چھوٹا تولیہ لیجیے اور پانی کے اندر ہاتھ ڈال کر باری باری ہر پاؤں کی چھت، تلوے اور ایڑی پر مساج کیجیے۔ دس منٹ تک پاؤں پانی میں رکھیے، پھر نکال کر صاف تولیے سے خشک کر لیجیے۔ ٹب میں ڈیٹول یا کوئی دوسری جراثیم کُش دوا ڈال لیں، تو زیادہ بہتر ہے۔

اگر آپ دن بھر جرابیں اور بوٹ پہنے رہتے ہیں، تو رات کے وقت انگلیوں کے درمیان گیلے تولیے سے مساج کیجیے۔ کام سے واپسی پر کم از کم پانچ منٹ چھوٹے ٹب یا تسلے میں پاؤں ضرور ڈبوئیے۔ اس سے طبیعت میں فرحت پیدا ہوگی اور پیروں کی بہت سی تکلیفیں دُور ہو جائیں گی۔

اگر پاؤں گرم ہوں، تو ٹھنڈے پانی میں ڈبونے سے پیشتر انہیں ذرا ہوا لگنے دیں۔ گرم گرم پیروں کو دفعتہً ٹھنڈے پانی میں ڈبونا مناسب نہیں، اس سے بھی تکلیف پیدا ہونے کا امکان ہے۔ پاؤں صاف حالت میں رکھیے اور ہر روز کم از کم دو منٹ کسی نرم برش سے ان پر مساج کیجیے۔

تنگ جُوتے کے نقصانات کا ہم پچھلے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں ہمیں صرف خواتین کی اونچی ایڑی والی جُوتی کا تذکرہ کرنا ہے۔ خواتین اونچی ایڑی والی جُوتی کیوں پہنتی ہیں؛ صرف اس لیے کہ ان کا قد ذرا اُونچا نظر آئے۔ چھوٹے قد کی خواتین تو گھر میں بھی اونچی ایڑی استعمال کرتی ہیں۔ سرو قد بننے کے شوق میں وہ یہ نہیں سوچتیں کہ اُونچی ایڑی پاؤں کے لیے کس قدر تکلیف دہ ہے۔ امریکہ میں اعداد و شمار کے محکمے نے اندازہ لگایا ہے کہ خواتین مَردوں کی نسبت تین گنا زیادہ پاؤں کی تکلیف میں مُبتلا ہوتی ہیں۔ اور اس کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ اُونچی ایڑی والی جوتی پہنتی ہیں۔ اُونچی ایڑی سے وزن سارے پاؤں کے بجائے چند مخصوص حصّوں پر پڑتا ہے۔ نتیجۃً نہ صرف ٹانگیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، بلکہ ذہن بھی بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔ اعصابی تشنج اور جذباتی ہیجان کے بہت سے امراض صرف اُونچی ایڑی کی پیداوار ہیں۔ تھکن دُور کرنے کے لیے پاؤں کے تلوے میں گدگدی بھی بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

صحیح طریقے سے کھڑا ہونا سیکھیے۔ اگلے صفحے پر دی ہوئی تصویر دیکھیے۔ نقطہ دار لکیر جسم کے بوجھ کو ظاہر کر رہی ہے۔ دائیں طرف کی دونوں حالتوں میں جسم کا توازن درست نہیں ہے اور بوجھ غلط جگہ پر پڑ رہا ہے؛ البتہ بائیں طرف کی شکل میں بوجھ

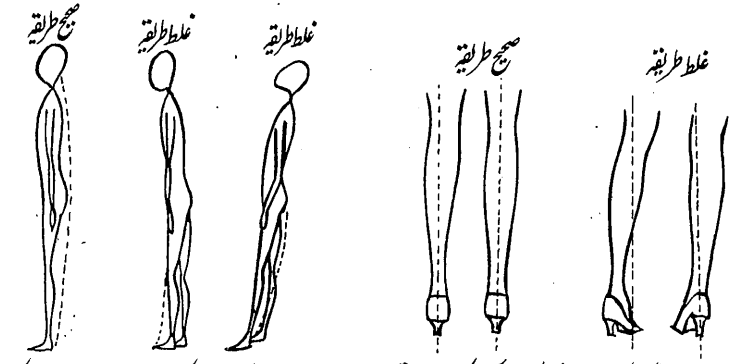

صحیح مقام پر ہے۔ بعض لوگوں کو زمین پر پاؤں ٹیڑھے رکھنے کی عادت ہوتی ہے۔ یہ عادت بھی جسم کے توازن کو بگاڑ دیتی ہے اور پاؤں کے بعض حصّے درد کرنے لگتے ہیں۔ چلتے وقت پاؤں سیدھا رکھیے، ورنہ آپ جلد تھک جائیں گے۔ اُوپر کی تصویر سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ پاؤں کو غلط انداز میں فرش پر رکھنے سے وزن کہاں پڑتا ہے۔ نقطے دار لکیر جسم کے وزن کو ظاہر کر رہی ہے۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے جسم کا اچھی طرح جائزہ لیجیے۔ کیا آپ کا جسمانی توازن درست ہے؟ کہیں آپ کے کندھے آگے کو جھکے ہوئے تو نہیں، آپ کی ٹانگیں سیدھی ہیں اور گھٹنے اپنے صحیح مقام پر ہیں۔ اگر جسم کا کوئی حصّہ کسی طرف کو جھکا ہوا یا اندر دھنسا ہوا دکھائی دے، تو فوراً اس کی طرف توجہ دیجیے۔ مناسب ورزشوں اور مساج سے لٹکا ہوا گوشت غائب ہو سکتا ہے۔

ٹانگوں کا درد دُور کرنے کے لیے

بستر یا کاؤچ پر لیٹ جائیے، آنکھیں بند کر لیجیے تاکہ بیرونی دُنیا سے آپ کا رشتہ منقطع ہو جائے اور یکسُوئی سے ایک ٹانگ اُوپر اُٹھائیے۔ ٹانگ کا بوجھ اس جگہ پر پڑنا چاہیے جس جگہ تصویر ۱ میں دکھایا گیا ہے۔ تصویر ۲ میں نقطے دار لکیر کو دیکھیے۔ یہ ٹانگ اُٹھانے کا غلط طریقہ ہے جس سے آپ مزید تھک جائیں گے۔

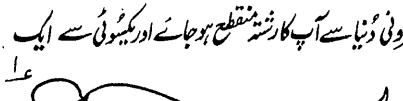

ایڑی کو آگے بڑھائیے۔ بالکل اس طرح جیسے آپ کسی چیز کو دھکیل رہے ہیں۔ یہ فعل گھٹنے سے پاؤں کی ایڑی تک تمام رگوں کو زندگی بخشے گا۔ عضلات میں ایک سنسنی سی محسوس ہو گی۔ اس سنسنی سے لُطف اٹھائیے۔ اب یہی عمل دوسری ٹانگ پر دہرائیے۔ گھٹنے سے لے کر قدموں تک ٹانگ کو ایک دائرے میں گھمائیے، لیکن گھٹنا اپنی جگہ پر قائم رہے۔ دائیں طرف دی ہوئی تصویر دیکھیے۔

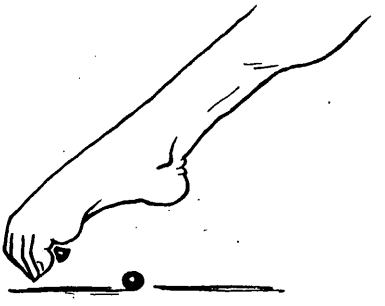

فرش پر کوئی گول پتھر رکھ دیجیے۔ اب پاؤں کی انگلیوں

اور تلوے کی درمیانی جگہ سے اس پتھر یا بجری کو اُٹھانے کی کوشش کیجیے۔

دن میں کئی مرتبہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے انگوٹھے اور انگلیوں کے وزن پر کھڑے رہیے۔ اس دوران میں ایڑی اُوپر اُٹھی ہونی چاہیے۔

دونوں بازو پھیلا دیجیے اور پیروں کے انگوٹھوں اور اُنگلیوں پر کھڑے ہو جائیے۔ ایڑی زمین سے ملا دیجیے، ایڑی اٹھائیے۔ پھر زمین پر رکھ دیجیے۔ یہ عمل بار بار دہرائیے۔

رانوں میں دَرد کی شکایت بھی عام ہے۔ اس دَرد کو دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے کسی نرم بُرش یا صاف سُتھرے خشک تولیے سے رانوں کا مساج کیجیے۔ جب آپ محسوس کریں کہ دَورۂ خون خوب تیز ہو گیا ہے، تو کسی کُرسی پر بیٹھ جائیے۔ دونوں پیروں کے درمیان کم از کم چھ انچ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ باری باری ٹانگوں کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیجیے تاکہ رانوں میں لرزش پیدا ہو۔ کام کے دوران میں ٹانگیں پھیلانے کا موقع مل سکے، تو اس سے فائدہ اُٹھائیے۔

بار بار پاؤں کی انگلیاں کھولیے اور بند کیجیے۔

کمر کی تھکن دُور کرنے کے لیے باری باری کندھے اُوپر اُٹھائیے اور گرائیے۔ اس عمل سے کمر میں سنسنی سی محسوس ہو گی۔ دن کے وقت کام کے دوران میں بھی یہ لُطف حاصل کیجیے۔ پہلے کندھوں کو باری باری اُٹھائیے، پھر دونوں کندھے ایک ساتھ اُوپر اٹھائیے اور گرا دیجیے۔

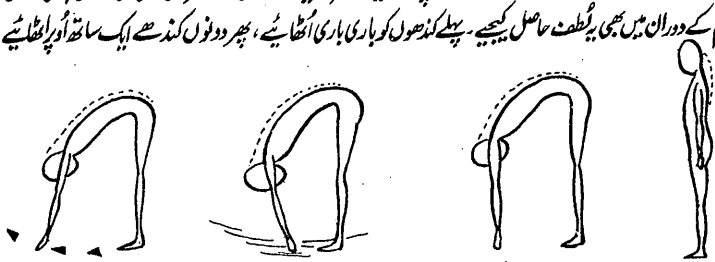

اطمینان سے کھڑے ہو جائیے، پیروں کے درمیان چھ انچ کا فاصلہ رکھیے۔ اب تصویر کے مطابق کمر کے بل آگے کو جُھک جائیے اور دونوں ہاتھ زمین کے قریب لے جائیے۔ پھر آہستہ آہستہ سیدھے ہو جائیے۔ یہ ورزش کمر کے عضلات کو مضبوط کرتی ہے۔

کرسی پر بیٹھ کر کمر اور کندھوں کو دائیں بائیں ہلائیے۔ اس عمل کے دوران میں آپ کے کُولھے اور رانیں ایک ہی جگہ پر ہونی چاہییں۔

پیٹ کی بہت سی تکلیفیں دُور کرنے کا بہترین طریقہ اچھی طرح سانس لینا ہے۔ اچھی طرح سانس لینے سے کیا مراد ہے۔ ہم مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سخت غصّے کی حالت میں اپنے تنفس کا مشاہدہ کیجیے۔ اب انتہائی افسوس، مایوسی اور بد دلی کے عالم میں اپنے سانس پر غور کیجیے۔ دونوں حالتوں میں آپ کو ایک نمایاں فرق محسوس ہو گا۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ جسم و ذہن کے متعدد امراض محض غلط طریقے سے سانس لینے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ سانس لینا ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ہم کھائے پیے بغیر خاصی دیر تک زندہ رہ سکتے ہیں، لیکن سانس لیے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ ذرا انصاف کی نظر سے دیکھیے۔ ہم لذیذ اور عمدہ کھانوں کے کس قدر شائق ہیں، لیکن عمدگی سے سانس لینے کا خیال کبھی ہمارے ذہن میں نہیں آتا، حالانکہ اچھا سانس جسم کے لیے لذیذ کھانے سے کہیں زیادہ مفید ہے۔

ہر روز صبح سویرے کھلی ہوا میں کھڑے ہو کر خوب گہرے سانس لیجیے۔

شام کے وقت کام سے واپسی پر بستر میں لیٹ جائیے، تمام خیالوں کو ذہن سے جھٹک دیجیے اور آنکھیں بند کر لیجیے۔ شروع میں آپ کو محسوس ہوگا کہ سانس تیز تیز چل رہا ہے، لیکن آہستہ آہستہ سانس متوازن اور پُرسکون ہوتا چلا جائے گا۔ دس منٹ تک اسی حالت میں لیٹنا نظامِ تنفس کے علاوہ معدے کے لیے بھی بہت مفید ہے۔

ہمیشہ ناک سے سانس لیجیے۔

غصّے، جوش، ناراضگی اور افسردگی سے بھی نظامِ تنفس پر اثر پڑتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، خوش مزاج رہنے کی کوشش کیجیے۔

اُوپر ہم نے سر سے پاؤں تک جسم کی تھکن دُور کرنے کے لیے ورزشیں بیان کی ہیں۔ ان ورزشوں کو آزمائیے۔ ایک بات کا خاص خیال رکھیے۔ ہم نے ورزشوں کے لیے وقت کا تعین جان بُوجھ کر نہیں کیا۔ ہر ورزش کے لیے جسمانی آرام اور آسائش کے مطابق خود وقت مقرر کیجیے۔

کام کے دوران میں

اب ہم آپ کو چند ایسے طریقے بتائیں گے جن کی مدد سے آپ کام کے دوران میں تر و تازہ رہ سکیں:

۱: مسلسل کام نہ کیجیے۔ اگر آپ کُل آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں، تو کم از کم چار مختصر سے وقفے مقرر کر لیجیے۔ مثال کے طور پر ہر دو گھنٹے بعد تین سے پانچ منٹ تک آرام کیجیے۔ یہ مشورہ ان حضرات کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگا جو دفتروں میں حساب کتاب سے متعلق کام کرتے ہیں۔ مسلسل کام کرنے سے انسان بہت جلد تھک جاتا ہے۔ نیز کارکردگی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ایک مثال سے آپ ہمارا مطلب بخوبی سمجھ سکیں گے۔

اسلم ایک دفتر میں کلرک ہے۔ دفتر کے اوقات صبح ۹ بجے سے شام چار بجے تک ہیں۔ ۹ بجے سے گیارہ بجے تک، تین گھنٹے میں وہ جتنا کام کرتا ہے، اتنا گیارہ سے چار بجے تک، پانچ گھنٹے میں نہیں کر سکتا ——— وجہ ظاہر ہے، صبح وہ تازہ دم ہوتا ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ تھکتا چلا جاتا ہے اور استعداد میں بتدریج کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اُوپر دیے ہوئے مشورے پر عمل کرے، تو بہت حد تک یہ شکایت دُور ہو سکتی ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد وہ اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرے گا۔

۲: نیچے دیا ہوا خاکہ دیکھیے، یہ بڑا دلچسپ تجربہ ہے۔

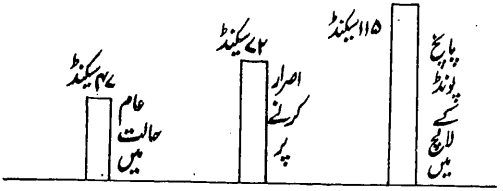

ایک شخص کو تار سے لٹکنے کے لیے کہا گیا ——— ۴۷ سیکنڈ بعد اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے تار کو چھوڑنا چاہا، لیکن اُسے سختی سے منع کیا گیا۔ بہت اصرار کرنے پر اس نے تار نہ چھوڑی اور ۷۲ سیکنڈ تک ہوا میں معلق رہا۔ ۷۲ سیکنڈ بعد وہ تھکن سے چُور ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ تار سے چُھوٹ کر فرش پر آگرے کہ تجربہ کرنے والے نے ایک نیا حربہ آزمایا۔

"مسٹر، اگر تم کچھ دیر اور تار سے لٹکے رہو، تو تمہیں پانچ ڈالر انعام دیے جائیں گے۔"
نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ وہ شخص ۱۱۵ سیکنڈ تک دونوں ہاتھوں سے تار کو پکڑے ہوا میں لٹکتا رہا۔

مندرجہ بالا تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر خشک سے خشک کام میں بھی دلچسپی کا عنصر پیدا کر دیا جائے، تو کام آسان اور خوشگوار ہو جاتا ہے۔ آپ بھی اپنے آپ کو آزمائیے، اپنے کام میں دلچسپی لیجیے۔ کام صرف اس لیے نہ کیجیے کہ یہ آپ کے سر پر آن پڑا ہے، بلکہ اس خیال سے کیجیے کہ ایک ترقی پذیر معاشرے کے فعّال کارکن کی حیثیت سے آپ پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ آپ روزمرّہ کام سے ملک اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں، اپنا مستقبل بہتر بنا رہے ہیں اور آپ کو اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع مل رہا ہے۔ اگر آپ اپنے کام میں دلچسپی لیتے ہیں، تو آپ جلد نہیں تھکیں گے۔

۳ : اُوپر ہم نے سر سے پاؤں تک ورزشوں کا جو کورس بتایا ہے، اس میں سے بہت سی ورزشیں ایسی ہیں جنہیں آپ کام کے دوران میں بھی کر سکتے ہیں۔ خصوصاً گردن، ہاتھوں، آنکھوں اور کمر کی ورزشیں ضرور کیجیے۔ ان سے جسم میں تازگی پیدا ہو گی اور دورانِ خون تیز ہو جائے گا۔ یہ ورزشیں بہت ہلکی پھلکی ہیں۔ آپ بڑی آسانی سے انہیں پانچ سات منٹ میں انجام دے سکتے ہیں۔

۴ : کیا آپ دوپہر کا کھانا دفتر میں یا کام کے دوران میں کھاتے ہیں؟ جو لوگ دفتر میں کھانے کے عادی ہیں، وہ محسوس کریں گے کہ (موسمِ گرما میں خصوصاً) کھانے کے بعد کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ کھانے کی غنودگی سے آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور کام سے جی اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ کھانا کام سے فارغ ہو کر کھایا جائے، لیکن اگر کام کے اوقات میں کھانا ضروری ہو، تو حسبِ ذیل باتوں کا خیال رکھیے :

گرمیوں میں دوپہر کا کھانا پیٹ بھر کر نہ کھائیے، کوئی ہلکی سی زود ہضم چیز کھا لیجیے۔ صبح شام کے کھانوں میں دوپہر کے کھانے کی کمی پوری کی جا سکتی ہے۔ سردیوں اور گرمیوں میں کھانے کے بعد کم از کم آدھ گھنٹہ تک آرام کیجیے۔ کھانے کے فوراً بعد جسم کا بیشتر خون معدے کا رُخ کرتا ہے۔ اگر اس دوران میں آپ کام شروع کر دیں (خواہ آپ کے کام کی نوعیت دماغی ہو یا جسمانی) تو جسم اور دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کارکردگی کم ہو جاتی ہے اور معدہ خراب ہو جاتا ہے۔

۵ : ممکن ہو، تو کام کے دوران میں فرحت بخش مشروب، رس، جُوس وغیرہ پیتے رہیے۔ بعض لوگ آٹھ گھنٹے تک کچھ کھائے پیے بغیر کام کرتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

۶ : پچھلے دنوں ایک بہت بڑے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب دفتر میں فائل کھولے بڑے مزے سے گپیں ہانک رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں اکثر لوگ اسی طرح کرتے ہیں۔ ایک آدھ رجسٹر سامنے رکھا اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ کارگزاری متعیّن نہیں ہے، اس لیے کوئی ایمانداری سے کام نہیں کرتا۔ سب لوگ چھٹی ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ اس "کام چوری" کے باوجود تقریباً ہر شخص نے تھکن کی شکایت کی ——— وجہ صاف ظاہر ہے ——— بے کاری سب سے زیادہ تھکن پیدا کرتی ہے، یقین نہ آئے تو آزما لیجیے۔ محنت اور دیانت سے اپنا کام کیجیے۔ کام میں لگن اور دلچسپی آپ کو تھکنے نہیں دے گی۔ اس کے برعکس جتنا آپ کام سے بچیں گے اتنا ہی تھکن میں مُبتلا ہوں گے۔ ایک شخص جو صبح میز پر آ کر بیٹھتا ہے اور شام کو اپنے فرائض ادا کیے بغیر اُٹھتا ہے، کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا۔ کام بہر حال اُسے کرنا ہے۔ ذہن پر تفکّرات کا بوجھ، افسروں کا ڈر، پکڑے جانے کا خوف اور روز بروز زیادہ مقدار میں جمع ہوتا ہوا کام اسے پریشان کر دیتا ہے۔ پریشانی اور ضمیر پر بوجھ اس کے ذہن اور جسم پر بُرا اثر ڈالتے ہیں، وہ ہر وقت تھکن اور جسم کے ٹوٹنے کی شکایت کرتا ہے۔

حالانکہ دن بھر بے کار رہتا ہے۔ آپ محنت سے کام کرتے ہیں، آپ کا ضمیر مطمئن ہے اور آپ کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ مستقل تھکن میں مبتلا ہوں۔

۷ : اپنے کام کرنے کے انداز پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

مثال کے طور پر اگر آپ میز پر بیٹھ کر کام کریں، تو یہ دیکھ لیجیے کہ میز کی اونچائی مناسب ہے یا نہیں۔ روشنی، تازہ ہوا اور سکون بھی ضروری ہے۔ اگر آپ کی میز نیچی ہے یا کرسی اونچی ہے، تو لامحالہ آپ جھک کر کام کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آپ کمر کے درد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ گردن میں تناؤ پیدا ہوگا اور شانوں میں درد کی شکایت پیدا ہوگی۔ میز اور کرسی مناسب فاصلے پر رکھیے۔ کمر کو قوس نہ بننے دیجیے۔ جہاں تک ممکن ہو، میز پر غیر ضروری کاغذات اور فائلیں جمع نہ کیجیے۔ ضروری نہیں کہ آپ کسی دفتر میں ملازم ہوں۔ بہرحال ان طریقوں سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کام کرنے کے بنیادی اصول کیا ہیں۔

۸ : اپنی کارگزاری متعین کیجیے۔ یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ آپ کو ہر ماہ کتنا کام کرنا ہے، اسی حساب سے اپنے لیے روزانہ کام مقرر کر لیجیے۔ ہم میں بہت سے لوگ جان بوجھ کر بے کار رہتے ہیں اور جب کام مکمل کرنے کی ضرورت محسوس ہو، تو دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا کام کرنا، ایک ہی دن بہت سا کام نپٹانے سے کہیں بہتر ہے۔

۹ : اکثر آپ کو گاڑی میں ایسے لوگ دکھائی دیں گے جو وقت سے ایک آدھ منٹ پہلے سٹیشن پر پہنچتے ہیں، جلدی میں ٹکٹ خریدا جاتا ہے، ریزگاری واپس لیتے وقت گننے کا کسے ہوش ہوتا ہے۔ بھاگم بھاگ سٹیشن پر پہنچتے ہیں۔ اگر بیوی بچے بھی ساتھ ہوں، تو علیحدہ مصیبت ہوتی ہے۔ برکھلاہٹ میں سامان میں سے ایک آدھ چیز ضرور گم ہو جاتی ہے۔ بعض چیزوں کے بارے میں یاد آتا ہے کہ گھر سے لانا بھول گئے۔ ڈبے تلاش کرتے پھر رہے ہیں، لیکن جگہ نہیں ملتی۔ ادھر گاڑی چلنے کی سیٹی بج چکی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک ڈبے میں داخل ہوتے ہیں، قلی چلتی گاڑی میں سامان پھینک رہا ہے، کوئی نہ کوئی چیز ضرور ٹوٹ جاتی ہے۔ جب گاڑی ریلوے سٹیشن چھوڑ دیتی ہے، تو صاحب کو خیال آتا ہے کہ ایک سوٹ کیس غائب ہے، خدا جانے ٹیکسی میں رہ گیا یا قلی اڑا کر لے گیا۔ دوبارہ سامان کی دیکھ بھال شروع ہوتی ہے۔ ڈبے میں موجود باقی لوگوں کی اچھی خاصی شامت آجاتی ہے۔

ہم میں سے کوئی بھی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ساتھ دوسروں کو مشکل میں مبتلا کر دے، لیکن کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ خود ہم بھی زندگی میں کئی موقعوں پر جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ جلد بازی انسان کو بہت جلد تھکن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ہر کام وقت پر کر کے آپ بہت سی الجھنوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ بالفرض آپ کو سات بجے کسی پارٹی پر جانا ہے۔ اندازاً دس منٹ کا راستہ ہے۔ ظاہر ہے آپ سات بجنے میں دس منٹ پر گھر سے روانہ ہوں گے ——— یہ طریقہ نامناسب ہے۔ ہو سکتا ہے راستے میں آپ کی گاڑی یا بس خراب ہو جائے، ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے راستہ نہ ملے یا کوئی دوسری مصیبت آن پڑے ——— پروگرام بناتے وقت احتیاطاً پانچ سے دس منٹ تک فاضل وقت شامل کر لیجیے تاکہ کسی ہنگامی حالت کا سامنا کیا جا سکے۔ وقت سے پہلے منزل پر پہنچنا، دیر سے پہنچنے سے کہیں بہتر ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں جلد بازی اور ہا رہا ری سے احتراز کیجیے۔ سکون، اطمینان اور ٹھنڈے دل سے ہر کام کیجیے۔

۱۰ : یکسوئی بھی کام کے لیے بہت ضروری ہے۔ کبھی آپ نے ریڈیو سٹیشن پر سوئی کو دو سٹیشنوں کے درمیان کر کے دیکھا ہے۔ ایک سٹیشن سے کوئی گیت سنا رہا ہے اور دوسرے سے خبریں نشر ہو رہی ہیں۔ خبریں اور گیت ایک ساتھ سنائی دیتے ہیں، تو کچھ پلے

نہیں پڑتا۔ بالکل یہی حالت ہمارے ذہن کی ہے۔ اگر آپ کام میں بھی مصروف ہیں اور دل ہی دل میں شام کو تفریح کا پروگرام بھی بنا رہے ہیں تو بہت جلد تھک جائیں گے۔ انسانی ذہن ایک وقت بہت سے مسائل پر آسانی سے غور نہیں کر سکتا۔ روزمرہ زندگی میں بھی ہم یکسوئی کا بہت کم خیال رکھتے ہیں۔ عام طور پر لوگ کھانے کے دوران میں اخبار پڑھتے ہیں، مطالعے کے ساتھ ساتھ ریڈیو سنتے ہیں اور کام کے دوران میں اُونگھتے ہیں۔ ایک وقت میں صرف ایک کام کیجیے۔ کام کے وقت صرف کام کیجیے اور تفریح کے وقت کام کے بارے میں سوچ کر ذہن کو پراگندہ نہ کیجیے۔

۱۱: انسان فطرتاً نئی چیزوں کو پسند کرتا ہے، ایک جیسی چیزیں، ایک جیسا ماحول آدمی کو تھکا دیتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو یکسانیت سے گریز کیجیے۔ اپنے ماحول میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں کرتے رہیے تاکہ یکساں مناظر آنکھوں کو نہ تھکا دیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد دفتروں میں، دکانوں پر اور گھروں کے اندر فرنیچر کو نئی ترتیب دیجیے، میز کا رُخ تبدیل کر لیجیے۔ گھروں میں پردے اور دیواروں کا رنگ بدلتے رہیے۔ ایک کمرے کی چیزیں دوسرے میں اور دوسرے کی پہلے میں لے جانے سے بھی آنکھوں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ ماحول میں چھوٹی چھوٹی خوشگوار تبدیلیاں آپ کو تازہ دم رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

۱۲: اگر کام طویل اور خشک ہے، تو اسے چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر لیجیے۔ باری باری ہر ایک حصّے کو انجام دینے سے آپ کی طبیعت پر زیادہ بار نہیں پڑے گا۔ مثال کے طور پر آپ کو سو نام لکھنے ہیں، تو پچیس پچیس کے چار حصّے بنا لیجیے۔ ہر حصّہ ختم کرنے کے بعد دو چار منٹ بعد آرام کر لیجیے۔

۱۳: ہر صبح پورے دن کے لیے ایک پروگرام وضع کر لیجیے۔ پروگرام کو زیادہ سے زیادہ سہل اور قابلِ عمل رکھیے۔ وقت کا تعیّن کرتے وقت ہنگامی ضرورتوں کے لیے تھوڑا سا وقت علیحدہ نکال لیجیے۔ بھاگم بھاگ، پریشانی اور گھبراہٹ سے گریز کیجیے۔

۱۴: کام کے دوران میں ساتھیوں سے خوشگوار تعلقات رکھیے تاکہ وقفے میں آپ ان سے ہنس بول سکیں۔ کینہ پروری، بُغض اور حسد وغیرہ سے ذہن کو صاف رکھیے۔ یہ چیزیں انسانی ذہن میں پیچیدگیاں پیدا کرتی ہیں۔ اگر کوئی آپ سے زیادتی بھی کرے، تو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی بجائے صبر و تحمّل سے کام لیجیے۔ اگر آپ سچّے ہیں، تو ایک نہ ایک دن آپ کی سچّائی دوسروں کو متاثر کرے گی۔ ذہنی کھچاؤ اور خلجان آپ کو مستقل تھکن میں مبتلا کر سکتا ہے۔

۱۵: کام کرتے کرتے تھکن محسوس ہو، تو سر کو کرسی کی پشت پر لے جائیے اور دونوں بازو کھول کر بھرپور انگڑائی لیجیے۔ کہنیوں تک بازو، چہرہ اور گھٹنوں تک ٹانگیں دھو لیجیے۔ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی اور سردیوں میں نیم گرم یا تازہ پانی استعمال کیجیے۔ گردن پر ہاتھ پھیرنا بھی مفید ہو سکتا ہے۔

۱۶: دلکش مناظر، عمدہ تصویریں اور اچھی خوشبوئیں بھی انسانی ذہن کو تر و تازہ کر سکتی ہے۔ خوشبو کا استعمال آج کل بہت کم ہوتا جا رہا ہے۔ اپنی پسندیدہ خوشبو کا استعمال کیجیے اور کام کے دوران میں تھکن محسوس ہوتے ہی خوشبو سے مدد لیجیے۔ خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔

ذہنی تھکن کیا بلا ہوتی ہے اور اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے، بچّوں کو تازہ دم کیونکر رکھا جائے، چھٹی کا دن گزارنے کا بہترین طریقہ کیا ہے اور گھریلو عورتیں کام کاج کے باوجود اپنی صحت اور تازگی کو کیسے برقرار رکھ سکتی ہیں۔ ان سوالوں کے جواب ہم اگلے باب میں دیں گے۔

(باقی آئندہ)

الفاظ کے پیرہن میں

فصل کے معنی ہیں جدا کرنا، جدا ہونا، جیسے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

(تو اکٹھا کرنے اور جوڑنے کو آیا ہے نہ کہ آپس میں جدائی ڈالنے کے لیے) اس کے کئی اور معنی بھی ہیں جن سب میں اصل کی مناسبت کسی نہ کسی رنگ میں پائی جاتی ہے مثلاً: سال کے چار موسموں میں سے ایک موسم کو کہتے ہیں؛ چنانچہ فصلِ گل، پھولوں کے کھلنے کے موسم یعنی بہار کو کہتے ہیں (۲) کتاب یا کلام کے ایک حصّے کو فصل کہتے ہیں (۳) دو چیزوں کے درمیان پردے کو فصل کہتے ہیں (۴) فصل کے معنی ہیں بچّے کا دودھ چھڑانا۔ (۵) فصل کے معنی ہیں سچّی اور فیصلہ کن بات (قرآن مجید میں ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ یہ بلاشبہ سچّی اور فیصلہ کن بات ہے) (۶) فصل کے معنی کاٹنا بھی ہیں فصیل بھی اسی لفظ فصل سے ہے جس کے معنی شہر کی حفاظت کے لیے بیرونی خطرے اور بستی کے درمیان پردہ یعنی شہر پناہ۔ لفظ فیصل کی اصل بھی یہی ہے جس کے معنی ہیں حق و باطل کو جدا کرنے والا۔ قولِ فیصل وہ بات جو حق و باطل کو الگ الگ کرکے جھگڑا چکا دے۔

لفظ فیض اور فیضان ہم اکثر استعمال کرتے ہیں جیسے ؎

دیکھیے پاتے ہیں کیا فیض بتوں سے غالبؔ
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

لیکن اس کے اصل معنی ہیں (۱) پانی بہنا (۲) پانی گرانا، مثلاً قرآن مجید میں ہے: اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا الْمَاءَ (ہم پر پانی گراؤ)۔

(۳) پانی کا نہر میں اتنا ہو جانا کہ کناروں سے بہنے لگے۔ مجازاً اس کے معنی ہو گئے: بہت بخشش اور بہت زیادہ فائدہ۔ فیّاض اسی سے مبالغے کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: بڑی بخشش کرنے والا اور بہت فائدہ پہنچانے والا۔

قرض سبھی جانتے ہیں ادھار کو کہتے ہیں اور یہ زندگی میں ایسا معاملہ ہے جو کم و بیش سبھی کو کرنا پڑتا ہے، یعنی ضرورت کے وقت کچھ عرصے کے لیے کسی سے کچھ رقم لینا۔ لفظ قرض قرآن مجید میں اس مال کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو محض اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لیے خلوصِ دل کے ساتھ خرچ کیا جائے۔ اس خرچ کی تعبیر اللہ کو قرض دینے سے کی گئی ہے اور اسے قرضِ حسن کہا گیا ہے جسے ہم نے قرضِ حسنہ بنا لیا ہے لیکن ادائے قرض میں بے اعتدالیوں کی وجہ سے یہی قرض باہمی سلوک و ہمدردی کے بجائے قطعِ محبّت کا باعث بھی بنتا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں اَلْقَرْضُ مِقْرَاضُ الْمَحَبَّةِ (قرض محبّت کی قینچی ہے) مِقراض کا لفظ جس کے معنی کاٹنے کا آلہ یعنی قینچی ہیں اسی قرض سے بنا ہے اور اس کے اصل معنی کاٹنا ہیں۔

یہ عام لفظ ہے جو ہم پیغام لے جانے والے کے لیے بولتے ہیں لیکن اس کے لغوی معنی ہیں قصد کرنے والا، سیدھی راہ چلنے والا اور درمیا:

اقتصاد اور اقتصادیات اسی سے ہے جس کے معنی ہیں: میانہ روی اور سیدھی راہ چلنا اور صرفِ مال میں میانہ روی اختیار کرنا۔

لفظ قاعدہ ہم دستور وطریقہ کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں لیکن اگر اس کے لغوی معنوں کا خیال کریں تو شاید اس کے مروجہ استعمال میں ہمیں کچھ تامل ہو، کیونکہ اس کے لغوی معنی ہیں، بیٹھنے والی عورت۔ اور قعدہ ایک دفعہ بیٹھنے کو کہتے ہیں، چنانچہ بیٹھنے کی اس حالت کو جس میں نماز پڑھتے وقت ہم التحیات پڑھتے ہیں، قعدہ ہی کہتے ہیں۔ قاعدہ کے معنی کسی چیز کا پیندیا بنیاد بھی ہیں جس کی جمع قواعد ہے۔ قرآن مجید میں بھی ہے: وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ (اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے تھے) اور کسی زبان کے نوآموزوں کے لیے تعلیم کی جو ابتدائی کتاب ہوتی ہے اسے بھی اسی لیے قاعدہ کہتے ہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم کی بنیاد ہوتی ہے اور قاعدہ کے معنی دستور وطریقہ بھی اسی لیے ہوتے کہ دستور وقانون اکثر امور ومعاملات کی بنیاد ہوتا ہے۔

عین کے ساتھ قاعد ہو تو اس کے معنی ہیں بیٹھنے والا اور ہمزہ کے ساتھ قائد کے معنی آگے سے کھینچنے والا، اندھے کی لاٹھی پکڑ کر چلانے والا۔ پھر اس کے مجازی معنی ہوگئے راہ بر، راہ نما، اور فوج کا سردار قوم سیاسی واصلاحی امور بہبود سے ایک طرح بے خبر ہوتی ہے اس لیے انہیں ایک راہ بر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جس طرف قدم اٹھاتا یا اٹھانے کو کہتا ہے قوم اسی طرف گام زن ہو جاتی ہے۔ اس راہ بر کی حیثیت وہی آگے سے کھینچنے اور اندھے کی لاٹھی پکڑ کر چلانے کی ہوتی ہے اس لیے سردار وراہ بر کو قائد کہتے ہیں۔ قائدِ اعظم کے معنی بڑا سردار وراہ بر۔

(۱) کسی چیز کو پنجے سے پکڑنا، گرفت، پکڑ، اسی سے قبضہ ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو مٹھی میں پکڑی جائے، یعنی مٹھی بھر چیز، تلوار وغیرہ کو کہتے ہیں کی جگہ بھی قبضہ کہلاتی ہے جسے دستہ کہتے ہیں اور قبضہ ملک کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فلاں شہر پر فلاں کا قبضہ ہوگیا، قابض ہونا، قبضہ کرنا، اپنی ملک میں لانا، اور مقبوض، مقبوضہ گرفت اور ملک میں لائی ہوئی چیز۔

(۲) گرفتگی اور پیٹ کا درد یعنی پاخانے میں رکاوٹ ہونا، جیسے حکیم ڈاکٹر پوچھتے ہیں: قبض تو نہیں رہتا۔

(۳) طبیعت کی پستگی: یعنی طبیعت میں روانی کے بجائے رکاوٹ ہونا۔ اس کے مقابلے میں بسط ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کشادگی اور وسعت۔

قد وقامت عام لفظ ہے لیکن قدِ عربی میں کسی چیز کو لمبائی میں ماپنے کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ (اگر یوسف علیہ السلام کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے) دوسرے معنی ہیں مسافت طے کرنا، مجازی معنی ہوں گے بدن کی لمبائی۔

لغوی معنی ہیں: لاٹھی، چھڑی، چوب دستی۔ (۲) فربہ اونٹنی

(۳) علم عروض کی اصطلاح میں قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح ومذمت ہو۔ مدح والی نظم کو قصیدۂ مدحیہ کہتے ہیں۔

لوہے کی اس کیل کو کہتے ہیں جس پر چرخی گھومتی ہے یا جس پر چرخی پھرتی ہے۔ پھر اس کے معنی ہوگئے: وہ شخص جس پر کام کا دارومدار ہو، یعنی قوم کا سردار۔ قطب اس ولی کو بھی کہتے ہیں جسے خدا کی طرف سے کسی ملک کا انتظام سپرد ہو۔ قطب اور ولی کے علاوہ ایک درجہ غوث اور ایک ابدال بھی ہوتا ہے۔ قطب اس ستارے کو بھی کہتے ہیں جو انتہائی شمال میں ہے، وہ ایک ہی مقام پر دکھائی دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ادھر اُدھر نہیں ہوتا۔ قطب نما کا نام بھی اسی ستارے کی سمت بتانے کے سبب رکھا گیا ہے۔ محورِ زمین کے شمالی وجنوبی

سرے کو بھی قطب کہتے ہیں۔

قیصر اصل میں اس بچے کو کہتے ہیں
جس کے پیدا ہونے کے وقت سے
کچھ دیر پہلے اس کی ماں مر جائے اور مُردہ ماں کا پیٹ چاک کر
کے اسے نکالا جائے۔ رُوم کا پہلا بادشاہ اغطوس اسی طرح پیدا ہوا
تھا۔ اسی وجہ سے وہ قیصر کہلایا اور اس کے بعد یہ لفظ شاہانِ رُوم
کا لقب ہو گیا۔

لغوی معنی ہیں شدّت کی بھوک

(۲) پیٹ اور سینے کی وہ جلن جو
بھوک کی شدّت کے باعث ہوتی ہے۔ مجازاً اس کے معنی ہو گئے
شدّتِ غم، اضطراب و پیچ و تاب اور جھیلا۔

اس کے معنی ہیں آگے جانے والا
اس لیے اس تھوڑی سی سپاہ کو
جو لشکر کے آگے آگے چلے، مقدمۃ الجیش کہتے ہیں۔ اس کے مجازی
معنی ہو گئے "وہ مختصر سا مطلب جو کسی کتاب یا مضمون کے شروع
میں اس لیے بیان کیا جائے کہ کتاب یا مضمون آسانی سے سمجھ میں
آسکے اور اس کی غرض و غایت معلوم ہو سکے۔ مقدّمہ پیش کرنے
والے کو بھی کہتے ہیں اسی لیے مقدّمہ (دال پر زبر) کے معنی میں پیش کیا
گیا۔ کسی امر کی واردات، دعوٰی و استغاثہ جو عدالت میں بغرضِ فیصلہ
پیش کیا جاتا ہے۔

یہ لزوم سے مشتق ہے، اس کے معنی
ہیں لازم پکڑنا یا کسی کے پاس ہمیشہ
رہنا اسی مناسبت سے نوکری کو ملازمت اور نوکر کو ملازم کہتے ہیں۔

ملّاح کشتی بان یا ناخدا کو کہتے
ہیں۔ یہ لفظ ملح سے مشتق ہے جس
کے معنی ہیں پروں کا دونوں بازو پھڑپھڑانا، کشتی بان بھی جب
دونوں طرف سے چپّو لگاتے ہیں اور چپوؤں کی مدد سے کشتی کھیتے
ہیں تو ان کی ہیئت پرندوں کے بازوؤں کو پھڑپھڑانے سے مشابہ
ہوتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک یہ ملح سے مشتق ہے جس کے معنی
ہیں نمک، چونکہ عرب میں کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں جو نمکین (کھاری)
ہوتا ہے اس لیے ملّاح کو اس سے ایک گونہ نسبت ہے۔

آپ اکثر مینار بولتے اور لکھتے ہیں،
لیکن اصل میں یہ لفظ مینار نہیں منار
یا منارہ ہے۔ اس کی اصل نُور ہے اور معنی ہیں روشنی کی جگہ، چراغ
دان۔ ابتدا میں منار یا منارہ اس ستون کو کہتے تھے جس پر بحری
جہازوں یا مسافروں کو رات کے وقت رستہ دکھانے کے لیے روشنی
کی جائے۔ اب ہر اُونچے ستون کو خصوصاً مساجد کے بلند ستونوں کو
بھی منار کہتے ہیں اور اس کا عام لفظ منار کی جگہ مینار مشہور ہو گیا ہے
ڈاکٹر اقبالؒ کا ایک مصرع ہے۔

تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیلؑ امیں

موسیقی گانے بجانے کے علم کو کہتے
ہیں۔ اس لفظ کی اصل کے سلسلے میں
بعض لوگ اس کا رشتہ موسیقار کے ساتھ جوڑتے ہیں جو ایک باجا
بھی ہے اور ایک پرندے کا نام بھی ہے جس کے بارے میں مشہور
ہے کہ اس کی چونچ میں کئی سُوراخ ہوتے ہیں اور ان سوراخوں سے
طرح طرح کی آوازیں نکلتی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا ماخذ
یونانی لفظ میوز ہے جو بعد میں موسقی اور موسیقی بنا لیا گیا اور عربوں نے
یائے نسبت بڑھا کر موسیقی بنا لیا یہی لفظ انگریزی میں میوزک ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ شعر کے دو ٹکڑے
ہوتے ہیں اور ایک ٹکڑے کو مصرع کہتے
ہیں۔ اصل میں مصرع یا مصراع دروازے کے دو کواڑوں میں سے
ایک کو کہتے ہیں۔ دونوں کواڑ ایک جیسے ہوتے ہیں اور ایک
دوسرے پر منطبق ہو کر بند ہوتے ہیں۔ یہی حال دو مصرعوں کا
ہے، البتہ آزاد شاعری میں یہ رعایت ہے کہ ایک مصرع چاہے
گز بھر کا ہو اور دوسرا ایک انچ کا۔ جب بھی وہ دونوں مصرع
ہی ہیں۔

سلیم حسن مرزا

کراچی کی آب و ہوا

بیشتر اس کے کہ اصل موضوع کو چھیڑا جائے، ہم آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ بتا دینا بلکہ جتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ کراچی مغربی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اتنا بڑا کہ کسی زمانے میں یہ نہ صرف مغربی پاکستان بلکہ مشرقی پاکستان کا بھی دارالخلافہ ہوا کرتا تھا۔ ماہرینِ شہریات (ماہرین اگر جنگلات کے ہو سکتے ہیں، تو شہریات کے بھی ہو سکتے ہیں) کا کہنا ہے کہ یہ روز بروز بڑا ہوتا چلا جائے گا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جب ۲۰۰۰ء کا آغاز ہوگا، تو کراچی کا ایک سرا بڑھتے بڑھتے ایران سے مل چکا ہوگا اور دوسرا سمندر کے رستے لنکا تک پہنچنے کے لیے تیار ہوگا۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایران اور لنکا کے رہنے والوں کو کراچی کے ان ہوسناک ارادوں نے ابھی سے خاصا پریشان کر رکھا ہے۔

پاکستان کے دوسرے علاقوں کے ایسے لوگ، جنہیں کراچی جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، جب کراچی کے کسی باشندے سے اس کے بڑے پن کا تذکرہ سنتے ہیں تو ان کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ کراچی ایک ایسے شہر کا نام ہے جو شہر ہو یا نہ ہو بڑا ضرور ہے۔ ہم بھی ایک بار ایسا ہی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ بات ہے ان دنوں کی جب ہم کراچی میں آباد نہیں ہوئے تھے اور اسے اگر دیکھا بھی تھا، تو صرف نقشے پر۔ ہمارے ایک بزرگ کراچی سے کچھ عرصے کے لیے بطور مہمان تشریف لائے اور جب رخصت ہونے لگے، تو رسماً بولے:

"میاں، ہماری کراچی کی سیر کرنے بھی کبھی ضرور آنا۔"

ہم نے بھی اخلاقاً کہا:

"بہت اچھا۔۔۔۔۔۔۔ انشاء اللہ۔"

فرمانے لگے: "کراچی بہت بڑا شہر ہے۔"

چونکہ آپ نے "بہت" پر خاصا زور صرف کیا تھا، اس لیے ہم نے پوچھ لیا:

"کتنا بڑا ہے؟"

جواباً کہنے لگے: "اتنا بڑا کہ بس"، تھوڑی دیر رُکے، کچھ سوچا اور پھر بولے: "یوں سمجھو کہ بہت ہی بڑا۔"

حیرانی کی بات ہے کہ اکثر تم ظریف "اتنے بڑے کہ بس بہت ہی بڑے" شہر کو مؤنث بولتے ہیں، حالانکہ کراچی کے مؤنث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بار ایک صاحب سے ہم نے پوچھا:

"کیوں صاحب، آپ کراچی کو مؤنث کیوں بولتے ہیں؟"

انہوں نے سمجھاتے ہوئے بتایا:

"میاں صاحبزادے، جس چیز کے نام کے آخر میں چھوٹی "ی" آئے، وہ مؤنث ہی بولی جاتی ہے۔" آدمی کچھ پڑھے لکھے تھے، اس لیے اس وقت تو ہم خاموش رہے یا یوں کہیے کہ خاموش رہنے میں مصلحت سمجھی، مگر بعد میں خیال آیا کہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ہیں، احمد ندیم قاسمی ہیں اور حسین شہید بھی سہروردی تھے۔ اب جبکہ یہ لوگ اور ان کی طرح کے دوسرے لوگ بھی (مثلاً: کاظمی، صدیقی، عباسی اور لطیفی وغیرہ) مذکر ہی ہوتے ہیں، تو

کراچی بھی یقیناً مذکر ہے۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں، اس لیے درخواست کرتے ہیں کہ کم از کم اس مضمون کو پڑھنے والے کراچی کو مؤنث سمجھنے کی عادت ترک کر دیں۔ کسی نر کو مادہ سمجھ لینا کوئی شرافت نہیں ہے۔ ہاں جو لوگ کراچی کو کراچی کہتے ہیں، وہ کہتے رہیں۔

مندرجہ بالا تمہیدی مگر معلوماتی سطور کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ کراچی کی آب و ہوا اچھی ہے اور نہ بُری، بلکہ کچھ ایسی ہے جسے دوست نواز کہا جا سکتا ہے، یعنی یہ کراچی کے رہنے والوں کے لیے بالکل بے ضرر ہے۔ انہیں کچھ بھی تو نہیں کہتی، لیکن پنجاب سے کوئی عام آدمی آئے، تو اسے دیکھتے ہی دیکھتے عجیب بنا دیتی ہے اور اگر آنے والا پنجابی پہلے ہی عجیب ہو، تو اُسے عجیب و غریب کر دیتی ہے۔ قارئین کرام! یہ تجربے کی بات ہے، سُنی سنائی نہیں ہے۔

ہم آج سے تقریباً تین برس پہلے کراچی آئے تھے، تو ایک عام بلکہ بہت ہی عام آدمی تھے۔ ہمارے ساتھ ہماری ایک بیوی بھی تھی جو عجیب بلکہ بہت ہی عجیب تھی۔ ہم "عجیب" اور ہماری بیوی "عجیب و غریب" کیسے ہوئی، یہ بتانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کراچی میں وارد ہونے سے قبل کے حالات پر روشنی ڈالی جائے۔

کئی برسوں کی بات ہے، غالباً چار برس کی کہ ہم سرگودھا میں تھے اور مجرد تھے۔ ایک دن ہمارے والد صاحب کو خدا جانے کیا سوجھی کہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری اماں جان سے کہنے لگے:

"میں نے کہا سُنتی ہو بیوی، اب بچے کی شادی کر دینی چاہیے۔"

اور پھر انہوں نے واقعی ہماری شادی کر دی۔ والد صاحب، خدا غریق رحمت کرے، بڑے دھڑلے کے آدمی تھے، جو کہتے کر دکھاتے۔ ہم نے جب انہیں مطلع کیا کہ جناب، ہم جیب بنک لمیٹڈ میں اکاؤنٹنٹ ہیں، ہم مولوی عجیب اللہ کی بیٹی بسم اللہ سے ہرگز شادی وادی نہیں کریں گے۔ انہیں تاؤ آ گیا، غضب ناک ہو کر بولے:

"تو پھر اور کیا کرو گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں، کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ بسم اللہ بیک ورڈ یعنی غیر ترقی یافتہ ہے۔ وہ صبح سویرے کھلی ہوا میں انڈرویئر پہن کر ورزش نہیں کرتی، بلکہ نماز پڑھتی ہے اور تماشکر کے گائے ہوئے گانوں کے بجائے بُلھے شاہ کی کافیاں پسند کرتی ہے، مگر انہوں نے ایک نہ مانی اور بسم اللہ ہمارے پلّے باندھ دی۔ بسم اللہ ہمارے سُسر یعنی مولوی عجیب اللہ کی سب سے بڑی دختر ہے۔ اس کے بعد ان کی مزید آٹھ لڑکیاں اور پانچ لڑکے ہیں۔ مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے۔

جب ہم کراچی نہیں آئے تھے، بسم اللہ بڑی عجیب تھی۔ دانتوں میں فارہیٹ، یا میکن وغیرہ کے بجائے مسواک استعمال کرتی۔ بالوں کی پونی ٹیل (یعنی ٹٹو کی دُم) بنانے کے بجائے چُٹیا کو موتیوں والے سیاہ پراندے میں باندھ کر تمام سر پر رنگ برنگے کلپ اس طرح جڑ لیتی جیسے سنیما گھروں میں نئی فلموں کی نمائش پر جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں اور رسیلے پھیری والے سے پُرانے کپڑوں اور جوتوں کے بدلے لیے ہوئے گجراتی برتن بیٹھک کے کارنس پر سجا کر اچھے خاصے گھر کو "ماڈرن کراکری ہاؤس" بنا دیتی۔ ہم نے کئی بار سمجھایا کہ بیٹھک کا کارنس تصویروں اور گلدانوں کے لیے ہوتا ہے، اور یہ کہ برتن باورچی خانے میں رکھے جاتے ہیں، مگر اُس اللہ کی بندی پر ہماری نصیحتوں کا یہ اثر ہُوا کہ اس نے گلیکسو کمپنی کی سہ رنگی تصویر باورچی خانے

دیں۔ ہم نے ٹکٹائی لگانا چھوڑ دی اور بیوی کو جانے کیا سُوجھی کہ اُس نے بالوں میں کلپ لگانے کے بجائے سر خ ربن باندھنے شروع کر دیے۔ جب ہم پتلون کی جگہ پائجامہ پہننے لگے تو اس نے دنداسہ خریدنا بند کر دیا۔ اب غسل خانے میں تبّت ٹوتھ پیسٹ اور اس کے اُونچی کیس میں عُمر رواں کی شیشیاں نظر آنے لگیں، اور پھر ایک دن جب ننھّی کی ماں نے دبی زبان سے ساڑھی کی فرمائش کی، تو ہم نے جوشِ جنوں میں سائیکل بیچ ڈالی اور پیدل دفتر جانے لگے۔ ان دو برسوں میں اور بھی بہت کچھ ہُوا، مثلاً: بیوی نے چُٹیا کٹوانے اور ہم نے ڈاڑھی رکھنے کے بارے میں بارہا سوچا۔ ہم ایک دن میں پانچ مرتبہ "نما" پڑھنے لگے اور بیوی ہفتے میں دو بار سنیما دیکھنے لگی، اور جب اس نے اللہ بندے کی بیوی خیراتن کے ہاتھ سنگر مشین بیچ کر مسز خان سے ریڈیو سیٹ خرید لیا، تو ہم نے خواب آور گولیوں کا استعمال شروع کر دیا۔

یہ ہے تفصیل اُن تبدیلیوں کی جو کراچی آنے کے بعد پہلے دو برسوں میں ہوئیں۔ رہا سوال تیسرے سال کا جو ابھی جاری ہے، تو اس سال کچھ بھی نہیں ہوا بس یہی کہ ایک دن ہماری بیوی کہنے لگی:

"آپ مجھے ابّا جان کی طرح بیوی نہ کہا کریں۔"

ہمیں بہت غُصّہ آیا۔ ہم نے کہا:

"کیا کہتی ہو؟ ہمارے ابّا جان تمہیں بیوی کہتے تھے؟"

پہلے تو وہ بہت ہنسی اور جب ہنس چکی، تو بولی:

"میرا مطلب ہے آپ کے ابّا جان آپ کی امّاں جان یعنی اپنی بیوی کو بیوی کہہ کر مخاطب کرتے تھے نا؟ آپ مجھے بیوی نہ کہا کریں۔"

ہمیں اور بھی غُصّہ آیا اور ہم غُصّے ہی کی حالت میں بولے:

"کیوں، تم ہماری بیوی نہیں ہو؟"

کہنے لگی: "وہ تو ہوں، مگر آپ کہا نہ کریں۔"

میں لٹکا دی تاکہ روٹی پکاتے ہُوئے تصویریں موٹے تازے بچّے کو ہنستا دیکھ کر دِل "پشوری" کرتی رہے۔ ہم کبھی دیر سے گھر پہنچتے، تو ہمارا استقبال یوں ہوتا: "آ گئے آپ، ابھی کاہے کو آنا تھا۔"

اگر ہم کہتے کہ ایک دوست کے یہاں دیر ہو گئی ہے، تو یہ لمبی چوڑی اور رٹی رٹائی تقریر سُننا پڑتی:

"تو وہیں رہ جانا تھا، آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہاں کیا رکھا ہے آپ کے لیے؟ صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک دو دن کی بات ہو تو خیر، یہاں تو تیس دن اور بتیس میلے ہیں۔ آج دوست کے ہاں گئے تھے، آج صاحب نے بُلایا تھا، آج سائیکل "پنچر" ہو گئی تھی، آج یہ ہو گیا تھا، آج وہ ہو گیا تھا۔ میں پوچھتی ہوں کس دن کچھ نہیں بھی ہوتا۔ اتوار کی چھٹی بھی جناب باہر ہی گزارتے ہیں۔ آخر اس طرح کب تک بسر ہو گی۔ اگر آپ اپنا وطیرہ نہیں بدلنا چاہتے، تو بندی کو چھٹّی دے دیجیے۔"

اور ہم یہ سوچ کر اُسے معاف کر دیتے کہ آخر ہے نا مولوی مجیب اللہ کی بیٹی جو منبر پر کھڑے ہو کر بولنا شروع کرتے ہیں، تو مسلسل چار چار گھنٹے بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ سُننے والوں کے کان سائیں سائیں کرنے لگتے ہیں، مگر آپ کی زبان میں مجال ہے ذرا سی لرزش بھی آ جائے۔

پھر یوں ہُوا کہ ہمیں فلک کی گردش نے بے چین کیا اور ہم کراچی چلے آئے ع

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا

کراچی آ کر پہلے دو برسوں میں جو تبدیلیاں رونما ہُوئیں، اُن میں سے چند ایک یہ ہیں: بیوی نے ایک عدد بچّی کو جنم دیا اور ہماری دائیں کنپٹی نے بھی جواباً ایک سفید بال پیدا کر دیا۔ ہماری بیوی جانے کیوں مولوی مجیب اللہ کے بجائے مسٹر مجیب اللہ کی بیٹی نظر آنے لگی۔ اس نے بیٹھک کے کارنس سے برتن اُٹھا کر ہماری ایک اور بے بی کی دو تصویریں سجا

ہمیں اُلجھن ہونے لگی۔ ہم نے اُسے ڈانٹتے ہُوئے کہا:

"عجیب بات ہے، تم ہماری بیوی ہو۔ ہم تمہیں بیوی نہ کہیں تو کیا مونگ پھلی کہیں؟"

وہ بولی: "آپ مجھے بیگم کہا کریں۔"

ہم نے بہت ہی زیادہ غُصّے میں آکر کہا:

"ہرگز نہیں، بیگم تو ہم اپنے صاحب کی بیوی کو کہتے ہیں تم کوئی ہمارے صاحب کی بیوی ہو؟ تم ہماری بیوی ہو، اس لیے ہم تمہیں بیوی ہی کہیں گے۔"

وہ کہنے لگی:

"کچھ بھی ہو، مَیں تو بیگم بن کر رہوں گی۔"

ہم نے کہا:

"کچھ بھی ہو، ہم تو بیوی بنا کر رکھّیں گے۔"

اُسے بھی غُصّہ آگیا۔ کہنے لگی:

"بیوی بن کر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔"

غُصّے سے ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم نے بھی غضب ناک ہو کر کہا:

"بیگم بنا کر ہم سے نہیں رکھا جاتا۔"

وہ بولی:

"اچھا، تو پھر مَیں میکے چلی جاؤں گی۔"

ہم بولے:

"اچھا، تو پھر چلی جاؤ۔"

ہم نے تو خیر ویسے ہی کہا تھا، لیکن وہ سچ مُچ بچّی کو لے کر اپنے میکے یعنی ہماری سسرال چلی گئی اور آج تک واپس نہیں آئی۔ خط کتابت البتّہ ابھی جاری ہے۔ ہر خط میں یہی لکھتی ہے کہ کراچی میں رکھنا ہے تو بیگم بنا کر رکھّو اور اگر بیوی بنانا ہے، تو سرگودھا چلے آؤ۔

شاید بہت سی بہنیں یہ سُن کر حیران ہو جائیں گی کہ شریر بچّوں کی مائیں بڑی قسمت والی مائیں ہیں کہ انہیں محض خوش بختی سے شریر بچّے ملے ہیں۔ شرارت وہی بچّے کرتے ہیں جن میں سُوجھ بُوجھ ہوتی ہے، جن کا ذہن تیز ہوتا ہے۔ ذہین بچّے کبھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کے ذہن کی تیزی انہیں کچھ نہ کچھ کرتے رہنے پر اُکساتی رہتی ہے۔

بات یہ ہے کہ آدمی چاہے بچّہ ہو یا بڑا، جس دُنیا میں وہ رہتا ہے، اس کی ہر چیز کا اتا پتا، اس کی بناوٹ، اس کی خاصیتیں، اس کے فائدے اور نقصان معلوم کر کے اپنا علم بڑھانا چاہتا ہے۔ سائنس کے تمام شعبے، ایجادات کے تمام کرشمے، فلسفے کے تمام مسئلے، تاریخ کے پورے دفتر سب کے سب انسان کے اسی جذبے کے رہینِ منّت ہیں۔ بڑا آدمی حرکت کرتا ہے، تو یہ چیز سائنس کی زبان میں ریسرچ یا تحقیق کہلاتی ہے اور چھوٹا بچّہ یہی حرکت کرتا ہے، تو وہ اس کی شرارت بن جاتی ہے۔ ذہین بچّہ جب کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جو اُس کے لیے نئی ہے، تو اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے حرکت ہوتی ہے، وہ یہ جاننے کے لیے بے کل سا ہو جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے، کیسے بنی ہے، اس کے اندر کیا ہے، اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب باتیں جاننے کے لیے وہ اس چیز کو اُلٹتا پلٹتا اور توڑتا پھوڑتا ہے۔ شریر بچّے سچ مُچ ایک نعمت ہیں، لیکن شریر بچّوں کی تربیت اور ان کے اچھے ذہن کو اچھے کاموں کی طرف لگا کر انہیں کام کا بنانا بڑا کٹھن کام ہے۔ اس کے لیے بڑی سُوجھ بُوجھ اور بڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس کی شرارت پر اُلجھ کر آپ نے بچّے کو دبانے کی کوشش کی، تو اس کی اُپج یا تو ہمیشہ کے لیے دب کر ختم ہو جائے گی یا اگر دب نہ سکی، تو پھر بچّہ آپ کی آنکھ بچا کر اُسے بُرے کاموں میں لگانے پر مجبور ہو جائے گا۔ (مبارز الدین رفعت)

چھوٹا معلم

سکول ماسٹر برائتھ ویٹ اپنا کمرہ صاف کر رہا تھا کہ اُسے ایک پُرانی سی ڈائری ملی۔ ڈائری میں اس نے ایک اُستاد کی حیثیت سے اپنے تجربات قلمبند کیے تھے۔ غریب برائتھ ویٹ کو معلوم نہ تھا کہ اسے کیسے چھپوایا جائے۔ ساتھیوں سے مشورہ کیا اور بالآخر مسوّدہ لندن کی لٹریری ایجنسی کو بھیج دیا گیا۔ ایجنسی کو ہر روز نئے لکھنے والوں کے دو سَو سے زائد مسوّدے موصول ہوتے تھے؛ چنانچہ برائتھ ویٹ کا مسوّدہ بھی "داخل دفتر" کر دیا گیا۔ کئی ماہ بعد ایجنسی کے جنرل مینجر کو سفر میں ساتھ لے جانے کے لیے چند مسوّدوں کی ضرورت پڑی۔ اگلے روز ایجنسی کے ناظمِ اشاعت کو جنرل مینجر کی طرف سے برائتھ ویٹ کا مسوّدہ اور ایک تار موصول ہُوا۔ لکھا تھا: "اِس مسوّدے کی اشاعت کا فوراً بندوبست کیا جائے۔" اس طرح To sir with love کتابی شکل میں آئی۔ اب تک یہ کتاب پندرہ بار چھپ چکی ہے۔ انسان دوستی، محبّت اور عالمی مساوات کا جو درس اس چھوٹی سی کتاب میں دیا گیا ہے، وہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ سیدھے سادے دل نشیں انداز میں یہ تحریر قومی امتیاز اور نسلی تعصّب کے بُتوں کو توڑتی ہوئی ہمیں ایک ایسی دُنیا میں لے جاتی ہے جہاں سب انسان برابر ہیں اور جہاں بڑائی کا معیار رنگ رُوپ نہیں، اعلیٰ کردار ہے۔

ضیا شاہد

یہ تندرستی یہ توانائی انہیں تلو ہی سے ملتی ہے

اسی لئے ہزاروں مائیں ہر روز تین بار تلو میں کھانا پکاتی ہیں

وجہ ظاہر ہے۔ تلو بنا سیتی خالص پاکیزہ غذائیت سے بھرپور اور مفید صحت ہے۔ ہر ہاں یہ بھید جانتی ہے اسی سبب ہزاروں مائیں ہر روز تین بار بہت لگن سے تلو میں لذیذ اور غذائیت بخش کھانا پکاتی ہیں۔ جو بچوں بڑوں دونوں کو کھیل کود، کام کاج کے لئے فاضل توانائی بخشتا ہے۔

تندرستی اور توانائی کے لئے اچھی غذا اور اچھی غذا کے لئے تلو کا استعمال لازمی ہے۔

تندرستی اور تلو گھر گھر میں ساتھ ساتھ ہیں

وٹامن اے اور ڈی سے بھرپور

PRESTIGE TD ۱۱۱/۸۲

اچھی رائے نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم بچّوں کو بدتمیز اور گستاخ بنا دیتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر غریب اور نادار بچّوں پر سختی کی جائے، تو وہ اور زیادہ جھینپو اور ڈرپوک ہو جائیں گے اور زندگی میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے، لہٰذا ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ جسمانی سزا اور مار پیٹ تو ایک طرف رہی، ہم بچّوں کو ڈانٹ پلانا بھی نامناسب سمجھتے ہیں۔ اکثر استاد یہاں سے ناکام ہو کر جاتے ہیں، اس لیے کہ وہ بچّوں سے محبّت کے بجائے سختی کا سلوک روا رکھنے کے عادی ہوتے ہیں ــــ بچّوں سے محبّت کیجیے، وہ آپ سے محبّت کریں گے۔ ہمارا ایمان ہے کہ محبّت سب سے بڑی طاقت ہے۔"

میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونجتے رہے اور آنکھوں کے سامنے دن بھر کے مناظر لہراتے رہے۔

"ایک بات اور ــــ آپ دیکھیں گے کہ اِن بچّوں میں سے اکثر بدتمیز اور بیہودہ ہیں۔ وہ سگریٹ پیتے ہیں اور فحش گالیاں بکتے ہیں۔ ان کا لباس بھی نہایت واہیات ہوتا ہے، لیکن آپ کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ ان کی اصلاح نہیں ہونی چاہیے، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ انہیں محبّت سے سمجھانے کی ضرورت ہے جب وہ ناپسندیدہ فعل کے مرتکب ہو رہے ہوں، ان پر ناراضگی کا اظہار کرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ اس طرح وہ ضدّی اور ہٹ دھرم بن جائیں گے۔ چشم پوشی سے کام لیجیے اور بعد میں مناسب طریق سے انہیں بُرے کام کا نقصان جتلا دیجیے ــــ ان بچّوں کو آپ کی محبّت کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کے ننھے مُنّے ذہنوں نے ماحول سے نفرت کے سوا کچھ نہیں پایا ــــ آپ کل سے کام شروع کر دیجیے۔ ایک بار پھر کہوں گا کہ جن بچّوں کو آپ پڑھانے والے ہیں، وہ نہایت معصوم اور پیارے بچّے ہیں ــــ اگر ان سے کوئی بھول ہو جائے تو انہیں ڈانٹیے نہیں، ورنہ وہ بگڑ جائیں گے ــــ کسی قسم کی تکلیف ہو، تو مجھ سے کہیے، مَیں آپ کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار رہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور ہم اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

سہ پہر مَیں نے ایک اسٹانی مسٹر ڈریو کے ساتھ گزاری ــــ مسٹر ڈریو نے مجھے ٹائم ٹیبل بتایا، کورس کی کتابیں دکھائیں اور بعض ضروری باتوں سے آگاہ کیا۔ شام کو گھر جانے کے لیے بس پر سوار ہوا، تو ذہن میں بہت سے خیالات کا ہجوم تھا۔ مسٹر فلوریان کی گفتگو رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ بچّے بہت معصوم اور پیارے ہیں۔ انہی معصوم اور پیارے بچّوں نے میرے آنے سے ذرا دیر پہلے مسٹر ہیک مین کو دن میں تارے دکھا دیے تھے ــــ "کالیے، حبشی، کلوٹے" کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ عام حالات میں شاید مَیں یہ بے عزّتی کبھی برداشت نہ کرتا، لیکن مجھے ملازمت کی بہت سخت ضرورت تھی۔ ایک مُدّت سے مَیں بیکار تھا اور یہ تہیہ کر چکا تھا کہ خواہ کیسی ہی ملازمت کیوں نہ ملے، مَیں فوراً قبول کر لوں گا ــــ آج سے چار سال قبل مَیں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مَیں ایک سکول ماسٹر بنوں گا۔ میرے پاس الیکٹرونک انجنیئرنگ کا ڈپلوما تھا۔ مَیں رائل ایئر فورس میں انجنیئر تھا۔ میں نے جنگِ عظیم کے آغاز ہی میں اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر فوج کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ جنگ کے بعد جب ہنگامی عملے کی تطہیر شروع ہوئی، تو مَیں بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ میرے پاس سائنس کی ایک اعلیٰ ڈگری بھی تھی اور انجنیئرنگ کے میدان میں کئی سالہ تجربہ بھی ــــ تطہیری مرکز میں ایک شخص نے، جو میکانکی انداز میں ہر شخص کے لیے سول کی ملازمتیں تجویز کر رہا تھا، میرے کاغذات دیکھ کر کہا:

"مسٹر برائٹھ ویٹ، حقیقت یہ ہے کہ مالی طور پر آپ گھاٹے میں نہیں رہے۔ آجکل بے تحاشا کارخانے کھُل رہے ہیں اور تجربہ کار انجنیئروں اور مکینکوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ آپ

کو تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اگلے ہفتے مجھے تین کمپنیوں کی طرف سے انٹرویو کی دعوت موصول ہوئی۔ تیسرے دن مَیں پہلی فرم کے دفتر پہنچ گیا۔ دروازے پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے شیشے کا بڑا سا دروازہ کھولا اور مَیں ہال کمرے میں داخل ہوگیا — لیڈی سیکرٹری کے پاس جا کر مَیں نے خوش اخلاقی سے کہا:

"صبح بخیر، میرا نام برائتھ ویٹ ہے، مجھے مسٹر سمینڈ نے انٹرویو کے لیے بُلایا ہے۔"

اُس روز مَیں نے انٹرویو کے لیے خوب تیاری کی تھی۔ مَیں اپنا بہترین سُوٹ پہنے ہوئے تھا، میرے جُوتے اچھی طرح پالش کیے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود جونہی لیڈی سیکرٹری نے رجسٹر سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور آہستہ سے کچھ کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم کئی برآمدوں میں سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے پہنچے۔ مجھے اس جگہ چھوڑ کر وہ واپس چلی گئی۔ مَیں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی:

"اندر آجائیے۔"

مَیں نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

ایک لمبی سی میز کے پیچھے چار آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ مسٹر سمینڈ شاید دائیں جانب بیٹھے تھے کیونکہ مجھے دیکھ کر سب سے پہلے انہوں نے اُٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے تعارف کرانے کے بعد انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان کے ساتھی مجھ پر سوالات کرنے لگے۔ مَیں نے ہر سوال کا معقول جواب دیا بعض سوال تو سرے سے غلط تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خود سوال کرنے والوں کو الیکٹرونک انجنیئرنگ کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ بیس منٹ تک یہ انٹرویو جاری رہا۔ پھر مسٹر سمینڈ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، تینوں نے سر کے اشارے سے انہیں کچھ سمجھایا، شاید وہ میرے متعلق کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مسٹر سمینڈ نے بات شروع کی:

"مسٹر برائتھ ویٹ، ہم آپ سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک تعلیمی قابلیت اور تجربے کا تعلق ہے، آپ اس عہدے کے لیے موزوں ہیں جس کے لیے ہم نے آپ کو بُلایا ہے، لیکن ایک مشکل ایسی ہے جس کا حل بہت مشکل ہے۔ دیکھیے نا، اگر ہم آپ کو الیکٹرونکس انجنیئر رکھ لیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کم و بیش دو سَو انگریز ملازمین آپ کے ماتحت کام کریں گے۔ یہ لوگ ہمارے پاس سالہا سال سے ملازم ہیں اور ہمارے تعلقات ان سے بہت خوشگوار ہیں۔ معاف کیجیے، آپ کی ماتحتی شاید وہ قبول نہ کریں — ویسے ہمارے ہاں کچھ ایسی جگہیں ہیں جہاں آپ الگ تھلگ کام کر سکتے ہیں، لیکن آپ کی تعلیم اور تجربہ بہت زیادہ ہے، وہ تو معمولی کمپنیوں کی اسامیاں ہیں۔ ہم معذرت چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔ میری آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا سا چھا گیا تھا — مَیں نے جلدی سے مصافحہ کیا اور باہر آگیا۔ چھ سال کے عرصے میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی کالی رنگت کا اتنی شدت سے احساس ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں جب مَیں نے اپنے آپ کو رضاکار کی حیثیت سے فوج کے سامنے پیش کیا، تو کسی نے اس رنگت پر اعتراض نہ کیا۔ جنگ کے دنوں میں جب رائل ایئر فورس کی وردی پہنے مَیں بازاروں میں نکلتا تھا، تو کبھی کسی نے مجھے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جب مَیں پہلے پہل برطانیہ میں آیا تھا، تو ذہن میں اس ملک کے بارے میں بہت اچھے خیالات تھے — یہاں آزادی تھی، وقار تھا اور انسانی مساوات تھی ——

کم از کم کتابوں میں تو میں نے یہی پڑھا تھا۔ یہ مہذّب لوگوں کا مُلک تھا، لیکن فوج سے نکل کر چند ہی دنوں میں مجھے یہ محسوس ہو گیا کہ یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ فرد کی جس آزادی کے لیے مَیں نے اپنی جان تک پیش کر دی تھی، وہ ایک ڈھونگ تھا۔ جمہوریت اور انسانی حقوق کے علمبردار درحقیقت گھناؤنی اور گھٹیا قسم کی طبقہ پرستی کے شکار تھے۔ مجھے اپنے اُوپر غُصّہ آ رہا تھا۔ مَیں نے ان لوگوں پر اعتماد کیا تھا۔ مَیں نے ان کی خاطر اپنی جان تک جنگ کی آگ میں جھونک دی تھی، لیکن یہ قوم کتنی مطلب پرست تھی۔ ضرورت کے وقت یہ لوگ گدھے کو بھی اپنا باپ بنانے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے، مگر جب ضرورت پوری ہو جاتی تو یہی شخص ان کے لیے ماتھن کا بال بن جاتا جسے وہ اپنی فطری "صفائی پسندی" کی وجہ سے فوراً باہر نکال دیتے تھے۔ راستے میں ایک جگہ رُک کر مَیں نے باقی دو فرموں کو فون کیا اور اپنی تعلیمی قابلیت اور تجربے کے ساتھ ساتھ واضح طور پر یہ بتا دیا کہ مَیں ایک حبشی ہوں۔ مجھ میں خود انٹرویو کے لیے جانے کی ہمّت نہ تھی۔ خیال تھا کہ شاید کوئی فرم رنگ اور نسل کے بجائے صرف کام سے غرض رکھتے ہوئے مجھے ملازم رکھ لے لیکن دونوں جگہوں سے ٹکا سا جواب مل گیا۔ افسردہ اور پریشان حال مَیں ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور سڑک کے کنارے کنارے سمت کا تعیّن کیے بغیر چل دیا۔

دن گزرتے چلے گئے لیکن مجھے کہیں ملازمت نہ مل سکی۔ دفترِ روزگار کے چکّر کاٹ کاٹ کر مَیں مایوس ہو گیا۔ کوئی فرم ایک حبشی کو چیف انجینیر کے عہدے پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ایک روز اخبار میں ایک اشتہار بھی دیا کہ مَیں ایک حبشی ہوں اور ملازمت چاہتا ہوں، ساتھ ہی اپنی ڈگریاں اور عملی تجربے کی تفصیلات بھی دیں، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کچھ عرصے بعد حالات مجھے گرینز لیڈ کے سکول میں لے گئے جہاں ہیڈ ماسٹر نے مجھے ان بچّوں سے محبت کرنے کی نصیحت کی جنہوں نے مجھ

پر کالیے اور کلوٹے کے آوازے کسے تھے۔

* * * * *

رات کے وقت بستر پر لیٹ کر مَیں نے صورتِ حال پر غور کیا۔ میرے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ سکول کی ملازمت صرف اس صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی جب مَیں ان بچّوں پر اپنی تمام محبّت اور شفقت نچھاور کر دوں جو ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے تھے جس کو مجھ سے سخت نفرت تھی۔ یہ کام میرے لیے بہت مشکل تھا — قدرتی طور پر مَیں ان گورے بچّوں سے خوف زدہ تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مَیں سکول کی ملازمت ترک کر دوں، ورنہ میرا حشر بھی مسٹر ہیک مین جیسا ہو گا۔ وہ انگریز ہونے کے باوجود بچّوں کے ہاتھوں پٹ گئے تھے۔ میری دال وہاں کیسے گل سکتی تھی۔ اچانک ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ آج کے بچّے کل کے بڑے۔ اگر مَیں ان بچّوں پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ رنگ، رُوپ اور نسل کی تخصیص بیکار ہے، اصل چیز انسان کا کردار اور شخصیت ہے، تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہو گا — مَیں دیر تک سوچتا رہا اور آخر مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ مَیں ان گستاخ اور بدتمیز بچّوں کی محبّت جیت لوں گا، خواہ اس کے لیے مجھے اپنا سب کچھ کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔ مَیں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا جہاں کوئی مالکِ مکان صرف اس لیے کسی غیر ملکی کو مکان دینے سے انکار نہیں کرے گا کہ اُس کا رنگ کالا ہے — کالے لوگ گوروں سے زیادہ مہذّب، با اخلاق، محنتی، مخلص اور صاف ستھرے ہو سکتے ہیں — یہ سوچ کر کہ اب مَیں اپنے لیے نہیں، بلکہ اپنی قوم کے لیے لڑوں گا، مجھے دلی خوشی ہوئی۔ انہی خیالوں میں مگن مَیں نیند کی دُنیا میں پہنچ گیا۔

پہلے روز کلاس روم کا دروازہ کھولتے وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے اُوپر قابو پایا اور اندر چلا گیا۔ یہ وہی کلاس تھی جسے مسٹر ہیک مین چھوڑ کر

لائف بوائے سے نہائیے۔ تندرست رہیئے

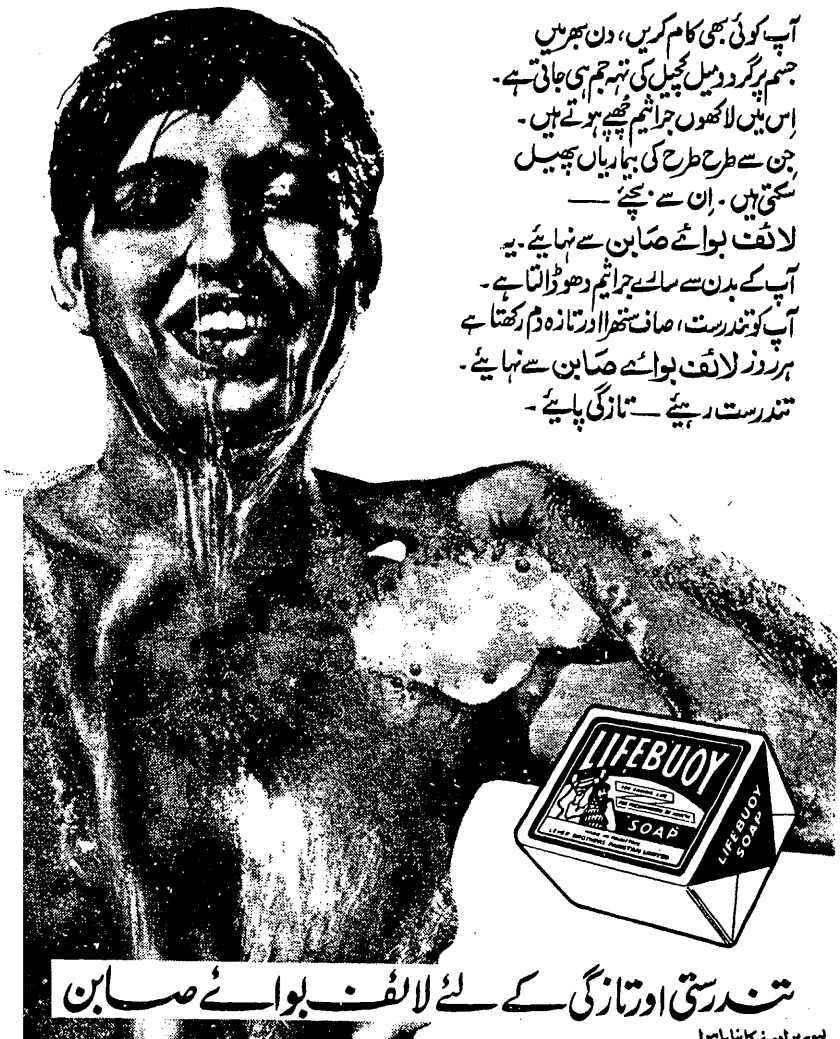

آپ کوئی بھی کام کریں، دن بھر میں
جسم پر گرد و میل کچیل کی تہہ جم ہی جاتی ہے۔
اس میں لاکھوں جراثیم چھپے ہوتے ہیں۔
جن سے طرح طرح کی بیماریاں پھیل
سکتی ہیں۔ اِن سے بچیئے ——
لائف بوائے صابن سے نہائیے۔ یہ
آپ کے بدن سے سارے جراثیم دھو ڈالتا ہے۔
آپ کو تندرست، صاف ستھرا اور تازہ دم رکھتا ہے
ہر روز لائف بوائے صابن سے نہائیے۔
تندرست رہیئے — تازگی پائیے۔

تندرستی اور تازگی کے لئے لائف بوائے صابن

لیور برادرس (انڈیا) لمیٹڈ کا بنایا ہوا

L 40-193-65-UD

گئے تھے اور جہاں مجھے کلوٹے کا خطاب ملا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر میں لڑکوں اور لڑکیوں کے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر تو وہ آپس میں باتیں کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی اور سب میری طرف کچھ اس طرح دیکھنے لگے جیسے چڑیا گھر میں کسی جانور کو دیکھ رہے ہوں۔ حاضری لینے کے بعد میں نے اپنا تعارف کرایا اور پھر نپے تلے لفظوں میں کہا:

"اس سے پہلے کہ میں کتاب پڑھانا شروع کروں، آپ میں سے کوئی صاحب مجھے پڑھ کر سنانا پسند کریں گے؟" میں رجسٹر سے نام بولتا ہوں۔" پاٹر پہلا لڑکا تھا جس کا میں نے نام لیا۔ اس کے بعد کئی لڑکوں اور لڑکیوں نے کتاب پڑھی۔ سب کے تلفظ انتہائی غلط تھے، وہ سادہ سے سادہ فقروں کا مطلب نہ بتا سکے۔ صرف ایک لڑکی نے عبارت ٹھیک سے پڑھی، وہ پامیلا ڈیر تھی۔ جب وہ پڑھ رہی تھی، تو کلاس کے پچھلے حصّے سے دبی دبی ہنسی کی آواز آئی۔ آہستہ آہستہ آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر پیچھے گیا، ایک لڑکا بڑکی بنی ہوئی چھوٹی سی عورت لیے بیٹھا تھا اور بڑی نازیبا حرکات کر رہا تھا۔ میرا خون کھول اُٹھا۔ میں نے دانت بھینچ کر اپنے اُوپر قابو پایا اور لڑکے سے کہا:

"براہِ کرم، آپ اس چیز کو ڈیسک میں رکھیں۔"

لڑکے نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر وہ بیہودہ سی چیز ڈیسک میں رکھ دی۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"مجھے آپ لوگوں کا تلفظ سُن کر بہت افسوس ہُوا ہے۔ آپ سکول کی سب سے بڑی جماعت ہیں۔ چند ماہ میں آپ تعلیم سے فارغ ہو جائیں گے اور عملی زندگی میں قدم رکھیں گے۔ آپ جہاں کہیں بھی جائیں، آپ کو انٹرویو دینا پڑے گا اور اگر آپ کی زبان میں غلطیاں ہوئیں، تو شاید ہی کوئی فرم ایسی ہو جو آپ کو قبول کر سکے۔ براہِ کرم، اپنے مستقبل کا خیال رکھیے اور تلفظ پر دھیان دیجیے ـــــ اور دیکھیے اب آپ بچے نہیں رہے، بلکہ ذمّے دار اور بالغ انسان ہیں۔"

پہلا دن گزر گیا۔ سبق کے دوران میں اکثر لڑکے آوازے کستے رہے لیکن میں نظر انداز کرتا رہا۔ کتاب سُننے کے بعد میں نے وزن اور لمبائی کے پیمانے پوچھے اور پھر عام معلومات سے متعلق چند سوالات کیے۔ اس دوران میں کلاس میں طالب علموں کے چہروں پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ اِکّے دُکّے آواز سے سنائی دیتے رہے، تاہم مجموعی طور پر کوئی ناخوشگوار حادثہ نہیں ہوا۔ پہلے ہی دن میں نے اندازہ کر لیا کہ کون کون سے لڑکے شرارتوں کا مرکز ہیں۔ شریر لڑکے اور لڑکیاں زیادہ تر پچھلی بنچوں پر بیٹھتے تھے اور سبق کے دوران میں مُنہ نیچے کر کے ہنستے تھے۔ چھٹی کی گھنٹی بجی، تو میں اُٹھا۔ میری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کلاس بے تحاشا شور مچانے لگی۔ پہلے تو جی میں آئی کہ ایک ڈانٹ پلاؤں، لیکن پہلا دن ہونے کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔

گرینز لیڈ سکول میں ایک مدّت سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ ہر جمعے کی سہ پہر کو تمام طلبا ہفتے بھر کی خاص خاص باتیں مضمون کی صورت میں لکھتے تھے۔ مسٹر فلوریان کا خیال تھا کہ اس طرح سکول، استادوں اور کتابوں کے بارے میں طلبا کی تازہ ترین رائے سے باخبر رہا جا سکتا ہے۔ پہلے جمعے کو میں نے بڑی احتیاط سے اپنی جماعت کی کاپیاں دیکھیں۔ یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوئی کہ بہت کم لڑکے لڑکیوں نے میرے بارے میں تفصیل سے کچھ لکھا تھا۔ تقریباً ہر کاپی پر مختصر لفظوں میں ایک نئے ماسٹر کی آمد کا ذکر تھا جو کالا تھا اور سب لڑکوں کو "آپ" کہہ کر بُلاتا تھا۔ اس سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں بھی دوسرے کئی استادوں کی طرح دو چار روز کا مہمان ہوں۔ خواہ مخواہ میرے بارے میں سوچ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

آج جب میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں، تو واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ طلبہ سے میرے

تعلقات تین ادوار سے گزرے۔ شروع میں لڑکے لڑکیاں خاموشی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ شاید وہ یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ مجھ سے کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے۔ اس دوران میں انہوں نے ہر کام بڑی بیزاری اور لاتعلقی سے کیا۔ دوسرا دور میرے لیے پہلے سے کہیں زیادہ مشکل کا باعث تھا۔ آہستہ آہستہ وہ شور کرنے لگے۔ میں کتاب پڑھ رہا ہوتا، تو کوئی لڑکا زور سے اپنی ڈیسک بند کرتا۔ میں سر اُٹھا کر کلاس پر نظر ڈالتا، تو سب کے چہروں پر زہر خند مسکراہٹ ہوتی۔ خون کے گھونٹ پی کر دوبارہ کتاب شروع کرتا، لیکن کسی کونے سے ہنسی اُبھرتی، پھر جوتوں کی فرش پر ٹھپ ٹھپ سنائی دیتی۔ انہیں کبھی چھینکیں آنے لگتیں، تو کبھی مصنوعی کھانسی کے دورے پڑتے۔ میں چُپ چاپ یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ اصل میں میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ سرگوشیاں، دبی دبی ہنسی، آوازے، لاتعلقی اور سوالوں کے اُلٹے سیدھے مضحکہ خیز جوابات، یہ سلوک مجھے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور بہ ظاہر کرتا رہا جیسے مجھے کچھ علم ہی نہیں۔ آہستہ آہستہ وہ شیر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ کلاس روم میں ایک دوسرے کو گالیاں دی جانے لگیں۔ ایک روز تو یہ معاملہ انتہا کو پہنچ گیا۔ میں کلاس روم میں داخل ہوا، تو چند لڑکے لڑکیاں ڈیسکوں کے درمیان ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ناچ رہے تھے اور ساتھ میں بعض نازیبا حرکات کے مرتکب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کچھ تو اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے، لیکن ایک جوڑا بدستور ناچ میں مصروف رہا۔ میں نے قریب جا کر بڑی نرمی سے کہا:

"یہ کلاس روم ہے، ناچ گھر نہیں۔ براہِ کرم اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیے۔"

"کیسے بیٹھ جائیں، ناچ ختم کرنے کو ہمارا جی نہیں چاہتا۔" لڑکے نے نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ اس فقرے پر کلاس روم میں فلک شگاف قہقہے بلند ہوئے۔

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک لڑکی کی نظر میری طرف اُٹھ گئی۔ اس نے آہستہ سے اپنے آپ کو لڑکے کی گرفت سے آزاد کیا اور سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ جوں توں کر کے پیریڈ ختم کیا اور سٹاف روم میں جا کر چائے پینے لگا۔ واپس آیا، تو تمام لڑکے اور لڑکیاں آتش دان کے گرد جمع تھے اور دھوئیں سے سارا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ دہکتے ہوئے کوئلوں پر ایک ایسی چیز جل رہی تھی جسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میں خود چکرا گیا۔

"سب لڑکے باہر چلے جائیں۔" میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ قہقہے رُک گئے اور کلاس روم میں سناٹا چھا گیا۔ "میں کہتا ہوں سب لڑکے باہر چلے جائیں۔" میں نے دوبارہ کہا۔ لڑکے فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور خاموشی سے باہر چلے گئے۔ لڑکیوں کو جمع کر کے میں نے خوب تاڑا۔ غصّے کے عالم میں الفاظ میرے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ لڑکیاں خوف زدہ تھیں اور سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"آپ کو اس قسم کی حرکتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ کیا آپ اپنے کپڑے بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں۔ یہ آخری موقع ہے۔ اگر آئندہ میں نے ایسی کوئی حرکت دیکھی، تو میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔ یہ مت سمجھو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پچھلے دو ہفتوں سے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، میں محض آپ لوگوں کو آزمانا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ خود بخود سمجھ جائیں گی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔"

میں خاصی دیر تک بولتا رہا، یہاں تک کہ بعض لڑکیاں رونے لگیں۔ ایک لڑکی نے اُٹھ کر کہا:

"سر، ہم بہت شرمندہ ہیں، آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی، اس مرتبہ آپ ہمیں معاف کر دیجیے۔"

"ٹھیک ہے، میں سٹاف روم سے ہو کر آتا ہوں، اس دوران میں آپ آتش دان کو صاف کریں اور کھڑکیاں کھول

ہے۔ جانے اس وقت مجھ میں اتنی پھرتی کہاں سے آگئی۔ دوسرے راؤنڈ کے خاتمے پر مَیں ڈینیم کو پانچ گھونسے رسید کر چکا تھا۔ آخری ضرب پر تو وہ چکرا کر فرش پر گرا اور اس کے مُنہ سے خون بہہ نکلا۔ پورے ہال پر سناٹا طاری تھا۔ تمام لڑکے اور لڑکیاں خاموش کھڑی تھیں۔ مَیں نے بڑے اطمینان سے دستانے اُتارے اور ایک لڑکے کو پانی لانے کے لیے کہا۔ پانی پینے کے بعد ڈینیم کے اوسان بحال ہُوئے۔ مَیں نے خیریت دریافت کی۔ اُس نے سر جُھکا کر کہا: "اچھا ہوں"۔ اس دوران میں گھنٹی بج گئی اور سب طلبہ اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔

اس واقعے کا طلبہ پر بہت اثر ہُوا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ مَیں کمزور شخصیت کا مالک نہیں ہوں اور وقت آنے پر اُن کی اچھی خاصی پٹائی کر سکتا ہوں؛ تاہم مَیں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہ کی اور بدستور محبت اور شفقت سے پیش آتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس سکول میں درسی کتابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، اس لیے مَیں چھوٹے چھوٹے مباحثے اور مقابلے کرواتا، کھیلوں میں دلچسپی لیتا، طلبہ کے چھوٹے موٹے مسائل میں ہاتھ بٹاتا، صفائی کی اہمیت پر زور دیتا، خود ہر روز صاف ستھرے کپڑے پہنتا تاکہ طلبہ میں صفائی کا احساس پیدا ہو۔ ایک روز میں کلاس لے رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور جوزیفائن ہانپتی کانپتی ہوئی اندر آئی۔ دیر سے آنے کی وجہ سے وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ اتنے زور سے کھولا تھا کہ ہم سب ایک بار تو ڈر ہی گئے۔ مَیں نے نہایت نرمی سے کہا:

"مس جوزیفائن ابھی جس طرح اندر آئی ہیں، وہ طریقہ ایک باوقار خاتون کے شایانِ شان نہیں۔ مَیں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ دوبارہ باہر جائیں اور صحیح طریقے سے کلاس روم میں داخل ہونے کا مظاہرہ کریں۔"

جوزیفائن کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا، وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا،

دیں تاکہ دھواں باہر نکل جائے۔ ایک لڑکی جا کر لڑکوں کو بُلا لائے۔" یہ کہہ کر مَیں باہر نکل گیا۔

اس روز سے لڑکیوں کا رویّہ بدل گیا، وہ بہت دھیان سے میری باتیں سُننے لگیں، لیکن لڑکوں کا سلوک بدستور وہی تھا۔ بعض اوقات تو ان کی بدتمیزیاں انتہا کو پہنچ جاتیں۔ کالے اور حبشی کے آوازے اب ختم ہو گئے تھے۔ شاید وہ لوگ خود ہی اس مذاق سے تنگ آ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں لفظ کالے سے چڑوں گا، لیکن میری خاموشی نے انہیں مایوس کر دیا تھا۔ آخر ایک روز مجھے اپنا وجود تسلیم کروانے کا موقع مل گیا۔ کھیلوں کا پیریڈ تھا۔ کلاس کا سب سے شریر لڑکا ڈینیم مکّہ بازی کی مشق کر رہا تھا۔ باقی کلاس اسے دیکھ رہی تھی۔ جونہی میں قریب سے گزرا۔ ڈینیم بولا:

"سر، آیئے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

"شکریہ۔" مَیں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

"ڈر گئے۔" پیچھے کھڑے ہوئے کسی لڑکے نے آواز کسا۔

مَیں فوراً پلٹ آیا۔ اس سے پہلے مَیں نے کبھی مکّہ بازی میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ مَیں اس کھیل کے ابجد سے ناواقف تھا لیکن اب انہوں نے میری ذات کو چیلنج کیا تھا۔ خاموش رہنے کا مقصد یہ تھا کہ مَیں جسمانی طور پر لڑکوں سے خوفزدہ ہوں۔ مَیں نے دستانے پہنے اور میدان میں اُتر آیا۔ شور سے سارا ہال گونج اُٹھا۔

"آج کالا پٹ گیا۔" یہ الفاظ سُن کر مَیں نے تہیّہ کر لیا کہ جیسے بھی ہو ڈینیم کو نیچا دکھاؤں گا۔ ڈینیم موٹا تازہ پلا ہوا لڑکا تھا اور مُکّہ بازی میں بھی ماہر تھا۔ پہلے راؤنڈ میں اس نے مجھے دو ضربیں لگائیں اور مَیں کوشش کے باوجود جواب نہ دے سکا۔ کلاس کا شور آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ سب لڑکے ڈینیم کو شاباش دے رہے تھے۔ دوسرے راؤنڈ کے آغاز ہی سے مَیں نے جوابی حملے شروع کر دیے۔ اب مَیں کچھ "تجربہ کار" ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر مَیں مکّہ بازی میں ہار گیا، تو سکول میں رہنا ناممکن

خواتین انہیں پسند کرتی ہیں!

ملک کے ہر حصے کی خواتین میں
کاٹن کوئین اور آدم جی برانڈ (مرسرائزڈ)
سلائی کے دھاگوں کی مقبولیت
تیزی سے بڑھ رہی ہے۔
یہ بڑھتی ہوئی مانگ
ان دھاگوں کے اعلیٰ معیار
کی دلیل ہے۔

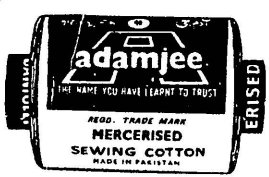

کاٹن کوئین
اور
آدم جی برانڈ (مرسرائزڈ)
سلائی کے دھاگے

مضبوط - رواں - یکساں

جوزفائن آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنی سیٹ تک آگئی اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ مَیں نے اسے شاباش دی۔ کلاس اب مجھ سے خاصی مانوس ہوگئی تھی۔ صرف چند شریر لڑکے ابھی تک شرارتوں سے باز نہیں آئے تھے۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ جلینی بیمار ہے۔ چھٹی کی گھنٹی بجی، تو مَیں نے تجویز پیش کی کہ اس کی عیادت کو چلنا چاہیے۔ سب حیران رہ گئے ــــ پاٹر بولا:

"ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ سینٹ لوئیس کے گندے محلے میں مارے مارے پھریں۔"

"پاٹر، تمہیں یہ الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔ خدانہ کرے اگر تم بیمار پڑ جاؤ، تو....."

پاٹر خاموش ہوگیا۔ چھیالیس طلبہ کی جماعت میں سے صرف تین لڑکیاں اور دو لڑکے میرے ساتھ جانے پر رضامند ہوئے۔ مَیں نے یہی غنیمت جانا اور انہیں ساتھ لے کر جلینی کے گھر چلا گیا۔ اُسے معمولی بخار تھا، وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دیر تک ہمارا شکریہ ادا کرتی رہی۔ مَیں نے اسے تسلی دی کہ شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

بعض لڑکے ابھی تک مجھ پر آوازے کستے تھے۔ ان میں بلنکرڈ پیش پیش تھا۔ وہ موقع بے موقع مجھے سیاہ فام ہونے کا طعنہ دیتا رہتا۔ ایک روز مَیں سبق پڑھا رہا تھا کہ وہ بولا:

"سر، بلیکی کسے کہتے ہیں؟"

مَیں موزوں جواب سوچ رہا تھا کہ پامیلا ڈیر کی غُصّے میں بھری ہوئی آواز بلند ہوئی:

"بلنکرڈ، تمہیں شرم آنی چاہیے۔ اپنی شکل دیکھی ہے کبھی تم نے ــــ لنگور کہیں کے۔"

بلنکرڈ بھونچکا سا رہ گیا ــــ قریب تھا کہ کلاس میں ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو، مَیں نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا:

"مس ڈیر نے ابھی ابھی اعتراض کیا ہے کہ بلنکرڈ اور اس کے بعض ساتھی میری رنگت کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مَیں نے کبھی اس سے بُرا نہیں مانا اور اس میں بُرا ماننے کی بات ہی کیا ہے۔ آپ سب لوگ سفید ہیں اور مَیں کالا۔ آپ کو میری رنگت واقعی عجیب لگتی ہوگی، لیکن ذرا جان پہچان ہونے کی دیر ہے۔ ہمارے ہاں اگر آپ میں سے کوئی چلا جائے، تو لوگ اسے قدرت کا عجوبہ سمجھیں گے۔ مَیں آپ کو اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک انگریز فیملی رہتی تھی۔ ان کا ایک مُنّا سا بچہ تھا، سُرخ سُرخ چقندر کی طرح۔ ایک بار مَیں گھر سے باہر نکلا، تو لڑکوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس کی سُرخ و سفید رنگت کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ کوئی اُسے بھورا کہتا، تو کوئی لنگور۔ بچہ رونے لگا۔ آخر مَیں نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا اور بچے کو گھر تک چھوڑ آیا۔ اس کے بعد ہماری باہمی دوستی ہوگئی ــــ دیکھیے نا، دنیا کے مختلف حصّوں میں رہنے والے لوگوں کا رنگ مختلف ہے۔ کسی قوم کی رنگت سفید ہے، تو کسی کی زرد، کوئی گندمی ہے اور کوئی سیاہ، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی شخص صرف اپنے رنگ کی بنا پر اچھا یا بُرا ہے۔ اچھا وہی ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔ بُرا وہ ہے جس کے اخلاق بُرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ لوگ جب مجھے کالا کہہ کر پکارتے ہیں، تو مجھے قطعی غُصّہ نہیں آتا، البتہ افسوس ہوتا ہے کہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی آپ ابھی تک چھوٹے بچّوں کی طرح رنگ، نسل اور قوم کے چکّر میں پڑے ہیں۔"

اس دن کے بعد سے مَیں نے کسی کے مُنہ سے "کالے" کا لفظ نہیں سُنا۔ چند روز بعد سکول سے واپسی پر مَیں نے ایک جگہ "مکان خالی ہے" کا بورڈ دیکھا۔ گھنٹی بجائی، اوپر کھڑکی میں ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔

"مجھے یہ مکان چاہیے۔"

"یہ مکان خالی نہیں ہے۔"

"لیکن باہر لکھا ہے کہ مکان خالی ہے۔"

"مَیں نے کہہ دیا کہ خالی نہیں ہے، کم از کم تمہارے لیے۔"

Pakistanipoint

مَیں مایوس ہو کر چلنے ہی والا تھا کہ اچانک اُوپر سے آواز آئی:

"سر، ذرا رُکیے۔" مَیں نے سر اٹھا کر دیکھا، یہ پامیلا ڈیر تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی ہوئی نیچے آگئی۔

"معاف کیجیے، امّی نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ امّی، یہ ہمارے اُستاد ہیں، مسٹر برائٹھ ویٹ۔"

عورت کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔

"مسٹر برائٹھ ویٹ، تشریف لائیے۔"

تھوڑی دیر بعد ماں بیٹی دونوں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ مَیں ان کے ہاں آجاؤں، لیکن مَیں ایک اور فیصلہ کر چکا تھا۔

"مسز ڈیر، مَیں یہ مکان اپنے لیے نہیں پُوچھ رہا تھا، اصل میں میرے ایک دوست کو مکان کی ضرورت تھی۔ اُسے آپ کا پتا دے دوں گا۔" یہ کہہ کر مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ تیسرے چوتھے دن پامیلا میرے پاس آئی اور خوشی سے بولی:

"جناب، وہ مکان ہم نے کرائے پر دے دیا۔ تین امیدوار تھے۔ دو انگریز تھے — ایک آپ کا ہم وطن — ہم نے مکان آپ کے ہم وطن کو دیا ہے۔"

یہ میری پہلی کامیابی تھی اور مَیں اس پر پھولا نہیں سما رہا تھا۔

انہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ سیلز ایک طالب علم تھا جس کی ماں انگریز اور باپ برٹش گیانا کا رہنے والا ایک سیاہ فام تھا۔ اُس کا باپ مر گیا، وہ اس روز سکول نہ آیا۔ مجھے معلوم ہوا، تو مَیں نے تعزیت کے لیے جانے کا پروگرام بنایا۔ گرفن بولا:

"ہم سب نے آپ کے کہنے کے مطابق پیسے جمع کر کے کچھ پھول خریدے ہیں۔ ہم یہ پھول وہاں بھجوانا چاہتے ہیں۔"

"کیوں، تم لوگ خود نہیں جاؤ گے کیا؟"

"ہم وہاں کیسے جا سکتے ہیں — لوگ کیا کہیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"جی، وہ سیلز کا باپ تھا نا، وہ سیاہ فام تھا۔"

میرے دل پر جیسے ایک چوٹ سی لگی، لیکن میں خاموش رہا۔ ڈینہم بولا:

"کیا آپ ہم سے ناراض ہیں؟"

"نہیں۔"

"اگر آپ حکم دیں، تو ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"مَیں حکم دینا نہیں چاہتا۔" مَیں نے آہستہ سے کہا۔

چھٹی کی گھنٹی بجی، تو مَیں مغموم تھا۔ سیلز کے ہاں پہنچا، تو طبیعت پر ایک بوجھ سا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کیے کرائے پر پانی پھر گیا ہو۔ اچانک میری نظر سامنے کی طرف اُٹھ گئی۔ ایک کونے میں میری ساری جماعت بیٹھی تھی۔ جی ہاں، پورے تنتالیس لڑکے اور لڑکیاں۔ میرا دل خدا کی حمد سے سرشار ہو گیا۔

دس ماہ یوں گزر گئے جیسے دس دن ہوں۔ آخر وہ دن آپہنچا جب جماعت تعلیم سے فارغ ہو گئی۔ آخری دن کلاس میں داخل ہوا، تو سب کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔ مَیں نے انہیں چند لطیفے سنائے اور خوب ہنسایا۔ چھٹی کے وقت تک ہم بڑی دلچسپ گفتگو کرتے رہے۔ پاٹر اُٹھ کر بولا:

"جناب، سکول سے جانے کے بعد کیا ہم آپ سے ملنے کے لیے یہاں آسکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، آپ سب میرے دوست ہیں جب بھی تشریف لائیں گے، مجھے خوشی ہوگی۔"

چھٹی کی گھنٹی بجی، تو ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اچانک پامیلا آگے بڑھی اور سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ مجھے پیش کرتے ہوئے بولی:

"جناب، یہ ہماری طرف سے آپ کے لیے ہے۔"

مَیں نے پیکٹ پر نظر ڈالی۔ اُوپر جلی حروف میں لکھا تھا: "نہایت محبت اور عقیدت سے آپ کے لیے — ہماری طرف سے" — نیچے جماعت کے تمام لڑکے اور لڑکیوں کے دستخط تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مَیں نے کلاس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلا رہے تھے۔ میرے بچے میرے لیے رو رہے تھے ■■